تفہیمات

حصہ چہارم

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور

نام کتاب : تفہیمات (حصہ چہارم)

تصنیف : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب : اختر حجازی

مطبع : ڈے ٹائم پرنٹنگ پریس، لاہور

ناشر : ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لیمٹڈ، لاہور

اشاعت :

طبع اول :	جون ۱۹۸۵ء	۲۰۰۰
طبع دوم :	اکتوبر ۱۹۸۹ء	۲۰۰۰
طبع سوم :	دسمبر ۱۹۹۳ء	۲۰۰۰
طبع چہارم :	اگست ۱۹۹۹ء	۱۰۰۰

قیمت : / روپے

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

عرضِ ناشر

"تفہیمات" کے نام سے اس کتاب کے تین حصے سالہا سال سے شائع ہو رہے ہیں اب اسی کتاب کا چوتھا حصہ پیش کیا جا رہا ہے، اس حصہ کے مضامین مختلف موضوعات پر ہیں اور مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں مولانا مرحومؒ کے بقول" ان میں کوئی ربط اس کے سوا نہیں ہے کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کارفرما ہے یعنی اسلام کے متعلق مختلف پہلوؤں سے جو غلط فہمیاں اور الجھنیں لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جائے مسلمانوں کے اندر مختلف سمتوں سے گمراہی کی آمد کے جتنے دروازے (سیاسی، مذہبی، معاشی، عمرانی اور قانونی وغیرہ) پائے جاتے ہیں ان کو بند کیا جائے اور مسائل دینی کے فہم و تعبیر کا ایک ہموار راستہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔"

مجلہ" سیارہ" کے خصوصی نمبر" بیادِ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی" میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ مولانا مرحوم نے عربی اور انگریزی کے بعض مقالات کے ترجمے بھی کئے ہیں جن میں افادات شاہ ولی اللہ کے عنوان سے حجۃ اللہ البالغہ کے چند حصوں کا بڑا ہی حسین و دلکش ترجمہ کیا تھا جو ابھی تک ترجمان القرآن کی فائلوں میں محفوظ ہے ہم ترجمان کی فائل سے حجۃ اللہ البالغہ کے اسی ترجمے کو تفہیمات کے اس حصے میں شامل کر رہے ہیں۔

"تفہیمات" کے پانچویں حصے میں انشاء اللہ دوسرے مضامین کے ساتھ مولانا کے ترجمہ کردہ مقالات جن میں حافظ ابن قیمؒ اور ابن تیمیہؒ کے مقالات اور LEGACY OF ASLAM کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

ہم اختر حجازی صاحب کے بے حد ممنون ہیں جنھوں نے مضامین کی فراہمی اور

ترتیب میں ہماری خاطر خواہ مدد کی۔ یہ مجموعہ انہی کے تعاون سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں احباب سے گزارش ہے کہ اگر ان کے پاس مولانا مرحوم کی کوئی یادگار تحریر ہو تو اس کی نقل بھیج کر مشکور فرمائیں۔

اس مجموعہ کے ہر مضمون کے آخر میں تاریخ اشاعت کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے امید ہے کہ ہماری ان کوششوں کو بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔

سید خالد فاروق مودودی
مینجنگ ڈائرکٹر
ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ، لاہور

اسلام میں انسانی حقوق[۱]

مجھے "اسلام میں انسانی حقوق" کے موضوع پر آپ سے کچھ عرض کرنا ہے لیکن اس سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دو باتوں پر اچھی طرح روشنی ڈال دوں تاکہ دورانِ بحث میں ان کے متعلق کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

مغرب میں انسانی حقوق کا تصور

اہلِ مغرب کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ ہر اچھی چیز کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نعمت بس ہمارے ذریعے سے دنیا کو ملی ہے ورنہ دنیا ان چیزوں سے ناآشنا اور نری جہالت میں مبتلا تھی۔ اب ذرا اسی حقوقِ انسانی کے مسئلے کو دیکھیے۔ بڑے دعووں کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس کا تصور لوگوں کو انگلستان کے میگنا کارٹا کے ذریعے سے نصیب ہوا ہے۔ اگرچہ پھر بھی وہ اسلام کے چھ سو برس بعد کی چیز ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ سترھویں صدی کے قانون دانوں سے پہلے کسی کے ذہن میں یہ تصور موجود نہ تھا کہ میگنا کارٹا میں ٹرائل بائی جیوری (Trial by Jury) ہیبیس کارپس (Habeas Corpus) اور ٹیکس لگانے کے اختیارات پر پارلیمنٹ کے کنٹرول کے حقوق بھی شامل ہیں۔ اگر میگنا کارٹا کے لکھنے والے اس زمانے میں موجود ہوتے تو ان کو سخت حیرت ہوتی کہ میگنا کارٹا میں یہ چیزیں بھی موجود تھیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے سترھویں صدی سے پہلے اہلِ مغرب میں حقوقِ انسانی اور حقوقِ شہریت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ سترھویں صدی کے بعد بھی ایک مدتِ دراز تک فلسفیوں اور قانونی افکار پیش کرنے والے لوگوں نے تو ضرور اس خیال کو پیش کیا تھا۔ لیکن عملاً اس تصور

---

[۱] ایک تقریر جو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں شہری حقوق اور آزادیوں کے فورم کی دعوت پر ۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو کی گئی تھی۔

کا ثبوت اٹھارھویں صدی کے آخر میں امریکہ اور فرانس کے دستوروں اور اعلانات ہی میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مختلف ملکوں کے دستوروں میں بنیادی حقوق کا ذکر کیا ضرور گیا ہے مگر اکثر و بیشتر حالات میں یہی صورت پائی گئی ہے کہ جو حقوق کاغذ پہ دیئے گئے ہیں وہ زمین پر نہیں دیئے گئے۔ موجودہ صدی کے وسط میں اقوام متحدہ نے، جس کو اب اقوام متفرقہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ حقوق انسان کا اعلان (Universal Declaration of Human Rights) شائع کیا، اور نسل کشی (Genocide) کے خلاف بھی ایک قرارداد منظور کی اور ایک ضابطہ بنایا۔ لیکن آپ سب جانتے ہیں کہ اقوام متحدہ کا کوئی ضابطہ بھی ایسا نہیں ہے جو واجب العمل ہو، جس کے پیچھے کوئی طاقت ایسی ہو جو اس کو نافذ کرائے۔ اس کے ان تمام فیصلوں کے باوجود انسانی حقوق جگہ جگہ پامال ہوئے ہیں۔ اور اقوام متحدہ ان کی کوئی روک تھام نہیں کر سکی ہے۔ دنیا میں نسل کشی کا ارتکاب بھی ہو رہا ہے۔ خود آپ کے پڑوسی ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی ۲۸ سال سے جاری ہے لیکن اقوام متحدہ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کے خلاف کوئی کاروائی کرے۔ اس پر کہیں کسی ملک کے خلاف بھی آج تک کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔

اسلام میں انسانی حقوق کی اصل حیثیت

دوسری بات جو میں چاہتا ہوں کہ ابتدا ہی میں اچھی طرح واضح ہو جائے، یہ ہے کہ جب ہم اسلام میں انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو اس کے معنی دراصل یہ ہوتے ہیں کہ یہ حقوق خدا کے دیئے ہوئے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا کسی مجلس قانون ساز کے دیئے ہوئے نہیں ہیں۔ بادشاہوں اور قانون ساز اداروں کے دیئے ہوئے حقوق جس طرح دیئے جاتے ہیں اسی طرح جب وہ چاہیں واپس بھی لئے جا سکتے ہیں۔ ڈکٹیٹروں کے تسلیم کردہ حقوق کا بھی حال یہ ہے کہ جب وہ چاہیں وہ عطا فرمائیں، جب چاہیں واپس لے لیں اور جب چاہیں اعلانیہ ان کے خلاف عمل کریں۔ لیکن اسلام میں انسان کے جو حقوق ہیں وہ خدا کے دیئے ہوئے ہیں۔ دنیا کی کوئی مجلس قانون ساز اور دنیا کی کوئی حکومت ان کے اندر رد و بدل کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ ان کو واپس لینے یا منسوخ کر دینے کا کوئی حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

یہ نمائشی بنیادی حقوق بھی نہیں ہیں جو کاغذ پر دیئے جائیں اور زمین پر چھین لیے جائیں۔ ان کی نوعیت فلسفیانہ افکار کی بھی نہیں ہے جن کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ (sanction) نہیں ہوتی۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور اعلانات اور قرار دادوں کو بھی اُن کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا۔ کیونکہ وہ کسی پر بھی واجب العمل نہیں ہیں۔ یہ تو دینِ اسلام کا ایک حصہ ہیں۔ ہر مسلمان ان کو حق تسلیم کرے گا اور ہر اُس حکومت کو انہیں تسلیم کرنا اور نافذ کرنا پڑے گا جو اسلام کی طرف منسوب ہو اور جس کے چلانے والوں کا یہ دعویٰ ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور اُن حقوق کو جو خدا نے دیئے ہیں چھینتے ہیں، یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں یا عملاً انہیں پامال کرتے ہیں تو ان کے متعلق قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ "جو لوگ اللہ کے حکم کے خلاف فیصلہ کریں وہی کافر ہیں"۔ اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "وہی ظالم ہیں"۔ اور تیسری آیت میں فرمایا "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ" "وہی فاسق ہیں"۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اگر وہ خود اپنے افکار اور اپنے فیصلوں کو برحق سمجھتے ہوں اور خدا کے دیئے ہوئے احکام کو باطل قرار دیتے ہوں تو کافر ہیں۔ اور اگر وہ حق تو خدائی احکام ہی کو سمجھتے ہوں مگر اپنے خدا کی دی ہوئی چیز کو جان بوجھ کر رد کرتے اور اپنے فیصلے اس کے خلاف نافذ کرتے ہوں تو وہ فاسق اور ظالم ہیں۔ فاسق اس کو کہتے ہیں جو اطاعت سے نکل جائے اور ظالم وہ ہے جو حق کے خلاف کام کرے۔ لہٰذا ان کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ یا پھر وہ فسق اور ظلم میں مبتلا ہیں۔ بہرحال جو حقوق اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں وہ دائمی اور مستقل ہیں، اٹل ہیں۔ ان کے اندر کسی ردّ و بدل اور کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ دو باتیں اچھی طرح ذہن میں رکھ کر اب دیکھئے کہ اسلام انسانی حقوق کا کیا تصور پیش کرتا ہے۔

خالص انسانی حقوق

انسان بحیثیت انسان کے حقوق

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلے میں ہمیں اسلام کے اندر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام بجائے خود انسان بحیثیتِ انسان کے کچھ حقوق مقرر کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان خواہ وہ ہمارے اپنے ملک اور وطن کا ہو یا کسی دوسرے ملک اور وطن کا، ہماری قوم کا ہو یا کسی دوسری قوم کا، مومن ہو یا کافر کسی جنگل کا باشندہ ہو یا کسی صحرا میں پایا جاتا ہو، ہر حال محض انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے کچھ حقوق ہیں جن کو ایک مسلمان لازماً ادا کرے گا اور اس کا فرض ہے کہ وہ انہیں ادا کرے۔

۱۔ زندہ رہنے کا حق

ان میں اولین چیز زندہ رہنے کا حق، اور انسانی جان کے احترام کا فرض ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ "جس شخص نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، بغیر اس کے کہ اس سے کسی جان کا بدلہ لینا ہو، یا وہ زمین میں فساد برپا کرنے کا مجرم ہو، اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔" جہاں تک خون کا بدلہ لینے یا فساد فی الارض پر سزا دینے کا سوال ہے اس کا فیصلہ ایک عدالت ہی کر سکتی ہے یا کسی قوم سے جنگ ہو تو ایک باقاعدہ نظامِ حکومت ہی اُس کا فیصلہ کر سکتا ہے بہر حال کسی فرد کو انفرادی طور پر یہ حق نہیں ہے کہ وہ قصاص لے یا فساد فی الارض کی سزا دے اس لئے ہر انسان پر یہ واجب ہے کہ قتلِ انسان کا ہرگز ارتکاب نہ کرے۔ اگر کسی نے ایک انسان کو قتل کیا تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اِسی مضمون کو دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں اس طرح دُہرایا گیا ہے کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ "کسی جان کو حق کے بغیر قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔" یہاں بھی حرمتِ قتل کو ایسے قتل سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جو حق کے ساتھ ہو، اور حق کا فیصلہ بہر حال کوئی عدالت مجاز ہی کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتلِ نفس کو شرک کے بعد سب سے بڑا

گناہ قرار دیا ہے۔ اَکْبَرُ الْکَبَائِرِ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَقَتْلُ النَّفْسِ۔ ان تمام آیات اور احادیث میں مطلقاً نفس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کسی خاص نفس کو مختص نہیں کرتا کہ اس کا مطلب یہ لیا جاسکے کہ اپنی قوم، یا اپنے ملک کے شہری، یا کسی خاص نسل، رنگ یا وطن، یا مذہب کے آدمی کو قتل نہ کیا جائے۔ حکم تمام انسانوں کے بارے میں ہے اور بجائے خود ہر انسانی جان کو ہلاک کرنا حرام کیا گیا ہے۔

جینے کا حق "انسان" کو صرف اسلام نے دیا ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ جو لوگ حقوق انسانی کا نام لیتے ہیں انہوں نے اگر اپنے دستوروں میں یا اعلانات میں کہیں حقوق انسانی کا ذکر کیا ہے تو فی الحقیقت اس میں یہ بات مُضْمَر (implied) ہوتی ہے کہ یہ حقوق یا تو اُن کے شہریوں کے ہیں، یا پھر وہ ان کو سفید نسل والوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ جس طرح آسٹریلیا میں انسانوں کا شکار کر کے سفید نسل والوں کے لئے قدیم باشندوں سے زمین خالی کرائی گئی اور امریکہ میں وہاں کے پُرانے باشندوں کی نسل کُشی کی گئی اور بقیۃُ السّیف کو مخصوص علاقوں (reservations) میں مقید کر دیا گیا، اور افریقہ کے مختلف علاقوں میں گھُس کر انسانوں کو جانوروں کی طرح ہلاک کیا گیا، یہ ساری چیزیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ انسانی جان کا بحیثیتِ "انسان" کوئی احترام اُن کے دل میں نہیں ہے۔ اگر کوئی احترام ہے تو اپنی قوم یا اپنے رنگ یا اپنی نسل کی بنیاد پر ہے۔ لیکن اسلام تمام انسانوں کے لئے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص وحشی قبائل سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو بھی اسلام انسان ہی سمجھتا ہے۔

۲۔ حفاظتِ جان کا حق

قرآن مجید کی جو آیت میں نے ابھی تلاوت کی ہے اس کے مًا بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا۔ "اور جس نے کسی نفس کو بچایا اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔" آدمی کو موت سے بچانے کی بے شمار شکلیں ہیں۔ ایک آدمی بیمار یا زخمی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کس نسل، کس قوم یا کس رنگ کا ہے، اگر وہ آپ کو بیماری کی حالت میں یا زخمی ہونے کی حالت میں ملا ہے تو آپ کا کام یہ ہے

کہ اس کی بیماری یا اس کے زخم کے علاج کی فکر کریں۔ اگر وہ بھوک سے مر رہا ہے تو آپ کا کام یہ ہے کہ اس کو کھلائیں تاکہ اس کی جان محفوظ ہو جائے۔ اگر وہ ڈوب رہا ہے یا اور کسی طرح سے اس کی جان خطرے میں ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کو بچائیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہودیوں کی مذہبی کتاب تلمود میں بعینہٖ اس آیت کا مضمون درج ہے مگر اس کی عبارت یہ ہے کہ "جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا، الکتاب (scripture) کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کر دیا اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا الکتاب کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی"۔ تلمود میں یہ بھی صاف لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر اسرائیلی ڈوب رہا ہو اور تم نے اسے بچانے کی کوشش کی تو گنہگار ہوگے۔ نسل پرستی کا کرشمہ دیکھئے۔ ہم ہر انسان کی جان بچانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ قرآن مجید نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ لیکن وہ اگر بچانا ضروری سمجھتے ہیں تو صرف بنی اسرائیل کی جان کو۔ باقی رہے دوسرے انسان، تو دینِ یہود میں وہ انسان سمجھے ہی نہیں جاتے۔ ان کے ہاں گوئیم کا تصور جس کے لئے انگریزی میں (gentile) اور عربی میں اُمّی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ ان کے کوئی انسانی حقوق نہیں ہیں۔ انسانی حقوق صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ "ہمارے اوپر اُمّیوں کے بارے میں (یعنی ان کا مال مار کھانے میں) کوئی گرفت نہیں ہے"۔

۳۔ عورت کی عصمت کا احترام

تیسری اہم چیز اسلام کے دیئے ہوئے انسانی حقوق میں یہ ہے کہ عورت کی عصمت بہر حال محترم ہے خواہ وہ اپنی قوم کی ہو، یا دشمن قوم کی، جنگل بیابان میں ملے یا کسی مفتوح شہر میں، ہماری ہم مذہب ہو یا کسی غیر مذہب سے تعلق رکھتی ہو، یا لا مذہب ہو، مسلمان کسی حالت میں بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اُس کے لئے زنا کو مطلقاً حرام کیا گیا ہے خواہ اُس کا ارتکاب کسی عورت سے کیا جائے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى "زنا کے قریب نہ پھٹکو" اور مزید برآں اس فعل کی سزا مقرر

کردی گئی ہے۔ یہ حکم کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا ہر حالت میں حرام ہے اور کوئی مسلمان اِس فعل کا ارتکاب کر کے سزا سے نہیں بچ سکتا خواہ دنیا میں سزا پائے یا آخرت میں۔ عورت کی عصمت کے احترام کا یہ تصور اسلام کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا۔ مغربی فوجوں کو تو اپنے ملک میں بھی "رفع حاجت" کے لیے خود اپنی قوم کی بیٹیاں درکار ہوتی ہیں، اور غیر قوم کے ملک پر اُن کا قبضہ ہو جائے تو اُس ملک کی عورتوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ منفرد انسانی غلطیوں سے قطع نظر، اس سے خالی رہی ہے کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد ان کی فوجیں ہر طرف عام بدکاری کرتی پھری ہوں، یا ان کے اپنے ملک میں حکومت نے ان کے لیے فاحشات فراہم کرنے کا انتظام کیا ہو۔ یہ بھی ایک بڑی نعمت ہے جو نوعِ انسانی کو اسلام کی بدولت نصیب ہوئی ہے[1]۔

۴۔ ہر سائل و محروم کا یہ حق کہ اس کی مدد کی جائے

قرآن مجید میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "اور مسلمانوں کے مالوں میں مدد مانگنے والے اور محروم رہ جانے والے کا حق ہے"۔ اوّل تو اِس حکم کے الفاظ بجائے خود مطلق ہیں، پھر یہ حکم مکے میں دیا گیا تھا، جہاں کوئی مسلم معاشرہ باقاعدہ بنا ہی نہ تھا اور بالعموم مسلمانوں کا سابقہ غیر مسلم آبادی ہی سے پیش آتا تھا۔ اس لیے آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے مال پر ہر مدد مانگنے والے اور ہر محروم رہ جانے والے انسان کا حق ہے، قطع نظر اِس سے کہ وہ اپنی قوم یا اپنے ملک کا ہو یا کسی قوم، ملک یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ آپ استطاعت رکھتے ہوں اور کوئی حاجت مند آپ سے مدد مانگے، یا آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ حاجت مند ہے تو ضرور اس کی مدد کریں۔ خدا نے آپ پر اُس کا یہ حق قائم کر دیا ہے۔

---

[1] اسلامی نقطۂ نظر سے عصمت صرف عورت ہی کی نہیں مرد کی بھی ہوتی ہے۔ جو شخص زنا کرتا ہے وہ عورت کی عصمت ہی خراب نہیں کرتا، اپنی عصمت بھی خراب کرتا ہے۔

۵- ہر انسان کا حق آزادی

اسلام میں کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنانا یا اسے بیچ ڈالنا قطعی حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کے خلاف قیامت کے روز میں خود مستغیث ہوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو کسی آزاد انسان کو پکڑ کر بیچے اور اس کی قیمت کھائے (رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَکَلَ ثَمَنَہٗ) اس فرمانِ رسولؐ کے الفاظ بھی عام ہیں۔ ان کو کسی قوم یا نسل یا ملک و وطن کے انسان کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا ہے۔ اہلِ مغرب کو بڑا فخر ہے کہ انہوں نے غلامی کا انسداد کیا ہے۔ حالانکہ انہیں یہ قدم اٹھانے کی توفیق پچھلی صدی کے وسط میں نصیب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جس بڑے پیمانے پر وہ افریقہ سے آزاد انسانوں کو پکڑ پکڑ کر اپنی نوآبادیوں میں لے جاتے رہے ہیں، اور ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے رہے ہیں۔ اس کا ذکر ان کی اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں میں موجود ہے۔

مغربی اقوام کی غلام سازی

امریکہ اور جزائرِ غربُ الہند وغیرہ پر ان قوموں کا قبضہ ہونے کے بعد ساڑھے تین سو سال تک غلامی کی یہ ظالمانہ تجارت جاری رہی ہے۔ افریقہ کے جس ساحل پر اندرونِ ملک سے سیاہ فام لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جاتا اور بندرگاہوں سے ان کو آگے روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کا نام ساحلِ غلامان (Slave Coast) پڑ گیا تھا صرف ایک صدی میں (۱۶۸۰ء سے ۱۷۸۶ء تک) صرف برطانوی مقبوضات کے لئے جتنے آدمی پکڑ کر لے جائے گئے ان کی تعداد خود برطانوی مصنفین نے دو کروڑ بتائی ہے۔ صرف ایک سال ایسا بتایا گیا ہے (۱۷۹۰ء) جس میں ۷۵ ہزار افریقی پکڑے اور غلام بنائے گئے۔ جن جہازوں میں وہ لے جائے جاتے تھے اُن میں ان افریقیوں کو بالکل جانوروں کی طرح ٹھونس کر بند کر دیا جاتا تھا اور بہت سوں کو زنجیروں سے باندھ دیا جاتا تھا، ان کو نہ ٹھیک سے غذا دی جاتی تھی، نہ بیمار پڑیں یا زخمی ہو جائیں تو ان کے علاج کی فکر کی جاتی تھی۔ مغربی مصنفین کا اپنا بیان ہے کہ غلام بنانے اور جبری خدمت لینے کے لئے جتنے افریقی پکڑے گئے تھے ان میں

سے ۲۰ فیصدی کا راستے ہی میں خاتمہ ہو گیا۔ یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر مختلف مغربی اقوام نے جتنے افراد کو پکڑا تھا ان کی تعداد دس کروڑ تک پہنچتی تھی۔ اس تعداد میں تمام مغربی اقوام کی غلام سازی کے اعداد و شمار شامل ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا یہ منہ ہے کہ ہم پر شب و روز غلامی کو جائز رکھنے کا الزام لگاتے رہیں گویا نکٹا کسی ناک والے کو طعنہ دے رہا ہے کہ تیری ناک چھوٹی ہے۔

اسلام میں غلامی کی حیثیت

مختصراً میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں غلامی کی نوعیت کیا ہے۔ عرب میں جو لوگ اسلام سے پہلے کے غلام چلے آرہے تھے ان کے مسئلے کو اسلام نے اس طرح حل کیا کہ ہر ممکن طریقے سے اُن کو آزاد کرنے کی ترغیب دلائی۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے بعض گناہوں کے کفاروں میں اُن کو آزاد کریں۔ برضا و رغبت خود کسی غلام کو آزاد کرنا ایک بڑی نیکی کا کام قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ آزاد کرنے والے کا ہر عضو اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں دوزخ سے بچ جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے دَور تک پہنچتے پہنچتے عرب کے تمام قدیم غلام آزاد ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۶۳ غلام آزاد کیے۔ حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ حضرت عباسؓ نے ۷۰، حضرت عبداللہؓ بن عمر نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ۳۰ ہزار غلام خرید کر آزاد کر دیئے۔ ایسے ہی بہت سے صحابہ کے متعلق روایات میں تفصیل آئی ہے کہ انہوں نے کتنے بندگانِ خدا کو غلامی سے رہا کیا تھا۔ اس طرح پُرانے دَور کی غلامی کا مسئلہ ۳۰، ۴۰ سال میں حل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلام میں غلامی کی جو شکل باقی رکھی گئی وہ صرف یہ تھی کہ جو قیدی جنگ میں پکڑے گئے ہوں ان کو اسلامی حکومت اُس وقت تک اپنے پاس رکھے جب تک ان کی حکومت ہمارے قیدیوں کو چھوڑ کر اپنے قیدی تبادلے میں حاصل نہ کر لے۔ یا وہ اُن کا فدیہ ادا کر کے انہیں رہا نہ کرا لے۔ اگر یہ دونوں صورتیں پیش نہ آئیں تو اسلامی حکومت اُن کو گرفتار کرنے والی فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیتی تھی اور وہ اُن کے مالک ہو جاتے تھے۔

یہ اِس سے زیادہ انسانی طریقہ تھا کہ ان کو قیدیوں کے باڑوں (concentration camps) میں رکھا جاتا اوران سے جبری خدمت (forced labour) لی جاتی اور اُن کی جو عورتیں گرفتار ہوتیں انہیں (prostitution) قحبہ گری کے لئے مختص کر دیا جاتا۔ اس بے رحمانہ اور فتنہ پرور طریقے کے بجائے اسلام نے یہ پسند کیا کہ آبادی میں اُن کو پھیلا دیا جائے، اور افراد کو افراد سے سابقہ پیش آئے۔ اس کے ساتھ مالکوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ان سے نیک سلوک کرو۔ اِسی کا نتیجہ تھا کہ بیرونی قوموں کے جو لوگ مسلمانوں میں پکڑے ہوئے آئے اور غلام بنا لئے گئے وہ زیادہ تر مسلمان ہو گئے اور ان کی اولادوں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے آئمہ پیدا ہوئے، بڑے بڑے فقہاء پیدا ہوئے، نامور محدثین پیدا ہوئے، سلطنتوں کے مدبر اور فوجوں کے سپہ سالار پیدا ہوئے۔ حتیٰ کہ آگے چل کر وہ مسلمان ملکوں کے حکمران بنے۔ موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا جو حل تجویز کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد فریقین کے جنگی قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ مسلمان اس کے لئے پہلے سے تیار رہتے بلکہ جہاں کہیں فریق مخالف نے قیدیوں کے تبادلے کو قبول کیا وہاں بلا تکلف اس تجویز پہ عمل کیا گیا۔ لیکن اگر اس زمانے کی کسی لڑائی میں ایک حکومت مکمل طور پر شکست کھا جائے اور غالب آنے والی طاقت اپنے آدمیوں کو چھڑا لے اور مغلوب حکومت باقی ہی نہ رہے کہ اپنے آدمیوں کو چھڑا سکے تو تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مغلوب قوم کے قیدیوں کو غلامی سے بدتر حالت میں رکھا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا جائے کہ گذشتہ جنگ عظیم میں روس نے جرمنی اور جاپان کے جو قیدی پکڑے تھے ان کا حشر کیا ہوا۔ ان کا آج تک حساب نہیں ملا ہے کچھ نہیں معلوم کہ کتنے زندہ رہے اور کتنے مر کھپ گئے۔ ان سے جو خدمات لی گئیں وہ غلاموں کی خدمت سے بدتر تھیں۔ غالباً فرعون کے زمانے میں اہرام بنانے کے لئے غلاموں سے اُتنی ظالمانہ خدمات نہ لی گئی ہوں گی جتنی روس میں سائبیریا اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کو ترقی دینے کے لئے جنگی قیدیوں سے لی گئیں۔

اب میں اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔

۶- ہر انسان کا یہ حق کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جائے

یہ ایک بڑا اہم حق ہے جو اسلام نے انسان کو بحیثیتِ انسان عطا کیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ .... اَنْ تَعْتَدُوْا "کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے .... کہ تم زیادتی کرنے لگو"۔ آگے چل کر اسی سلسلے میں پھر فرمایا وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا، هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی "اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو یہی تقویٰ سے قریب تر ہے"۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو"۔ معلوم ہوا کہ عام انسان ہی نہیں دشمنوں تک سے انصاف کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام جس انصاف کی دعوت دیتا ہے وہ محض اپنے ملک کے باشندوں کے لئے، یا اپنی قوم کے لوگوں کے لئے، یا مسلمانوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کے سب انسانوں کے لئے ہے۔ ہم کسی سے بھی بے انصافی نہیں کرتے ہمارا مستقل شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ کوئی شخص بھی ہم سے بے انصافی کا اندیشہ نہ رکھے اور ہم ہر جگہ ہر شخص کے ساتھ عدل و انصاف ملحوظ رکھیں۔

۷- انسانی مساوات

اسلام نہ صرف یہ کہ کسی امتیازِ رنگ و نسل کے بغیر تمام انسانوں کے درمیان مساوات کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے ایک اہم اصولِ حقیقت قرار دیتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ "اے انسانو ہم نے تم کو ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا کیا"۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام انسان اصل میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ "اور ہم نے تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو"۔ یعنی قوموں اور قبیلوں میں یہ تقسیم تعارف کے لئے ہے۔ اس لئے ہے کہ ایک قبیلے یا ایک قوم کے لوگ آپس

میں ایک دوسرے سے واقف ہوں اور باہم تعاون کر سکیں۔ اس لئے نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر فخر جتائے اور اس کے ساتھ تکبر سے پیش آئے، اس کو ذلیل سمجھے اور اس کے حقوق پر ڈاکے مارے۔" درحقیقت تم میں سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا ترس ہے" یعنی انسان پر انسان کی فضیلت صرف اخلاق اور پاکیزہ کردار کی بنا پر ہے نہ کہ رنگ ونسل، زبان یا وطن کی بنا پر۔ اور یہ فضیلت بھی اس غرض کے لئے نہیں ہے کہ پاکیزہ اخلاق کے انسان دوسرے انسانوں پر اپنی بڑائی جتائیں، کیونکہ بڑائی جتانا بجائے خود ایک برائی ہے جس کا ارتکاب کوئی خدا ترس اور پرہیزگار آدمی نہیں کر سکتا اور یہ اس غرض کے لئے بھی نہیں ہے کہ نیک آدمی کے حقوق برے آدمیوں کے حقوق پر فائق ہوں یا اس کے حقوق اُن سے زیادہ ہوں، کیونکہ یہ انسانی مساوات کے خلاف ہے جس کو اس آیت کی ابتدا میں اصول کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ فضیلت دراصل اس وجہ سے ہے کہ نیکی اخلاقی حیثیت سے بُرائی کے مقابلے میں بہر حال افضل ہے۔ اسی مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِاَحْمَرَ عَلَى الْاَسْوَدِ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلَى الْاَحْمَرِ كُلُّكُمْ اَبْنَاءُ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ "کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے"۔ اس طرح اسلام نے تمام نوع انسانی میں مساوات قائم کی اور رنگ، نسل، زبان اور قومیت کی بنا پر سارے امتیازات کی جڑ کاٹ دی۔ اسلام کے نزدیک یہ حق انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے کہ اس کے ساتھ اس کی کھال کے رنگ یا اس کی پیدائش کی جگہ یا اس کو جنم دینے والی نسل و قوم کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ اسے دوسروں کی بہ نسبت حقیر نہ ٹھہرایا جائے، اور اس کے حقوق دوسروں سے کم تر نہ رکھے جائیں۔ امریکہ کے افریقی النسل لوگوں کا مشہور لیڈر "میلکم اکس" جو سیاہ نسل کے باشندوں کی حمایت میں سفید نسل والوں کے خلاف مدتوں شدید کشمکش کرتا رہا تھا مسلمان ہونے کے بعد جب حج کے لئے

گیا اور وہاں اس نے دیکھا کہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ غرض ہر جگہ کے اور ہر رنگ و نسل کے مسلمان ایک ہی لباس میں ایک خدا کے گھر کی طرف چلے جا رہے ہیں، ایک ہی گھر کا طواف کر رہے ہیں، ایک ہی ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں اور ان میں کسی قسم کا امتیاز نہیں۔ ہے تو وہ پکار اٹھا کہ یہ ہے نسل اور رنگ کے مسئلے کا حل، نہ کہ وہ جو ہم امریکہ میں اب تک کرتے رہے ہیں۔ آج خود غیر مسلم مفکرین بھی، جو اندھے تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس مسئلے کو جس کامیابی کے ساتھ اسلام نے حل کیا ہے کوئی دوسرا مذہب و مسلک نہیں کر سکا ہے۔

۸۔ نیکی میں ہر ایک سے تعاون اور بدی میں کسی سے تعاون نہیں۔

اسلام نے ایک بڑا اہم قاعدۂ کلیہ یہ پیش کیا ہے کہ "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو۔ بدی اور گناہ کے معاملے میں تعاون نہ کرو۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھلائی اور خداترسی کا کام کرے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ قطب شمالی کا رہنے والا ہو یا قطب جنوبی کا، وہ یہ حق رکھتا ہے کہ ہم اس سے تعاون کریں اور بجا طور پر یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ ہم اس سے تعاون کریں گے۔ اس کے برعکس جو شخص بدی اور زیادتی کا کام کرے، خواہ وہ ہمارا قریب ترین ہمسایہ یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اس کا نہ یہ حق ہے کہ نسل و وطن یا زبان و قومیت کے نام پر وہ ہمارا تعاون طلب کرے، نہ اسے ہم سے یہ امید رکھنی چاہئیے کہ ہم اس سے تعاون کریں گے، نہ ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ ایسے کسی کام میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔ بدکار ہمارا بھائی ہی کیوں نہ ہو ہمارا اور اس کا کوئی ساتھ نہیں ہے۔ نیک کام کرنے والا خواہ ہم سے کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو، ہم اس کے ساتھی اور مددگار رہیں۔ یا کم از کم خیر خواہ تو ضرور ہی ہیں۔

برسرِ جنگ دشمنوں کے حقوق

بین الاقوامی "قانون" کی حیثیت

اب قبل اس کے کہ میں اسلامی ریاست کے شہریوں کے حقوق بیان کروں میں بتانا چاہتا ہوں کہ دشمنوں کے کیا حقوق اسلام نے بتائے ہیں۔ جنگ کی تہذیب کے تصور سے دنیا قطعًا ناآشنا تھی۔ مغربی دنیا اس تصور سے پہلی مرتبہ سترھویں صدی کے مفکر گروشیوس (grotius) کے ذریعے سے آشنا ہوئی۔ مگر عملی طور پر بین الاقوامی قوانینِ جنگ کی تدوین انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے جنگ کی تہذیب کا کوئی تصور اہلِ مغرب کے ہاں نہیں پایا جاتا تھا۔ جنگ میں ہر طرح کے ظلم و ستم کیے جاتے تھے اور کسی قسم کے حقوق برسرِ جنگ قوم کے نہیں مانے جاتے تھے۔ انیسویں صدی میں اور اس کے بعد سے اب تک جو قوانین بھی بنائے گئے ہیں ان کی اصل نوعیت قانون کی نہیں بلکہ معاہدات کی سی ہے اور ان کو بین الاقوامی قانون کہنا درحقیقت لفظِ "قانون" کا بے جا استعمال ہے۔ کیونکہ کوئی قوم بھی جنگ میں اس کو اپنے لئے واجب العمل نہیں سمجھتی۔ اِلّا یہ کہ فریق ثانی بھی اُس کی پابندی کرے بالفاظِ دیگر جنگ کے ان مہذب قوانین میں یہ مفروضہ کام کر رہا ہے کہ اگر ہمارا حریف ان کا احترام کرے گا تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ جنگ کے وحشیانہ طریقوں پر اُتر آئے گا تو ہم بھی بے دریغ وہی طریقے استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کا نام قانون نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جنگ میں ان نام نہاد بین الاقوامی قواعد و ضوابط کے پُرزے اُڑائے گئے اور ہر مرتبہ ان پر نظرِ ثانی اور ان میں کمی و بیشی ہوتی رہی۔

اسلامی قانونِ جنگ و صلح کی حیثیت

اسلام نے اس کے برعکس جنگ کی جو تہذیب قائم کی ہے اس کی صحیح حیثیت قانون کی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کے لئے اللہ اور رسول کے دیئے ہوئے احکام ہیں جن کی پابندی ہم ہر حال میں کریں گے خواہ ہمارا دشمن کچھ بھی کرتا رہے۔ اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ علم کا کام ہے کہ جو قانونِ جنگ ۱۳ سو برس پہلے مقرر کیا گیا تھا، مغرب نے اس کی خوشہ چینی کی ہے یا نہیں، اور خوشہ چینی کرکے بھی وہ تہذیبِ جنگ کے اُس مقام تک پہنچ سکا ہے یا نہیں۔

جس پر اسلام نے ہمیں پہنچایا تھا۔ اہل مغرب ب ازقات یہ دعوی کیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ یہود و نصاریٰ سے لے لیا ہے۔ اس لئے بائیبل کو بھی پڑھ ڈالئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ان مدعیانِ تہذیب کی کتاب مقدس جنگ کے کن طریقوں کی ہدایت دیتی ہے۔[1]

ابتدا ہی میں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اسلام میں انسان بحیثیت انسان کے جو حقوق بیان کئے گئے ہیں، ان کا اعادہ کرنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے دیکھئے کہ دشمن انسان کے کیا حقوق اسلام میں مقرر کئے گئے ہیں۔

غیر مقاتلین کے حقوق

اسلام میں سب سے پہلے دشمن ملک کی مقاتل (combatant) اور غیر مقاتل (non-combatant) آبادی کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ جہاں تک غیر مقاتل آبادی کا تعلق ہے (یعنی جو لڑنے والی نہیں ہے یا لڑنے کے قابل نہیں ہے۔ مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، اندھے، اپاہج وغیرہ) اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں۔

جو لڑنے والے نہیں ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے۔

لَا تَقْتُلُوا شَيْخًا فَانِيًا ولا طفلاً صغيرًا ولا امرأةً "کسی بوڑھے، کسی بچے اور کسی عورت کو قتل نہ کرو۔"

لا تقتلوا اصحاب الصوامع "خانقاہ نشین راہبوں کو قتل نہ کرو۔" یا عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہ مارو۔"

جنگ میں ایک موقع پر حضورؐ نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو فرمایا "یہ تو نہیں لڑ رہی تھی۔" اس سے فقہائے اسلام نے یہ اصول اخذ کیا کہ جو لوگ غیر مقاتل ہوں ان کو قتل نہ کیا جائے۔

---

[1] اس غرض کے لیے بائبل کی کتاب خروج (exodus) باب ۳۲۔ کتاب گنتی (numbers) باب ۳۱۔ کتاب استثناء (deuteronomy) ابواب ۲۰، ۲۰ اور کتاب یشوع (Joshua) ابواب ۹، ۱۰ کو پڑھ لینا کافی ہے۔

مقابلین کے حقوق

اس کے بعد دیکھئے کہ لڑنے والوں کو کیا حقوق اسلام نے دیئے ہیں۔

۱۔ آگ کا عذاب نہ دیا جائے

حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار " آگ کا عذاب آگ کے رب کے سوا کسی کو زیب نہیں دیتا"۔ اس سے یہ حکم نکلا کہ دشمن کو زندہ نہ جلایا جائے۔

۲۔ زخمی پر حملہ نہ کیا جائے

لا تجھزن علی جریح۔ "کسی زخمی پر حملہ نہ کرو"۔ مراد ہے وہ زخمی جو لڑنے کے قابل نہ رہا ہو، نہ عملاً لڑ رہا ہے۔

۳۔ قیدی کو قتل نہ کیا جائے

لا یقتلن اسیر۔ "کسی قیدی کو نہ قتل کیا جائے"۔

۴۔ باندھ کر قتل نہ کیا جائے

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل الصبر۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھ کر قتل کرنے یا قید کی حالت میں قتل کرنے سے منع فرمایا"۔ حضرت ابوایوب انصاری جنہوں نے یہ روایت حضورؐ سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ " جس خدا کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی مرغ کو بھی باندھ کر ذبح نہ کروں گا"۔

۵۔ غنیم کے ملک میں عام غارت گری یا لوٹ مار نہ کی جائے

یہ ہدایت بھی کی گئی کہ غنیم کے ملک میں داخل ہو تو عام تباہی نہ پھیلاؤ، بستیوں کو ویران نہ کرو، سوائے اُن لوگوں کے جو تم سے لڑتے ہیں اور کسی شخص کے مال پر ہاتھ نہ ڈالو۔ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النھبی۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار سے منع فرمایا"۔ اور آپ کا ارشاد تھا کہ "ان النھبی لیست باحل من المیتۃ"۔ "لوٹ کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں ہے"۔ یعنی وہ بھی مردار کی طرح حرام ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوجوں کو روانہ کرتے وقت

ہدایت فرماتے تھے کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا۔ کھیتوں اور باغوں کو برباد نہ کرنا، مویشیوں کو ہلاک نہ کرنا۔ (مالِ غنیمت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس سے مراد وہ مال ہے جو غنیم کے لشکروں، اس کے فوجی کیمپوں اور اس کی چھاؤنیوں میں ملے۔ اس کو ضرور اسلامی فوجیں اپنے قبضے میں لیں گی۔ لیکن عام لوٹ مار وہ نہیں کر سکتیں)۔

ہ۔ مفتوح علاقے کے لوگوں سے کوئی چیز مفت یا بلا اجازت نہ لی جائے

اس بات سے بھی منع کر دیا گیا کہ عام آبادی کی کسی چیز سے معاوضہ ادا کئے بغیر فائدہ اٹھایا جائے۔ دورانِ جنگ میں اگر دشمن کے کسی علاقے پر قبضہ کر کے مسلمانوں کی فوج وہاں مقیم ہو تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ لوگوں کی چیزوں کا بے دریغ استعمال کرے۔ اگر اس کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو خرید کر لینا چاہیے۔ یا مالکوں کی اجازت لے کر اس کو استعمال کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوجوں کو روانہ کرتے وقت یہاں تک فرماتے تھے کہ دودھ دینے والے جانوروں کا دودھ بھی تم نہیں پی سکتے جب تک کہ ان کے مالکوں سے اجازت نہ لے لو۔

ی۔ دشمن کی لاشوں پر غصہ نہ نکالا جائے

اسلام میں قطعی طور پر اس بات کو بھی منع کیا گیا ہے کہ دشمن کی لاشوں کی تذلیل کی جائے یا اُن کا مُثلہ کیا جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن المثلۃ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کی لاشوں کا مثلہ (یعنی ان کی قطع و برید) کرنے سے منع فرمایا"۔ یہ حکم جس موقع پر دیا گیا وہ بھی نہایت سبق آموز ہے۔ جنگِ احد میں جو مسلمان شہید ہوئے تھے، دشمنوں نے ان کی ناک کاٹ کر ان کے ہار بنائے اور گلوں میں پہنے۔ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا پیٹ چیر کر ان کا کلیجہ نکالا گیا اور اسے چبانے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت مسلمانوں کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ تم غنیم کے مقتولوں کے ساتھ یہ سلوک نہ کرنا۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دین فی الحقیقت خداوند عالم ہی کا بھیجا ہوا دین ہے۔ اس میں انسانی جذبات کا اگر دخل ہوتا تو جنگِ احد میں یہ منظر دیکھ کر حکم دیا جاتا کہ تم بھی غنیم کے مقتولوں کا

اسی طرح مُثلہ کرد۔

۸۔ دشمن کی لاشیں اس کے حوالے کرنا

جنگ احزاب میں دشمن کا ایک بڑا مشہور شہسوار مر کر خندق میں گر گیا۔ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دس ہزار دینار پیش کیے کہ اس کی لاش ہمیں دے دیجئے آپ نے فرمایا کہ میں مُردے بیچنے والا نہیں ہوں تم لے جاؤ۔ اپنی لاش۔

۹۔ بدعہدی کی سخت ممانعت

اسلام میں بدعہدی کی بھی سختی سے ممانعت کر دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیتے تھے، ان میں سے ایک یہ تھی کہ۔ لَا تَغْدِرُوا ؎ بدعہدی نہ کرنا۔ قرآن مجید اور احادیث میں اس حکم کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ دشمن اگر عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کرے۔ لیکن تم کو اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کبھی نہ کرنا چاہیے۔ صلح حدیبیہ کا مشہور واقع ہے کہ صلح نامہ طے ہو جانے کے بعد ایک مسلمان نوجوان ابو جندلؓ، جن کا باپ صلح نامے کی شرائط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کر رہا تھا، بیڑیوں میں بھاگتے ہوئے آئے اور انہوں نے کہا مسلمانو مجھے بچاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اب معاہدہ ہو چکا ہے۔ اب ہم تمہاری مدد نہیں کر سکتے تم واپس جاؤ۔ اللہ تمہارے لئے کوئی راستہ کھول دے گا۔ ان کی حالتِ زار کو دیکھ کر مسلمانوں کی پوری فوج رو پڑی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرما دیا کہ عہد کی خلاف ورزی ہم نہیں کر سکتے تو ان کو بچانے کے لئے ایک ہاتھ بھی آگے نہ بڑھا۔ اور کفار ان کو زبردستی گھسیٹ کر لے گئے۔ یہ عہد و پیمان کی پابندی کی بے نظیر مثال ہے اور اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

۱۰۔ جنگ سے پہلے اعلانِ جنگ کا حکم

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؎ اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت (یعنی عہد شکنی) کا خطرہ ہو تو اس کا عہد علانیہ اس کے منہ پر مار دو۔ اس آیت میں اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ اعلانِ

جنگ کے بغیر دشمن کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے۔ الّا یہ کہ دوسرا فریق جارحانہ کارروائیوں کی ابتداء کر چکا ہو۔ اگر دوسرے فریق نے اعلان کے بغیر جارحانہ کارروائیوں کی ابتداء کر دی ہو تو پھر ہم بلا اعلان اس کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔ ورنہ قرآن مجید ہمیں یہ حکم دے رہا ہے کہ علانیہ اس کو بتا دو کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی عہد باقی نہیں رہا ہے اور اب ہم اور تم برسرِ جنگ ہیں۔ اگرچہ موجودہ بین الاقوامی قانون کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اعلانِ جنگ کے بغیر جنگ نہ کی جائے۔ لیکن اس بیسویں صدی میں بھی تمام بڑی بڑی لڑائیاں بلا اعلانِ جنگ شروع ہوئی ہیں۔ وہ اُن کا اپنا بنایا ہوا قانون ہے اس لئے وہ اپنے ہی قانون کو توڑنے کے مجاز ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ خدا کا دیا ہوا قانون ہے ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔

اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق

اب میں آپ کو شہریوں کے حقوق بتانا چاہتا ہوں۔ یہ حقوق اُن حقوق سے زائد ہیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں انسان بحیثیت انسان کے حقوق بیان کر چکا ہوں۔

۱۔ جان و مال کا تحفظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حَجَّۃُ الْوَدَاع کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا تھا کہ تمہاری جانیں اور تمہارے مال ایک دوسرے پر قیامت تک کے لئے حرام ہیں (اِنَّ دِمَآءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ اِلٰٓی اَنْ تَلْقَوْا رَبَّکُمْ) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا۔ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ نے اس پر لعنت فرمائی ہے اور اس کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ذمّیوں کے متعلق بھی فرمایا کہ مَنْ قَتَلَ مُعَاھِدًا لَمْ یَرِحْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ۔ جس نے کسی معاہد (یعنی ذمّی)

کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا۔ قرآن قتلِ نفس کو حرام قرار دینے کے بعد اس میں صرف ایک استثناء رکھتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسا قتل حق کے ساتھ ہو۔ یعنی ناحق نہ ہو بلکہ کوئی قانونی حق اس کا تقاضا کرتا ہو کہ آدمی کو قتل کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ حق اور ناحق کا فیصلہ ایک عدالت ہی کر سکتی ہے اور جنگ یا بغاوت کی صورت میں ایک عادل حکومت، یعنی شریعت کی پابند حکومت ہی یہ طے کر سکتی ہے کہ برحق جنگ کون سی ہے جس میں انسانی خون بہانا جائز ہو، اور قانونِ اسلام کی رو سے باغی کون قرار پاتا ہے۔ جس پر تلوار اٹھائی جائے، یا جس کو موت کی سزا دی جائے۔ یہ فیصلے نہ کسی ایسی عدالت پر چھوڑے جا سکتے ہیں جو خدا سے بے خوف انتظامیہ سے مرعوب و خوفزدہ ہو کر انصاف کا خون کرنے لگے۔ اور نہ کسی ایسی حکومت کے جرائم قرآن و حدیث کی سند پر جائز قرار پا سکتے ہیں جو بلا تکلف اپنے شہریوں کو صرف اس لئے خفیہ یا علانیہ قتل کرواتی ہو کہ وہ اس کی ناروا کارروائیوں سے اختلاف کرتے یا ان پر تنقید کرتے ہیں۔ اور اُس کے اشارے پر قتل جیسے جرمِ عظیم کا ارتکاب کرنے والوں کو اُلٹا تحفظ بہم پہنچاتی ہو کہ اُن کے خلاف نہ پولیس کارروائی کرے نہ عدالت میں کوئی ثبوت اور شہادت پیش ہو سکے۔ ایسی حکومت کا تو وجود ہی ایک جرم ہے، کجا کہ اس کے حکم سے کسی انسان کے قتل پر قرآن کی اصطلاح "قتل بالحق" کا اطلاق ہو سکے۔

جان کے ساتھ مال کے تحفظ کا حق بھی اسلام نے پوری صراحت کے ساتھ دیا ہے۔ جیسا کہ ابھی میں حجۃ الوداع کی تقریر کے حوالہ سے بیان کر چکا ہوں۔ بلکہ قرآن مجید تو خدا کے قانون کے سوا کسی اور طریقہ سے لوگوں کے مال لینے کو قطعی حرام قرار دیتا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ "اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھایا کرو۔"

۲۔ عزت کا تحفظ

دوسرا اہم حق ایک شہری کی عزت کا تحفظ ہے۔ حجۃ الوداع کے جس خطبے کا میں ذکر کر چکا ہوں اس میں حضورؐ نے مسلمانوں کی صرف جان و مال ہی کو ایک دوسرے پر

حرام قرار نہیں دیا تھا بلکہ ان کی عزت و آبرو (اَعْرَاضَکُمْ) کو بھی تا قیامت حرام ٹھیرایا تھا۔ قرآن مجید میں صاف حکم ہے کہ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ "لوگ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، ایک دوسرے کی تضحیک نہ کریں۔ وَ لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ "اور تم آپس میں ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرو، پھبتیاں نہ کسو، الزام نہ دھرو، طعنے نہ دو کھلم کھلا یا زیرلب یا اشاروں سے اس کی تذلیل نہ کرو۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ "ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو"۔ وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا "اور تم میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کرے"۔ یہ ہے ہمارا قانون تحفظِ عزت اور یہ اہل مغرب کے قانون ہتک عزت (defamation) سے بدرجہا بہتر ہے۔ ہمارے قانون کی رُو سے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کسی نے کسی شخص کی عزت پر حملہ کیا ہے تو قطعِ نظر اس سے کہ وہ مظلوم اپنے آپ کو عزت دار ثابت کرتا ہے یا نہیں۔ ظالم کو اس کی سزا بہرحال دی جائے گی۔ لیکن مغربی قانون کا کمال یہ ہے کہ ہتک عزت کا دعویٰ کرنے والے کو پہلے یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ وہ عزت والا ہے اور اس بحث میں اُس غریب کی اُس سے زیادہ توہین و تذلیل ہو جاتی ہے جس کی فریاد لے کر وہ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانے گیا تھا۔ مزید برآں اسے چند ایسے گواہ بھی پیش کرنے پڑتے ہیں کہ ملزم کی توہین آمیز باتوں سے وہ واقعی اُن کی نگاہ میں ذلیل ہو گیا ہے۔ سبحان اللہ! کس غضب کی قانون دانی ہے یہ جسے خدا کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اسلام تو بجائے خود کسی شخص کی توہین کو جرم قرار دیتا ہے۔ خواہ وہ عزت والا ہو یا نہ ہو اور خواہ توہین کرنے والے کی باتوں سے اس کی واقعی توہین ہوئی ہو یا نہیں۔ اسلامی قانون کی رد سے ملزم کے اس فعل کا ثابت ہو جانا اُس کو مجرم قرار دینے کے لئے کافی ہے کہ اس نے ایسی بات کی ہے جو عقل عام (common sense) کے لحاظ سے مستغیث کے لئے موجب توہین ہو سکتی ہے۔

۳۔ نجی زندگی کا تحفظ

اسلام اپنی مملکت کے ہر شہری کا یہ حق قرار دیتا ہے کہ اس کی نجی زندگی میں کوئی ناروا مداخلت نہ ہونے پائے۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ لَا تَجَسَّسُوْا "ایک دوسرے کے حالات

کا تجسّس نہ کرو۔ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا۔ لوگوں کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک تاکید کی کہ آدمی خود اپنے گھر میں بھی اچانک نہ داخل ہو بلکہ کسی نہ کسی طرح اہل خانہ کو خبردار کر دے کہ وہ اندر آرہا ہے تاکہ ماں بہنوں اور جوان بیٹیوں پر ایسی حالت میں نظر نہ پڑے جس میں نہ وہ اسے پسند کرسکتی ہیں کہ انہیں دیکھا جائے۔ نہ خود وہ شخص یہ پسند کرتا ہے کہ انہیں دیکھے۔ دوسروں کے گھر میں جھانکنے کی کوشش کرنا بھی سخت ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اپنے گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھے اور وہ اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ حضورؐ نے دوسرے کا خط تک اس کی اجازت کے بغیر پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی اپنا خط پڑھ رہا ہو اور دوسرا شخص جھانک کر اسے پڑھنے لگے تو یہ بھی سخت منع ہے۔ یہ ہے اسلام میں انسان کے تخلیے (privacy) کا تقدس۔ ادھر اس جدید تہذیب کے تحت ہماری دنیا کا حال یہ ہے کہ نہ صرف لوگوں کے خطوط پڑھے جاتے ہیں اور ان کو سنسر کیا جاتا ہے اور باقاعدہ ان کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں بھی رکھ لی جاتی ہیں، بلکہ اب لوگوں کے گھروں میں ایسے آلات بھی لگائے جانے لگے ہیں جن کی مدد سے آپ دُور بیٹھے ہوئے یہ سُنتے رہیں کہ اس کے گھر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اب تخلیہ کوئی چیز نہیں ہے اور آدمی کی نجی زندگی کا عملاً خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

اس تجسّس کے لئے یہ کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ حکومت خطرناک آدمیوں کے رازوں سے واقف رہنا ضروری سمجھتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس کی بنیاد وہ شک و شبہ ہے جس سے آج کل کی حکومتیں اپنے ہر اُس شہری کو دیکھتی ہیں جس میں وہ کچھ ذہانت اور سرکاری پالیسیوں پر عدم اطمینان کی بو سونگھ لیتی ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو اسلام سیاست میں فساد کی جڑ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اِنَّ الْاَمِيْرَ اِذَا ابْتَغَى الرِّيْبَةَ فِي النَّاسِ اَفْسَدَهُمْ "حاکم وقت جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگتا ہے تو ان کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے"۔ امیر معاویہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے خود حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اِنَّكَ اِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَهُمْ اَوْ كِدْتَ اَنْ تُفْسِدَهُمْ "تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہو گئے تو انھیں بگاڑ دو گے یا کم ازکم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے"۔ بگاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے راز ٹٹولنے کے لئے جاسوس (سی۔آئی۔ڈی کے آدمی) ہر طرف پھیلا دیئے جاتے ہیں تو لوگ خود ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں حتیٰ کہ اپنے گھروں تک میں وہ کھل کر بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ نہ معلوم اپنے ہی بچوں کی زبان سے کوئی بات ایسی نکل جائے جو ہم پر آفت لے آئے۔ اس طرح اپنے گھر تک میں زبان کھولنا آدمی کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اور معاشرے میں ایک عام بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ شخصی آزادی کا تحفظ

اسلام یہ اصول بھی طے کرتا ہے کہ کسی شخص کو اس کا جرم عدالت میں، اور وہ بھی کھلی عدالت میں ثابت کئے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔ محض شبہ کی بنا پر پکڑنا اور کسی عدالتی کاروائی کے بغیر اور صفائی کا موقع دیئے بغیر قید کر دینا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے۔ خطبے کے دوران میں ایک شخص نے اٹھ کر کہا: "یا رسولؐ اللہ! میرے ہمسائے کس جرم میں پکڑے گئے ہیں؟"۔ آپؐ نے سنا اور خطبہ جاری رکھا۔ اس نے پھر اٹھ کر یہی سوال کیا۔ آپؐ نے پھر خطبہ جاری رکھا۔ اس نے تیسری بار پھر اُٹھ کر یہی سوال کیا۔ تب آپؐ نے حکم دیا کہ اس کے ہمسایوں کو چھوڑ دو۔ دو مرتبہ سن کر خاموش رہنے کی وجہ یہ تھی کہ کوتوال مسجد میں موجود تھا۔ اگر شخص مذکور کے ہمسایوں کو گرفتار کرنے کی کوئی خاص وجہ ہوتی تو وہ اُٹھ کر اُسے بیان کرتا۔ جب اس نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ کوتوال اسلامی قانون سے واقف تھا۔ اس لئے اُس نے اُٹھ کر یہ نہیں کہا کہ "انتظامیہ اُن کے قصور سے واقف ہے اور عَلانیہ وہ قصور بیان نہیں کیا جا سکتا، حضور تخلیہ میں دریافت فرمائیں تو عرض کر دیا جائے گا"۔ یہ بات اگر کوتوال زبان سے نکالتا تو اُسی وقت کھڑے کھڑے اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا۔ عدالت کے لئے

یہ بات بالکل کافی تھی کہ کوتوال نے گرفتاری کی کوئی وجہ کھلی عدالت میں پیش نہیں کی ہے۔ اس لئے فوراً رہائی کا حکم صادر کر دیا گیا۔ قرآن کا صاف حکم ہے کہ "وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ" "اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو" اور حضورؐ کو خود یہ حکم تھا کہ "اُمِرْتُ اَنْ اَعْدِلَ بَيْنَكُمْ" "اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں" اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْاِسْلَامِ اِلَّا بِالْعَدْلِ" "اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا" یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ عدل سے مراد معقول عدالتی طریقہ کار (due process of law) ہے۔ اور جس کی نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو ثبوت جرم اور عدالت میں صفائی کا موقع دیئے بغیر پکڑ کر قید کر دیا جائے۔ اگر حکومت کسی پر یہ شبہ رکھتی ہو کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے یا وہ کوئی جرم کرنے والا ہے تو اسے عدالت کے سامنے اپنے شبہ کے وجوہ بیان کرنے چاہئیں۔ اور ملزم یا مشتبہ آدمی کو کھلی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنی چاہئیے تاکہ عدالت یہ فیصلہ کر سکے کہ اس شخص پر شبہ کی کوئی معقول بنیاد ہے یا نہیں اور معقول بنیاد ہے تو اس کو جرم سے باز رکھنے کے لئے کتنی مدت تک قید رکھنا چاہیے۔ یہ فیصلہ لازماً کھلی عدالت میں ہونا چاہئیے نہ کہ بند کمرے میں (in camera) تاکہ حکومت کا الزام اور ملزم کی صفائی اور عدالت کی کارروائی دیکھ کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جا رہا ہے۔ بے انصافی نہیں کی جا رہی ہے۔

اس معاملہ میں اسلام کا طریق کار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے سے معلوم ہوتا ہے۔ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے لئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیاری فرما رہے تھے تو ایک صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے سرداران مکہ کے نام ایک خط لکھ کر اس تیاری کی اطلاع دے دی۔ اور وہ خط ایک عورت کے ہاتھ مکے بھیج دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہو گیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ جاؤ فلاں مقام پر ایک عورت تم کو ملے گی۔ اس کے پاس ایک خط ہے۔ وہ اس سے حاصل کر کے لے آؤ۔ چنانچہ وہ گئے اور جو مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا اسی جگہ

وہ عورت ملی۔ دونوں صاحبوں نے خط اس سے برآمد کر لیا اور لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا۔ اب دیکھئے کھلی ہوئی غداری کا مسئلہ تھا۔ جنگ کے زمانے میں دشمن کو اپنی فوج کے ایک اہم راز کی خبر دے دینا اور دشمنوں کو حملے کی خبر قبل از وقت بھیج دینا ایسا فعل تھا جس سے زیادہ خطرناک فعل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے زیادہ بند کمرے میں سماعت کے لئے اور کون سا مقدمہ موزوں ہو سکتا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کی کھلی عدالت میں سینکڑوں حاضرین کے سامنے حضرت حاطبؓ کو بلا کر ان سے باز پرس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اسلام سے باغی نہیں ہوا ہوں۔ غداری کی نیت سے یہ کام میں نہیں کر بیٹھا ہوں۔ دراصل میرے بال بچے وہاں ہیں اور مکے میں کوئی میرا قبیلہ نہیں ہے۔ جو میرے بال بچوں کی حمایت کرے، اس لئے میں نے یہ خط لکھا تاکہ اہل مکہ میرا احسان مان کر میرے بال بچوں کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجئے کہ اس غدار کو قتل کر دوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ یہ اہل بدر میں سے ہیں اور انہوں نے اپنے فعل کی جو وجہ بیان کی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے۔ حضورؐ کے اس فیصلے پر غور کیجئے۔ فعل صریح غداری کا تھا۔ مگر آپؐ دو باتوں کی وجہ سے حضرت حاطبؓ کو بری کر دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا ماضی بتا رہا ہے کہ وہ اسلام کے غدار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انہوں نے جنگ بدر جیسے نازک موقع پر اپنا سینہ خطرات کے آگے پیش کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مکے میں ان کے بال بچے واقعی خطرے میں تھے۔ اس لئے اگر ان سے یہ کمزوری سرزد ہوئی ہے تو اس کی یہ سزا کافی ہے کہ سب کے سامنے ان کا راز کھل گیا اور اسلام کے وفاداروں کی نگاہ میں ان کی بے عزتی ہو گئی۔ قرآن مجید میں بھی حضرت حاطبؓ کے اس واقعہ کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے مگر زجر و توبیخ کے سوا ان کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خارجیوں کا طرز عمل جیسا کچھ تھا وہ تاریخ کے طالب علموں سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ علانیہ آپ کو گالیاں دیتے تھے۔ قتل تک کر دینے کی آپ کو دھمکیاں دیتے تھے۔ مگر ان باتوں پر جب کبھی ان کو پکڑا گیا آپ نے انہیں چھوڑ دیا۔

اور اپنی حکومت کے افسروں سے فرمایا کہ "جب تک وہ باغیانہ کاروائیاں نہیں کرتے محض زبانی مخالفت اور دھمکیاں ایسی چیز نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے" امام ابو حنیفہ امیرالمومنین کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ مَا لَمْ یعزموا علی الخروج فا لامامُ لَا یَتَعَرَّضُ لَھُمْ "جب تک وہ خروج (مسلح بغاوت) کا عزم نہیں کرتے خلیفہ وقت ان سے تعرض نہ کرے گا" ایک اور موقع پر حضرت علیؓ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ خارجیوں نے اپنا مخصوص نعرہ دوران خطبہ میں بلند کیا۔ آپ نے اس پر فرمایا۔ لَنْ نَمْنَعَکُمْ مساجدَ اللهِ اَنْ تذکروا فیھا اسمَ اللهِ وَلن نمنعکم الفیَٔ مادامت ایدیکم مع اَیدینا ولن نقاتلکم حتّٰی تقاتلونا۔ "ہم تمہیں مسجدوں میں آکر اللہ کو یاد کرنے سے نہ روکیں گے اور حکومت کے مال میں سے تمہارا حق دینا بھی بند نہ کریں گے۔ جب تک تمہارے ہاتھ ہمارے ہاتھوں کے ساتھ ہیں (یعنی جب تک تم دشمنانِ اسلام کے خلاف لڑنے میں ہمارا ساتھ دیتے رہو گے) اور ہم تم سے ہرگز جنگ نہ کریں گے جب تک تم ہم سے جنگ نہیں کرتے" اب دیکھیے جس اپوزیشن سے حضرت علیؓ کو سابقہ درپیش تھا، ایک جمہوری نظام میں اُس سے زیادہ سخت اپوزیشن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کے مقابلے میں جو آزادی انہوں نے دے رکھی تھی کسی حکومت نے ایسی آزادی اپوزیشن کو نہیں دی۔ انہوں نے قتل کی دھمکیاں دینے والوں کو بھی نہ گرفتار کیا اور نہ کسی کو جیل بھیجا۔

۵۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق

اسلام کے دیئے ہوئے حقوق میں سے ایک ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کا حق ہے اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ۔ لَا یُحِبُّ اللهُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ "اللہ کو برائی کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں ہے سوائے اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو" یعنی اللہ برائی پر زبان کھولنے کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ لیکن جس شخص پر ظلم کیا گیا ہو اس کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ علی الاعلان ظلم کے خلاف آواز اٹھائے۔ یہ حق صرف افراد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص نہیں بلکہ کوئی جماعت یا گروہ اقتدار پر غلبہ حاصل کرکے افراد یا جماعتوں یا ملک کی پوری آبادی پر

ظلم ڈھانے لگے تو اُن کے خلاف برسرِ عام صدائے احتجاج بلند کرنا خدا کا دیا ہوا حق ہے۔ اور اس حق کو سلب کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اب اگر کوئی اللہ کے دیئے ہوئے اس حق کو سلب کرتا ہے تو وہ اللہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ دفعہ ۴۴ اکا تعویذ اُسے دنیا میں چاہے بچالے جائے اللہ کی دوزخ سے بچانا اُس کی کرامتوں میں شامل نہیں ہے۔

۷۔ آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق

مملکتِ اسلامیہ کے تمام شہریوں کو اسلام آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ وہ بھلائی پھیلانے کے لئے ہو نہ کہ برائی پھیلانے کے لئے۔ اظہارِ رائے کی آزادی کا یہ اسلامی تصور موجودہ مغربی تصور سے بدرجہا بلند ہے۔ بُرائی پھیلانے کی آزادی اسلام نہیں دیتا۔ تنقید کے نام سے دشنام طرازی کی بھی وہ اجازت نہیں دیتا۔ البتہ اُس کے نزدیک بھلائی پھیلانے کے لئے اظہارِ رائے کا حق صرف حق ہی نہیں بلکہ مسلمان پر ایک فرض بھی ہے جسے روکنا خدائے ذوالجلال سے لڑائی مول لینا ہے اور یہی معاملہ بُرائی سے منع کرنے کا بھی ہے۔ بُرائی خواہ کوئی شخص کر رہا ہو، یا کوئی گروہ، خود اپنے ملک کی حکومت کر رہی ہو یا کسی دوسرے ملک کی، اپنی قوم کر رہی ہو، یا دنیا کی کوئی دوسری قوم، مسلمان کا حق ہے اور یہ اس کا فرض بھی ہے کہ اسے ٹوکے، اس سے روکے، اور اس کے خلاف علی الاعلان اظہارِ ناراضی کر کے یہ بتلائے کہ بھلائی کیا ہے جسے اُس فرد، یا قوم، یا حکومت کو اختیار کرنا چاہیئے۔

قرآن مجید میں مومنوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ یَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ "وہ بھلائی کے لئے کہنے والے اور بُرائی سے روکنے والے ہوتے ہیں"۔ اس کے برعکس منافقوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ "وہ برائی کے لئے کہنے والے اور بھلائی سے روکنے والے ہوتے ہیں"۔ اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی حکومت کا مقصد وجود ہی یہ ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ "ان کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص برائی کو دیکھے تو ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتا تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو دل سے روکے یعنی کم از کم دل سے اسے برا سمجھے۔ اور یہ آخری درجہ ہے ایمان کا۔ اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حیثیت اگر کوئی حکومت لوگوں سے یہ حق چھینتی ہے اور انہیں یہ فرض ادا کرنے نہیں دیتی تو وہ براہِ راست خدا کے حکم سے ٹکرا رہی ہے۔ اس کا تصادم ہم سے نہیں ہے۔ اس کا تصادم خدا سے ہے۔ وہ خدا کے مقابلے میں برسرِ جنگ ہے اور اُس حق کو چھین رہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف حق ہی نہیں فرض قرار دیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ رہی وہ حکومت جو برائیوں کو پھیلاتی اور پھیلنے دیتی ہے، اور بھلائی کی طرف دعوت دینے والوں کی مزاحمت کرتی ہے، تو وہ از روئے قرآن منافقوں کی حکومت ہے۔

۷۔ آزادیٔ اجتماع کا حق

اجتماع اور جماعت سازی کا حق بھی اسلام نے لوگوں کو دیا ہے مگر وہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ بھلائی پھیلانے کے لئے ہو، برائی پھیلانے کے لئے نہ ہو۔ اس نوعیت کے اجتماع اور اس قسم کی جماعت سازی کا صرف حق ہی نہیں بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح) کے لئے نکالا گیا ہے، تم نیکی کے لئے کہتے ہو اور برائیوں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" یعنی پوری کی پوری مسلمان اُمت ہی کا یہ کام ہے کہ وہ بھلائی کے لئے لوگوں سے کہے اور برائی سے روکے۔ لیکن اگر سب مسلمان ایسے نہ ہوں تو کم از کم وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "تم میں ایک گروہ تو ایسا ہونا ہی چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کے لئے کہے اور بدی سے روکے اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

مسلمان قوم اگر مجموعی طور پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے غافل بھی ہو جائے
تو ان میں سے ایک گروہ کا موجود رہنا ضروری ہے۔ جو بھلائی پھیلانے، برائی سے روکنے اور
خیر کی طرف دعوت دینے کی خدمت انجام دے۔ یہ حق ہی نہیں، فرض ہے جس کے ادا کرنے
پر فلاح کا انحصار ہے لیکن خدا کے دین کے ساتھ یہ عجیب مذاق ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں
برائی پھیلانے کے لئے جو اجتماع اور جماعت سازی ہو وہ تو حکومت کرنے کا حق رکھے اور
بھلائی پھیلانے کے لئے جو جماعت سازی ہو وہ ہر وقت خطرے میں مبتلا رہے کہ نہ معلوم
کب اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں
اور یہ ریاست اسلامی ہے۔ لیکن ہو رہا ہے امر بالمنکر اور نہی عن المعروف اور جینا دشوار کیا
جا رہا ہے انہی لوگوں کے لئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کی
کوشش کرتے ہیں۔

۸۔ ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق

اسلام اپنے معاشرے اور اپنی مملکت میں لوگوں کو ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق بھی دیتا
ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ "دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے"۔
اگرچہ دینِ حق سے بڑی کوئی نیکی نہیں ہے اور مسلمان اس کی طرف دعوت ضرور دیں گے اور اس کی
حقانیت دلائل سے بھی ثابت کریں گے، مگر یہ نیکی لوگوں پر زبردستی مسلط نہیں کی جائے گی۔
جو شخص اس کو مانے تو اپنی مرضی سے مانے۔ ہم اسے سینے سے لگائیں گے اور اپنے معاشرے
میں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شامل کر لیں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کو نہ مانے تو
ہم اس کا یہ حق بھی تسلیم کریں گے کہ وہ اس کو نہ مانے۔ کوئی جبر اس پر نہیں کیا جائے گا۔

۹۔ مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق

آزادیٔ اعتقاد و آزادیٔ ضمیر کے ساتھ اسلام نے لوگوں کو یہ حق بھی دیا ہے کہ ان کی مذہبی
دل آزاری نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ جن معبودوں کو یہ مشرکین اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو۔
یہ معاملہ صرف بتوں اور معبودوں ہی کی حد تک خاص نہیں ہے، بلکہ کسی قوم کے بزرگوں اور

پیشواؤں کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ایک گروہ اگر آپ کے نزدیک برا عقیدہ رکھتا ہے، اور اُن لوگوں کو اپنا بزرگ مانتا ہے جو آپ کے نزدیک بزرگی کے مستحق نہیں ہیں، تو آپ ان کو گالیاں دینے لگیں اور اپنی اس بیہودہ حرکت سے اُن کے ماننے والوں کا دل دکھائیں۔ مذہبی مسائل میں بحث مباحثہ کرنے سے اسلام نہیں روکتا مگر وہ چاہتا ہے کہ یہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ہو۔ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ "اہل کتاب سے مباحثہ نہ کرو مگر احسن طریقے سے" یہ حکم صرف اہل کتاب ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ سب اہل مذاہب کے لئے ہے۔

۱۰۔ یہ حق کہ ایک کے قصور میں دوسرا نہ پکڑا جائے۔

اسلام انسان کا یہ حق بھی قرار دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے قصور میں نہ دھر لیا جائے قرآن مجید میں یہ عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا"۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ دوسرے کسی شخص کا اگر اس کے فعل میں کوئی حصہ نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری میں وہ نہیں پکڑا جا سکتا۔

افسوس کہ اس صریح منصفانہ اور معقول قاعدے کو بھی، جو کسی انسان کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ رب کائنات کا مقرر کردہ ہے، ہم پامال ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ قصوروار ایک شخص ہے اور پکڑی جا رہی ہے اس کی بیوی۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ کراچی میں ایک شخص پر شبہ کیا گیا کہ وہ ایک بم کیس میں ملوّث ہے۔ تفتیش کے لئے اسے پکڑ کر اسے سخت اذیتیں دی گئیں کہ وہ اس جرم کا اعتراف کرے۔ جب اس نے کہا کہ میں بالکل بے قصور ہوں تو اس کی ماں، اس کی بیوی، اس کی بیٹی، اس کی بہن سب کو پکڑ لایا گیا، اس کے سامنے اُن کو اور اُن کے سامنے اس شخص کو برہنہ کیا گیا تاکہ وہ اعتراف جرم کرے۔ گویا اب تفتیش جرائم کے لئے یہ بھی جائز ہو گیا کہ مشتبہ شخص پر دباؤ ڈالنے کے لئے اس کے گھر کی بے قصور خواتین کو ننگا کیا جائے۔ یہ سخت شرمناک ہے۔ کمینہ پن کی انتہا ہے۔ میں یہ ہوائی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ مجھے اس واقعہ کا علم ہے اور میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ایسے

ظالموں کو کیا حق ہے کہ وہ کہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم اسلام کے مطابق حکمرانی کر رہے ہیں اور ہماری ریاست اسلامی ہے۔ قرآن کے ایک صریح قاعدے کو توڑ رہے ہو، مردوں اور عورتوں کو برہنہ کرتے ہو جو اسلام میں قطعی حرام ہے۔ انسانیت کی مٹی پلید کرتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

۱۱۔ ہر حاجت مند کا یہ حق ہے کہ اس کی مدد کی جائے

اسلام میں حاجت مند لوگوں کا یہ حق قرار دیا گیا ہے کہ اُن کی دستگیری کی جائے۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "مسلمانوں کے مال میں حق ہے ہر اس شخص کا جو مدد مانگے۔ اور ہر اُس شخص کا جو محروم ہو"۔ اس آیت میں صرف مدد مانگنے والے ہی کا حق مسلمان کے مال میں قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے علم میں یہ بات آئے کہ فلاں شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ گیا ہے تو قطع نظر اس سے کہ وہ مانگے یا نہ مانگے، تمہارا کام یہ ہے کہ خود اس تک پہنچو اور اس کی مدد کرو۔ اس غرض کے لیے صرف رضاکارانہ انفاق فی سبیل اللہ پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ زکوٰۃ بھی فرض کر دی گئی ہے۔ اور اس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَآءِ هِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَآءِ هِمْ "وہ مسلمانوں کے مال داروں سے لی جاتی ہے اور ان کے غریبوں پر صرف کی جاتی ہے"۔ اس کے ساتھ اسلامی حکومت کی بھی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ جس کا کوئی دستگیر نہ ہو اس کی دستگیری وہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَهٗ "حکمران اُس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو"۔ یہ ولی کا لفظ بہت وسیع معنی رکھتا ہے۔ کوئی یتیم، کوئی بوڑھا، کوئی اپاہج کوئی بے روزگار، کوئی مریض اگر اس حالت میں ہو کہ دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہ ہو تو حکومت کو اس کے لئے سہارا بننا چاہیے۔ اگر کوئی میت ایسی ہو جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو تو اُس کا جنازہ اُٹھانا اور اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا حکومت کے ذمے ہے۔ غرض یہ دراصل ایک ولایتِ عامہ ہے جس کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

۱۲۔ قانون کی نگاہ میں مساوات کا حق

اسلام اپنی مملکت کے تمام شہریوں کو قانون کی نگاہ میں مساوات کا حق دیتا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو قرآن اور حدیث میں یہ صاف وضاحت ہے کہ اپنے حقوق اور واجبات میں وہ سب برابر ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ "مومن تو آپس میں بھائی ہیں"۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ "اگر (غیر مسلم) کفر سے توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَآؤُهُمْ "مسلمانوں کے خون برابر کی قدر و قیمت رکھتے ہیں"۔ دوسری حدیث میں ہے ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ يَسْعٰى بِهَا اَدْنَاهُمْ "سب مسلمانوں کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان کا ایک ادنیٰ شخص بھی کسی کو پناہ یا امان دے سکتا ہے"۔ ایک اور مفصل حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت مان لیں، اور ہر قسم کے تعصبات چھوڑ کر ملتِ اسلام میں شامل ہو جائیں، ان کے حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے حقوق ہیں اور ان کے فرائض بھی وہی ہیں جو مسلمانوں کے فرائض ہیں (لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ) یہ دینی بھائی چارہ، اور حقوق و فرائض کی یکسانی اسلامی معاشرے میں مساوات کی بنیاد ہے اور اس میں کسی کے حقوق و فرائض کسی دوسرے کے حقوق و فرائض سے کسی معنی میں بھی کم یا زیادہ نہیں ہیں۔ رہے اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہری، تو ان کے بارے میں اسلامی شریعت کا قاعدہ خلیفۂ برحق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "انہوں نے ہمارا ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہو جائیں۔ (لِتَكُوْنَ اَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا وَدِمَآؤُهُمْ كَدِمَآئِنَا) بالفاظِ دیگر ان کے جان و مال کی حرمت بھی اسلامی مملکت میں ویسی ہی ہے جیسی مسلمان کی جان و مال کی حرمت ہے۔ قرآن مجید فرعون کے بدترین جرائم میں اس جرم کو بھی شمار کرتا ہے کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا۔ "اس نے ملک کے باشندوں کو الگ الگ طبقوں میں بانٹ دیا تھا" اور يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ "وہ ان میں سے ایک گروہ کو دبا کر رکھتا تھا"۔

۱۳۔ حاکموں کا قانون سے بالاتر نہ ہونا

اسلام صریح طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام حکام حتیٰ کہ صدرِ مملکت بھی قانون کی نگاہ میں عام شہریوں کی طرح ہوں، کوئی قانون سے بالاتر نہ ہو اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے مقابلے میں بھی ایک عام شہری اپنے حق کا دعویٰ لے کر اُٹھ سکے حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ "میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔" جنگِ بدر کا واقعہ ہے کہ حضورؐ اسلامی فوج کی صفیں سیدھی کرا رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ اتفاق سے آگے بڑھے ہوئے ایک سپاہی کو پیچھے ہٹاتے ہوئے آپؐ کی لکڑی اس کے پیٹ میں چبھ گئی۔ اس نے کہا آپ نے مجھے تکلیف دی۔ آپؐ نے فوراً اپنا پیٹ کھول دیا کہ تو بھی لکڑی میرے پیٹ میں چبھو دے۔ اُس نے بڑھ کر آپؐ کا شکمِ مبارک چُوم لیا اور عرض کیا کہ میں یہی چاہتا تھا۔

چوری کے ایک مقدمے میں ایک خاندانی عورت ماخوذ ہوئی۔ سفارش کی گئی کہ اسے سرقہ کی حد سے معاف کر دیا جائے۔ حضورؐ نے جواب دیا تم سے پہلے کی قومیں اس لئے برباد ہوئیں کہ وہ عام لوگوں پر حدیں جاری کرتی تھیں، اور معززین کو معاف کر دیتی تھیں۔ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْاَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ فَعَلَتْ ذٰلِکَ لَقَطَعْتُ یَدَھَا۔ "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ فعل کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے محمد نے ایک مصری کو کوڑے مار دیئے۔ اُس مصری نے مدینے جا کر خلیفہ برحق سے شکایت کر دی تو انھوں نے مصر کے گورنر اور ان کے بیٹے محمد کو فوراً طلب کر لیا۔ اور جب وہ حاضر ہوئے تو مصری کے ہاتھ میں دُرّہ دے کر حکم دیا کہ گورنر کے بیٹے کو اُن کے سامنے مارے۔ پھر جب وہ اپنا بدلہ لے کر دُرّہ حضرت عمرؓ کو واپس دینے لگا تو آپ نے اُس سے کہا "ایک ضرب اِن گورنر صاحب کے بھی لگا۔ خدا کی قسم اِن کا بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا اگر اُسے اپنے باپ کا غرّہ نہ ہوتا۔" مستغیث نے عرض کیا کہ "جس نے مجھے مارا تھا اس سے میں بدلہ لے چکا ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر تو انہیں مارتا تو میں حائل نہ ہوتا۔ تو نے خود ہی انہیں چھوڑ دیا ہے" پھر غضبناک ہو کر حضرت عمروؓ بن عاص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ آیا عَمْرُو مَتٰی تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا "اے عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا" اسلامی حکومت جب اپنی اصلی شان میں قائم تھی تو اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ خود خلیفۂ وقت کے خلاف بھی دعوے کئے جاتے تھے اور اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا اور خلیفہ کو اگر کسی کے خلاف شکایت ہوتی تھی تو وہ اپنے انتظامی اختیارات سے کام لے کر اپنی شکایت خود رفع نہیں کر لیتا تھا بلکہ عدالت سے رجوع کرتا تھا۔

۱۴۔ معصیت سے اجتناب کا حق

اسلام اپنی مملکت میں ہر شہری کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ اسے کسی معصیت (گناہ یا جرم کرنے) کا حکم نہ دیا جائے۔ اور کوئی حکومت یا حاکم یا اُس شخص کا افسرِ بالا اُسے ایسا کوئی حکم دے تو وہ اُس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اُس کا انکار قانونِ اسلامی کی نگاہ میں جرم نہیں ہے بلکہ معصیت کا حکم دینا جرم ہے جس پر خود وہ حاکم ماخوذ ہونے کے قابل ہے جس نے معصیت کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد حدیث میں موجود ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے" اس قاعدے کی رو سے کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا شخص عدالت میں یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ میں نے یہ جرم حاکمِ وقت یا اپنے افسرِ بالا کے حکم سے کیا ہے۔ اگر ایسی کوئی صورت پیش آئے تو جرم کرنے والا اور جرم کا حکم دینے والا، دونوں قابلِ مواخذہ ہوں گے۔ اور اگر اطاعت سے انکار کی بنا پر کوئی حاکم اپنے ماتحت کے خلاف کسی قسم کی ناروا کارروائی کرے تو وہ عدالت سے رجوع کر کے اپنے حقوق کا تحفظ بھی کرا سکتا ہے اور ایسے غلط کار حاکم کو سزا بھی دلوا سکتا ہے۔

۱۵۔ حکومت کے کام میں شرکت کا حق

اسلام کی رو سے دنیا میں انسانی حکومت دراصل خداوندِ عالم کی خلافت ہے اور یہ

خلافت کسی شخص یا خاندان یا طبقے یا جماعت کو نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو عطا کی جاتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ "اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں۔ اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں کہ وہ انہیں زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خلافت اجتماعی ہے جس میں ہر بندۂ مسلم کا حصہ دوسرے کسی مسلمان سے کم ہے نہ زیادہ۔ اس مشترک خلافت کے نظام کو چلانے کے لئے جو عملی صورت قرآن مجید میں تجویز کی گئی ہے وہ ہے۔ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ "مسلمانوں کا کام آپس کے مشورے سے چلتا ہے"۔ اس اصول کے مطابق ہر مسلمان کا یہ حق ہے کہ حکومت کا کام چلانے میں یا تو اُس کا مشورہ براہ راست شریک ہو یا پھر اُس مشورے میں بالواسطہ طریقہ سے اُس کا چُنا ہوا نمائندہ حصہ لے۔ اسلام اس کو قطعاً جائز نہیں رکھتا کہ کوئی شخص، یا اشخاص کا کوئی ٹولہ عامۃ المسلمین کو بے دخل کر کے حکومت کے اختیارات خود سنبھال بیٹھے اور اسلام اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ کوئی حاکم شوریٰ کا محض ڈھونگ رچا کر لالچ، فریب، جبر اور دھاندلیوں سے خود منتخب ہو جائے اور مجلس شوریٰ میں اپنی مرضی کے آدمیوں کو منتخب کرالے۔ یہ خلق ہی کے ساتھ نہیں بلکہ اُس خالق کے ساتھ بھی غداری ہے جس نے مسلمانوں کو خلافت کے اختیارات دیئے ہیں اور ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لئے شوریٰ کا طریقہ مقرر فرمایا ہے شوریٰ کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں کہ:

۱۔ حاکم اور اس کو مشورے دینے والے نمائندے لوگوں کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہوں۔
۲۔ لوگوں کو اور ان کے نمائندوں کو تنقید، اختلاف اور اظہار رائے کی آزادی ہو۔
۳۔ عوام کے سامنے ملک کے حالات بے کم و کاست آئیں تاکہ وہ یہ رائے قائم کر سکیں کہ حکومت ٹھیک کام کر رہی یا نہیں۔ اور۔
۴۔ اس امر کی پوری ضمانت موجود ہو کہ حکومت وہی کرے جسے لوگ پسند کریں، اور وہ شخص منصب اقتدار سے ہٹا دیا جائے جسے لوگ ناپسند کریں۔

خلاصہ کلام: حضرات! یہ ہے ایک مختصر نقشہ ان حقوق کا جو آج سے چودہ[۱۴] سو برس

پہلے اسلام نے انسان کو، برسرِ جنگ لوگوں کو، اور اپنی مملکت کے شہریوں کو دیئے تھے اور جو ہمیشہ کے لئے ہر صاحب ایمان مسلمان کے لئے قانون کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس سے اگر ایک طرف یہ معلوم کر کے ایمان تازہ ہوتا ہے کہ ترقی و روشن خیالی کی مدعی دنیا آج تک ان سے زیادہ منصفانہ "قوانین" نہیں بنا سکی ہے، تو دوسری طرف یہ دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگتی ہے کہ ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جن کے پاس اتنا بلند پایہ قانون موجود ہے اور پھر بھی ہم ہدایت کے لئے اُن رہنماؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کے تصور میں بھی حق اور عدل کی یہ بلندیاں کبھی نہیں آئی ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر رنج یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اسلام کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے حکمراں آج دنیا بھر میں اپنے خدا اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھے ہوئے ہیں۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۷۵ء جلد ۸۴۔ شمارہ ۵)

سانحۂ مسجدِ اقصیٰ[1]

حمد و ثنا کے بعد:

برادرانِ دین! مسجدِ اقصیٰ میں آتش زنی کی دلخراش خبر ہر مسلمان کے قلب و روح پر بجلی بن کے گری ہے اور صرف پاکستان ہی کے مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمان اس پر تڑپ اُٹھے ہیں۔ اس وقت بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ایک طوفان کی طرح اُٹھ رہا ہے کہ آخر اس مصیبت کا علاج کیا ہے؟ یہ ہماری تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ منحوس لمحہ ہماری زندگی میں پیش آیا۔ ستر پچھتر کروڑ مسلمان دُنیا میں موجود ہیں اور پھر بھی یہودیوں کی یہ ہمت ہوئی کہ ہماری تین مقدس ترین مسجدوں میں سے ایک کو آگ لگا دیں۔ اُس مسجد کو پھونک ڈالیں جسے اسلام میں قبلۂ اول ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کی طرف رُخ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے ۱۴ برس تک نماز پڑھی ہے اور جس سے حضورؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے بڑی مصیبت اُمتِ مُسلمہ کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے جس مُسلمان کے دل میں دین کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہے وہ سوچ رہا ہے کہ یہاں تک نوبت پہنچ جانے کے بعد بھی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو دنیا میں اس امت کی کیا آبرو باقی رہ جائے گی اور اس کے بعد ہمیں نہ معلوم اور کیسی ذلتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اس نازک موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس معاملہ کی پُوری نوعیت کو اچھی طرح

---

[1] یہ وہ تقریر ہے جو ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجد اقصیٰ کے سانحہ کے متعلق مرکز جماعت اسلامی میں کارکنانِ جماعت کے ایک اجتماع کے موقع پر کی گئی تھی۔

سمجھ لیں، کیونکہ اسے سمجھے بغیر ہم صحیح طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

اس جُرم کا اصل محرّک ہے۔

اسرائیل نے اس واقعے کے بعد مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی پے در پے کوششیں کی ہیں اور اس کے لیے بڑے اوچھے طریقے اختیار کیے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ بجلی کے تاروں میں خرابی واقع ہونے سے اتفاقاً آگ لگ گئی۔ لیکن پھر خود ہی ان مجرموں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ اتنی بڑی عمارت میں محض بجلی کے تاروں کی خرابی سے ایسی خوفناک آتش زدگی آخر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد نہایت ڈھٹائی اور سخت بے حیائی کے ساتھ یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ عربوں نے خود آگ لگائی ہے۔ اس طرح کے جھوٹ کا ہم کو پہلے ہی کافی تجربہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ کس قماش کے لوگ ایسے جھوٹ گھڑا کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی مدت پہلے اسی لاہور میں ہمارے دفتر پر حملہ کر کے قرآن جلایا گیا اور اُلٹا ہم پر ہی یہ بہتان لگا دیا گیا کہ قرآن انہوں نے خود جلایا ہے۔ جس فلسفے کے تحت یہ جھوٹ گھڑا گیا تھا اس فلسفے کے اصل مصنف یہودی ہی ہیں۔ وہ یہودی دماغ ہی تھا جس نے اخلاق کا یہ اصول تصنیف کیا تھا کہ جس طریقہ سے بھی مقصد برآری ہو سکے وہ برحق ہے۔ یہودیوں کو بہت جلدی یہ محسوس ہو گیا کہ یہ دروغ بے فروغ بھی کارگر نہ ہوگا۔ اب ایک آسٹریلین نوجوان کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس دیوانے نے کسی جنون کے دَورے میں یہ حرکت کر ڈالی ہے ورنہ مسجدِ اقصیٰ کو منہدم کرنے کا کوئی منصوبہ اسرائیل کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس نوجوان پر مقدمہ چلا کر اور اپنے ایک خود ساختہ کمیشن کے ذریعہ سے تحقیقات کرا کے وہ اپنے جُرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کی پوری تاریخ بیان کر دوں جس سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایک بڑا طویل المیعاد منصوبہ ہے جو صدیوں سے چل رہا ہے اور اسی کے تحت یہ کارروائی بطورِ تمہید کی گئی ہے۔

یہودی عزائم کی تاریخ۔

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائیبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اور بائیبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتلِ عام کر کے اس سرزمین پر اُسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سُرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے، اس لیے انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے، بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا، بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور ہیکلِ سلیمانی (Temple of Solomon) کو، جسے دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوندِ خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آکر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کی۔ لیکن یہ دوسرا دور بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔ ۷۰ء میں یہودیوں نے رُومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکلِ سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا، اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ء میں رُومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اخراج کے

بعد جنوبی فلسطین میں بھی اُسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا، بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے قانوناً ممنوع کر رکھا تھا، اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ (۱) یہودی ابتداءً نسل کشی (genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔ (۲) شمالی فلسطین میں صرف چار یا پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔ (۳) جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔ (۴) اور عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انہوں نے کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جا رہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمہیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصد زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارھویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب شریعت یہود (The Code of Jewish law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو از سرِ نو تعمیر

کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (Freemason Movement) یہی ہے جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے، اور اس میں بھی ہیکل سلیمانی کی تعمیرِ نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے۔ اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈرامہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کو تعمیر کرے، اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے پھر انہیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے، ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم وستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے شاندار دَور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوارِ گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس

یادگار سمجھتے ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انہیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیلی حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن (News from Israel) شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم جولائی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوار گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ وہ مسلمانوں کی شرافت اور فیاضی اور حُسنِ سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی۔

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ ان ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل (Herzl) نے ۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک (Zionist Movement) کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لئے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں پھر ۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خاں (سلطان ترکی) کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں، آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ "جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں

ٹھوکتا ہوں۔ جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام تھا حاخام قرہ صوآفندی یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کرنے کا مطالبہ پیش کرے۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ سلطان عبدالحمید خاں کا جواب سُن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دے دی گئی کہ تم اس کا بُرا نتیجہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں جن میں فری میسن، دونمہ[1] اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترکی قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہو کر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیں۔

اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر ان کے پاس گئے تھے اُن میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجنے کو بھی ملا تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات ہی برس پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سُن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم۔

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور شور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑانا تھا اور اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں

---

[1] یہ وہ یہودی تھے جنہوں نے ریاکارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دونمہ کہتے ہیں۔

کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنا اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں۔ حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے بلکہ عرب اور کرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترکی قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عربی قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے، بیروت اس کا مرکز تھا، اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگِ عظیم اوّل اور اعلان بالفور۔

پہلی جنگ عظیم میں ابتداءً یہودیوں نے حکومتِ جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا، کیونکہ جرمنی میں اُس وقت یہودیوں کا اُتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوا دیگا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین (Dr. Weisman) آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دُنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت و قابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آ سکتی ہے اگر آپ ہم کو یہ یقین دلا دیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔ ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودیوں کے قومی وطن

کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کر لیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خودمختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔ پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جا رہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آ رہی تھی۔ اعلان بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری دس فی صدی بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنتِ برطانیہ کا وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن بنایا جائے جو دنیا بھر میں ۱۹ سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمہیں موقع دیں گے کہ عربوں کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے اُس سے تم اُنہی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لا کر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے:

"ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے اُن سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اُس قدیم سرزمین میں اِس وقت آباد ہیں۔"

بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات

(Documents of British Policy) کی جلد دوم میں ثبت ہیں۔

مجلسِ اقوام کی کارگزاری۔

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں مجلسِ اقوام (League of Nations) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں، برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں بلکہ محض صہیونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلسِ اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے انتداب[1] (Mandate) میں دے دیا جائے۔ اس موقع پر فلسطین میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی اس میں مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۷۱۴۶۴ اور یہودی ۸۲۷۹۰ تھے۔ اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جاکر آباد ہو رہے تھے[2]۔ اس پر بھی مجلسِ اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے، صہیونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کرکے اسے نظم و نسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (Civil) حقوق کا تحفظ کیا جائے، سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ تھا اس مجلسِ اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام

---

[1] انتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطور خود کسی ملک کی فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ مجلسِ اقوام کی طرف سے اس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرمانروائی کرے۔

[2] ۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

زیر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا اور ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسِ اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی انتداب کا کارنامہ۔

یہ انتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئیل خود ایک یہودی تھا۔ صیہونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کئے گئے بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے، سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیئے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ سے باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید براں اُن کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔ ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نوآبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دے دیئے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیئے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو ۸ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو ۵۰ ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس ۳ پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۴ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی

تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صیہونیت کی خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صیہونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا، اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ انگریزی انتداب کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکان کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" بنانے کے بجائے فلسطین میں ان کی "قومی ریاست" قائم کر دیں۔

"قومی وطن" سے "قومی ریاست" تک۔

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوامِ متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلسِ اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صیہونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اُس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین اقوامِ متحدہ انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں [illegible]ن و انصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی، اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے

درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ جو اکس طرح ؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیوشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکہ نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائیٹی، فلپائن اور لائبیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے، اور جیمز فوریسٹال (Forrestal) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (Scandal) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے"۔

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فی صدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو، اور ۴۵ فی صدی رقبہ ۶۷ فی صدی عرب آبادی کو دیا گیا، حالانکہ اُس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صدی حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے، آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (A Study of History) میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی اُن مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کے قتلِ عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اُتارا گیا، عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے

نکل جاؤ۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس میں رتی برابر بھی شرافت و انسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران میں ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر پھر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا، اور سب سے پہلے امریکہ اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا، حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۴لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے، اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ لیکن یہودی اس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۴۸ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اس وقت فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر کے دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے، اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلواکیا سے آئے تھے جو آج خود ظلم و ستم کا شکار ہے۔ اقوام متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ۔

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۶۷ء کی جنگ میں بیت المقدس اور پورے باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحدِ شام کی بالائی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل کو پہنچا۔ نومبر ۴۹ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہوگیا اور ۱۴ - ۱۵ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکہ اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا۔ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید و حمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۵۵ء تک اعلانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ۵۵ء میں جب عرب ممالک اس بات سے بالکل مایوس ہوگئے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انہیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انہیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے اور ان کو اپنے دائرۂ اثر میں لانے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہوسکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجاتے البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن تک اور الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہوگیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے اُلجھ کر رہ گئے۔

۱۹ برس کی اس مدت میں امریکہ نے اسرائیل کو ایک ارب ۔ ۴ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا۔ اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زفرق تا بقدم اس قدر مسلح کردیا گیا کہ جون ۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین

کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف چار پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو ہیبٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۴۷ء سے ۵۷ء تک اقوام متحدہ کے ۲۸ ریزولیوشن وہ اُٹھا کے رکھ چکا تھا۔ ستمبر ۴۸ء سے نومبر ۶۸ء تک ۷ مرتبہ اقوام متحدہ نے اس کے خلاف مذمت کی قرارداد پاس کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جون ۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اُس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ "اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہ نکلیں گے۔" یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر پہ مارتا ہے اور اقوام متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکہ کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اُس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۶۷ء کی جنگ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جائنٹ چیفس آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلمس (Helms) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر "وحی"[1] نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع

---

[1] اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر "وحی" کیا کرتے ہیں۔

آگیا ہے۔ اس پر بھی امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے ساحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹ میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد لندن سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (The Holy War June 1967) اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے اس کا عنوان رکھا گیا ہے (Back After 896 Years یعنی "۸۹۶ برس کے بعد واپسی"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال بھی یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۶۵ء میں ہم کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا! عربوں کے ساتھ روس کے رویے پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ "ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے"۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہوگیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین جزیرہ نمائے سینا سمیت ان کے ہاتھ آگیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ۔

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ ۹۰ سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کر رہے تھے یہاں تک کہ اب

اس منصوبے کے اہم ترین اجزاء دو ہیں ۔ ایک یہ کہ مسجدِ اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی ۔ دوسرے یہ کہ اُس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزاء کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے ۔

جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اُسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کر رہا ہے ۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکہ کو دنیائے اسلام کے شدید ردِ عمل کا اندیشہ ہے ۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے ۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیرِ نو مسیح ہی آ کر کرے گا، جب تک وہ نہ آ جائے ہمیں انتظار کرنا چاہیئے[1] ۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے ۔ دوسرا گروہ جو جدت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دورِ مسیحائی (Messianic Era) میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربّی[2] نے توراۃ ہاتھ میں لے کر اُس روز کہی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ "آج ہم ملتِ یہود کے لیے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں۔" انہی دو وجوہ سے مسجدِ اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر

---

[1] واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح موعود (Promised Messiah) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں ۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجال قرار دیا ہے ۔

[2] جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربّی ہوتے ہیں، اس چیف ربّی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈیر جنرل کا رینک حاصل ہے ۔

اس کو آگ لگائی گئی ۔ ہے تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جُز اس منصوبے کا یہ ہے کہ" میراث کے ملک" پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

"اے اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ملک پر قبضہ کرنے کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رُو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پُورا اُردن، پُورا شام، پُورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ٹرکی کا جنوبی علاقہ، اور جگر تھام کر سُنیے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدا نخواستہ دنیائے اسلام کا ردِعمل بھی مسجدِ اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکا، تو پھر خاکم بدہن ایک دن ہمیں وہ بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پُورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں گے۔

پس چہ باید کرد؟

حضرات، اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیشِ نظر مسئلے کی پُوری نوعیت نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں:

اوّل یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور اُن کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکہ کی پُشت پناہی جب تک

اسے حاصل ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوام متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی جارحانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجد اقصیٰ، بلکہ مدینۂ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقامات مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کر دینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مسجد اقصیٰ کے سانحہ سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صیہونیت کی عظیم بین الاقوامی سازش کا مقابلہ، جبکہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید و حمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ۴۰ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ۷۰-۷۵ کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں، اور ان کی ۳۰-۳۲ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے

کو حل کر لینا، انشاءاللہ کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجدِ اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لئے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں انہیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ایک کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے۔ اور عالمِ اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے جس میں ملک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ اور باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور پھر قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکہ، جو اپنا ضمیر

یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر، اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آگیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو روئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اس کے لیے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھی جذبۂ خیر سگالی باقی رہ جائے۔ اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔

ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۶۹ء

تزکیۂ نفس

(۱)

جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اصل اہمیّت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر ہر فردِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے شخصیت عطا کی ہے، خودی کا احساس دیا ہے، انفرادی خصوصیات بخشی ہیں، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں، سُننے کے لیے کان دیے ہیں، سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے دل دیا ہے، خواہش، تمیز، ارادے اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، اور اپنی ملکیت میں بہت سی چیزیں امانۃً اُس کے سپرد کر کے اُن پر تصرف کے اختیارات اسے عطا کیے ہیں۔ اِس بنا پر ایک ایک انسان فرداً فرداً اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن بار بار دُہراتا ہے۔

کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ۔ کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ۔

یہ سب اِسی حقیقت کے اعلانات ہیں اور اِسی کو اِس مشہور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ پھر اِسی بات کو قرآن آخرت کے ذکر میں بکثرت بیان کرتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ایک ایک انسان انفرادی حیثیت سے اپنا حساب دے گا اور جو کوئی بُرائی یا بھلائی اس نے دنیا کی زندگی میں کمائی تھی، اُس کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے اُسی طرح نتیجہ اور انجام بھی

آخر کار انفرادی ہی ہے۔ اور اس نتیجہ اور انجام کے خوب یا زشت ہوتے اور خوبی و زشتی کے مختلف مدارج میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اُس نے دنیا کی زندگی میں کس قسم کی شخصیت اپنے اندر پرورش کی، کن صفات کا اکتساب کیا، کس طرح اُن قوتوں سے کام لیا جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی تھیں، کس طرح اُس امانت میں اپنے اختیارات استعمال کیے جو اللہ نے اُسے سونپی تھی، اور اپنی تکمیل کے لیے اُن ذرائع سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے۔

پس یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے، حقوق اور فرائض فرد پر عاید کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت پر جزا کی اُمید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ واحد اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجۂ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُسی کی عقل اور جذبات سے یہ نظامِ فکر اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اُسی کی فلاح کا طالب ہے، اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اُس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اُس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا، بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اُس نے اپنی تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کے اُن مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اُسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اُس کمال کو پہنچ جائے جس کو وہ پہنچ سکتا تھا، اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشوونما دے جتنا وہ دے سکتا تھا، تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی فلاح و نجات میں مانع نہیں

ہو سکتا۔ بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہوگی کہ اُس نے ناموافق حالات میں بھی ترقی کے لیے اتنی کامیاب جدوجہد کی۔ یہی معنی اس آیت کے ہیں جو سُورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔

اور اس کے عکس کی صحت پر خود اسی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ لَا يَنفَعُكُم مَّنِ اهْتَدَىٰ إِذَا ضَلَلْتُمْ۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی صلاح اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فی الواقع اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مطلوب ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام ہی کی بہتری پر منحصر ہے

اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو فرد فرد کی صورت میں پیدا تو ضرور کیا ہے مگر فرد فرد کی صورت میں رکھا نہیں ہے۔ ہر شخص اُس اجتماعی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان واقع ہوا تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اجتماعی زندگی کے بہت سے وہ ثمرات جو اس کی ماں اور اُس کے باپ نے اپنے اندر جذب کیے تھے، موروثی صفات و خصائص کی صورت میں اُس کے اندر پیوست ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اس کی شخصیت کے نشوونما پر اچھا خاصا اثر ڈالتے ہیں۔ ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی وہ ایک جماعت کے درمیان آنکھ کھولتا ہے اور اجتماعی زندگی اس ساعت سے لے کر موت کی گھڑی تک پیہم اُس پر اثر ڈالتی اور اُس سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ اگر اجتماعی ماحول کسی غلط نظام پر قائم ہو، اُس کی آب و ہوا صلاح کے بجائے فساد کو پرورش کرنے والی ہو، اُس کی زمین خیر کے بجائے شر کے لیے سازگار ہو تو ان حالات میں اکثر و بیشتر افراد کی تکمیلِ ذات دشوار بلکہ محال ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات اس ماحول میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ایک جلیل القدر پیغمبر پکار اُٹھتا ہے کہ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا

کَفَّارًا ۔

اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ جماعت کو درست اور اجتماعی نظام کو پاک کیا جائے تاکہ بیشتر انسانی افراد کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو جس میں اُن کی شخصیتیں صحیح نشو و نما پا سکیں۔ حرام کی روٹی، جس سے پرورش پائے ہوئے گوشت پوست کے لیے جنت حرام ہے اور جس کے حق میں نبیؐ صادق و مصدق نے خبر دی ہے کہ آتش دوزخ ہی اس کے لیے اولیٰ ہے، آخر کوئی فرد اُس سے کیونکر بچے اور رزقِ حلال کہاں پائے جب کہ ایک غلط نظامِ معیشت نے رزق کے سارے چشموں کو گندہ کر دیا ہو؟ جاہلیت کے اخلاق، افکار، اور اعمال، جو انسان کے لیے ابدی خُسران کے موجب ہیں آخر کوئی شخص اُن سے کس طرح محفوظ رہے جبکہ تمدن، معاشرت، تعلیم، سب پر جاہلیت پورے زور کے ساتھ چھائی ہوئی ہو اور اس کا زہر وبائی سمیت کی طرح سارے اجتماعی ماحول میں سرایت کر گیا ہو؟ معصیت خُدا اور رسول، جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقار کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کوئی شخص اُس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظامِ سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے۔ اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے اُن موانع کو دُور نہ کیا جائے جو ایک بگڑی ہوئی جماعت اور ایک فاسد نظامِ اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اُس کی تکمیل اور ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے۔ نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے، اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خُسران کا مدار ہے، کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں

واقع ہے۔ اُس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے شمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا کسی کا بھائی، کسی کا شوہر کسی کا باپ کسی کا دوست کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا اجیر کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم کسی کا بائع، کسی کا مشتری کسی کا امین کسی کا موتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان تعلقات میں بندھ کر ان ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لدکر، خوف اور لالچ، محبت اور غضب، اُمیدوں اور مایوسیوں کے اس ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اُس منصب سے عہدہ برآ ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کن صفات کا اکتساب کرتا ہے۔ کن خصوصیات کو اپنے اندر نشو و نما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے۔ وہ ہر معنی سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر لیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں اُس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ جس نے خلوت میں رہبانیت کی زندگی گزاری اُس نے اپنے امتحان کے اکثر و بیشتر پرچے سادہ اوراق کی صورت میں بھیج دیئے ہیں جن پر وہ سرے سے کوئی نمبر پانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ فرد کی تکمیلِ ذات اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیشتر اور بزرگ تر احکام سرے سے تشنۂ تعمیل رہ جاتے ہیں۔ اگر انسانی اجتماع کی زمام کار اہل خیر کے ہاتھ میں نہ ہو۔ تمدن اور سیاست اور معیشت کی عنانِ اقتدار پر خدا کے باغیوں کا قبضہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی شریعت معطل رہے، اس کی زمین میں صلاح کے بجائے فساد پھیلے، اس کی خلق میں امر بالمعروف کی جگہ امر بالمنکر ہو اور نہی عن المنکر کے بجائے

نہی عن المعروف ہونے لگے۔ یہ وہ حالت ہے جس سے بڑھ کر اللہ کو مبغوض کرنے کی کوئی چیز نہیں۔ اور کسی شخص کا اس حالت میں رہتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ وہ خلوت کے مراقبوں اور ریاضتوں سے، یا نیکی اور تقویٰ کے چند مظاہر سے، یا اُن احکام کی تبلیغ سے جو کفار کے لیے نامرغوب نہ ہوں، اپنی ذات کی تکمیل کرسکے گا محض ایک خام خیالی ہے۔ اِن حالات میں تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فرمانروائی کے مقام سے خدا کے باغیوں کو ہٹانے کی کوشش کی جائے اور سعی و جہد کی ساری قوتیں اس مقصد میں صرف کردی جائیں کہ خدا کے ملک میں اُسکی شریعت جاری ہو، اس کی زمین فساد سے پاک ہو کر خیر و صلاح سے بھر جائے، اور اس کی خلق میں حکم معروف کا چلے اور منکر ضابطۂ تعزیرات میں جگہ پائے۔

اِس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت اور اجتماعی زندگی کی اسلام میں کتنی بڑی اہمیت ہے، لیکن اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل اہمیت فرد ہی کو حاصل ہے، کیونکہ اجتماعی صلاح کا قیام اور اجتماعی فساد کی بیخ کنی افراد ہی کی فلاح و ترقی کے لیے مطلوب ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ تمام نظاماتِ فکر و عمل سے بڑھ کر اسلام انفرادی اصلاح و تزکیہ کو اہمیت دیتا ہے۔ اِس کا نقطۂ نظر اُن نظامات سے بھی مختلف ہے جو جماعت سے قطع نظر کر کے فرد کو مجرد ہونے کی حیثیت سے لیتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اُس کو روحانی ارتقاء کے مدارج طے کرانا چاہتے ہیں اور اُن نظامات سے بھی مختلف جو فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اُس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دیتے ہیں اور افراد کو صرف اس لیے تیار کرنا چاہتے ہیں کہ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول میں اُن کی تربیت یافتہ قوتوں کو استعمال کرتا ہے۔ اِن دونوں نقطہ ہائے نظر سے الگ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے اس لیے ہر ایک فرد کو فرداً فرداً خدا کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیار

ہونا چاہیے، مگر چونکہ خدا کے سامنے اس کی جواب دہی بہت بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے، اور آخری امتحان کی کامیابی کے لیے اس کا تیار ہونا بجائے خود بھی اجتماعی صلاح و فلاح پر منحصر ہے، اور خدا کی رضا حاصل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی حدِ استطاعت میں فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین اور اس کی خلق پر جاری کرنے کا وہ فرض انجام نہ دے جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے، لہٰذا فرد کی تیاری محض اپنی ذاتی اصلاح ہی کی حد تک نہ ہونی چاہیے بلکہ اس درجہ کی ہونی چاہیے ——— کہ وہ غیر صالح اجتماعی نظاموں سے لڑ سکے اور ایک صالح اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کا بل بوتا اس میں پیدا ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے افراد کے تزکیۂ نفس اور تعمیرِ سیرت کے لیے وہ نقشہ بنایا ہے جو تمام دوسرے نقشوں سے اپنے مقصد میں بلند تر، اپنے نقطۂ نظر میں وسیع تر اور اپنی جزرسی میں باریک تر ہے۔ اگر مختصر اور جامع الفاظ میں کوئی اس نقشے کی تعریف کرنا چاہے تو غالباً سب سے زیادہ موزوں تعریف یہ ہو گی کہ "اسلام کے پیشِ نظر ایسے انسان تیار کرنا ہے جو متخلق باخلاقِ اللہ ہوں، صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ بن کر زمین میں کام کریں اور اس کام کے صلہ میں اللہ کے تقرب سے سرفراز ہوں۔"

مگر صدیوں کے انحطاط سے مسلمانوں کے اندر جہاں اور بہت سے تغیرات ہوئے ہیں، تزکیۂ نفس کے باب میں بھی ان کا تصور اصل اسلامی تصور سے بہت کچھ مختلف ہو گیا ہے۔ ان کے مقاصد میں بھی تغیر آ گیا ہے، نقطۂ نظر بھی محدود ہو گیا ہے اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی ان طریقوں سے مختلف ہو گئے ہیں جو عہدِ نبوت میں اختیار کیے گئے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں، اور ان کی برکت سے بڑی بڑی پاکیزہ شخصیتوں کے انسان بھی پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن اس پیمانے کے انسان ابھی تک تیار نہ ہو سکے جو جاہلیت کی راہوں پر دنیا کو چلانے والی بردست قوتوں کے مقابلہ میں اٹھیں اور ان سے زور آزمائی کر کے اسلام کو دنیا کا راہنما و کارفرما

دین بنانے کی کوشش کریں۔ اور یہ نو خیر بہت بڑا کام ہے۔ یہاں تو ایسے انسان بھی فراہم نہ ہو سکے جو کم از کم اتنا ہی کر سکتے کہ اسلام کے دائرہ نفوذ واثر میں جاہلیت کی فاتحانہ پیش قدمی کو روک دیتے۔ بڑے بڑے نفوسِ زکیہ موجود تھے اور موجود ہیں جو اپنے علم، اپنی دیانت، اپنی پرہیزگاری اور اپنی پاکیزہ زندگی کے لیے یقیناً خراجِ تحسین کے مستحق ہیں لیکن ان نفوس کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم وفنون سے اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور کرتی چلی جا رہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا کوئی سبب تو ضرور ہے اور جو سبب بھی ہے اس کی تحقیق میں بے جا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اس زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہو جائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کر کے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصد ہے لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی کوشش اس راہ میں صرف کریں بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطورِ خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہر مقصود اس زندگی میں نبی کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ ۔ (یعنی حقائقِ غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ بجز اس رسول کے جس کو اس نے خود منتخب کیا ہو۔ پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے) اس سے معلوم ہوا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں، یا بالفاظِ دیگر مابعد الطبیعی حقیقتوں کے مشاہدے کی کوشش فضول بھی ہے، غلط بھی اور اس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ انسان کو ان حقائق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ

سے دے دیا ہے اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اُس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا - اب انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انہیں اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں لگا رہے - لیکن اگر اس پر بھی کوئی شخص خواہ مخواہ یہ زحمت اُٹھانا ہی چاہے تو اُس کی حیثیت خدا کے بُلائے ہوئے مہمان کی نہ ہو گی کہ اُس کے لیے دروازے کھولے جائیں اور پردے اُٹھائے جائیں، بلکہ اُس کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہو گی جو روزن بنا کر اندر جھانکنا چاہتا ہو - سو اللہ کے حرم میں اس نقب زنی کی کوشش ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتی - اگر بالفرض کوئی اُس حرم کی سرحد سے قریب پہنچ بھی گیا تو رسولوں کے لیے حفاظت و نگہبانی کا جو غیر معمولی انتظام کیا جاتا ہے اُس سے تو وہ بہر حال محروم ہی ہو گا - اس لیے دُور سے جو تھوڑی بہت حقیقت کی جھلک وہ دیکھے گا اُس میں نفس کی غلط فہمیوں، نظر کے دھوکوں اور شیاطین کی دراندازیوں کے بے شمار خطرات ہوں گے، جس کی بدولت عجب نہیں کہ ایمان بالشہادت کی نعمت پانے کی کوشش کرتے کرتے ایمان بالغیب کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

اس سے فروتر تزکیۂ نفس کا جو مقصد بتایا جاتا ہے وہ روحانی ترقی ہے - مگر یہ "روحانی ترقی" کچھ ایسی مبہم اور پُر اسرار چیز ہے کہ تمام عُمر اس بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا - اس کی اصطلاحیں، اس کی منزلیں، اس کے ثمرات و نتائج، سب مرموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے - ہمیں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صُہیبؓ نے طے کیا تھا، اور نہ کبھی وہ منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد اُن لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حاصل چاہتے ہیں - لیکن یہاں ایک دوسری مُصیبت پیش آ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے - بیشتر

اصحاب کے نزدیک تو تقویٰ سے مراد محض لباس، وضع قطع، نشست و برخاست، اکل و شرب وغیرہ امور کے متعلق اُس ظاہری نقشہ پر اپنی زندگی کو ڈھال لینا ہے جس کے جزئیات احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ نیز چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادات کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقویٰ کی اس ظاہری شکل کو اختیار کر لیا ہے انہیں مُتّقی کہا جاتا سمجھا جاتا ہے اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اندر تقویٰ پیدا کر لیا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت رُوحِ تقویٰ کی ان میں بہت کمی ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات عملی زندگی کی آزمائشوں میں ایسی ایسی غیر متقیانہ حرکات ان سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کی بدولت تقویٰ کی اس ظاہری شکل کا بھرم بھی جاتا رہتا ہے۔ اس عام تصوّر سے بلند تر اور وسیع تر تصورِ تقویٰ جو خواص میں پایا جاتا ہے وہ بھی اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ انفرادی زندگی میں آدمی خُدا ترس، عبادت گزار اور ذاکر و شاکر رہے، معاملات میں دیانت، امانت، راستبازی اور حدود اللہ کا پابند ہو، اور دوسرے افراد کے ساتھ معاشرت میں خوش اخلاقی، ہمدردی مواساۃ، اِنصاف اور حق رسانی کے طریقہ پر عامل رہے۔ اِس محدود تصور میں وسیع تر اِجتماعی مسائل کے فہم و اِدراک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اِس لیے ہمارے بہترین صلحاء کے ہاں بھی جو تزکیہ نفس کیا جاتا ہے اس کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ خدا کی باغی حکومتوں کو پرہیز گار رعیت اور متدین ملازم بہم پہنچ جائیں۔ خود ان حکومتوں کی تعلیم و تربیت جیسی رعایا اور جیسے ملازم فراہم کرتی ہے ان میں اور تو سب قابلیتیں ہوتی ہیں مگر ایمان داری اور راست بازی نہیں ہوتی۔ اِس لیے وہ اُن کا اچھا خاصا نقصان بھی کر دیتے ہیں۔ یہ کمی ہمارے تزکیہ نفس کے اداروں سے پوری ہوتی ہے۔ جو غلبہ کفر کے لیے لڑنے اور نظامِ کفر کو چلانے کے لیے راستباز آدمی تیار کرتے ہیں اور کُفر کی حکمرانی کے لیے وہ رعیت پیدا کرتے ہیں جو اس کے لیے کم سے کم موجب پریشانی ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص کُھلم کھلا کسی غیر الٰہی نظام کے قیام میں جان لڑاتا ہو تب بھی وہ جُوں کا توں مُتّقی رہتا ہے، بشرطیکہ اس کی زندگی میں تقویٰ

سے وہ جزئیات پائے جاتے ہوں جن کا اُوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ سب لازمی نتائج ہیں اُس محدود تصور کے جو ہمارے مذہبی طبقوں میں تقویٰ اور تزکیۂ نفس کے متعلق خواص سے لے کر عوام تک پھیلا ہُوا ہے۔

(۷)

قاعدے کی بات ہے کہ انسان تیاری اُس مقصد کی مناسبت ہی سے کرتا ہے جو اُس کے پیشِ نظر ہو۔ تیاری بجائے خود کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وُہ ہمیشہ کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ مقصد کی نوعیت ہی اُس کی نوعیت متعین کرتی ہے، مقصد کی وسعت یا محدودیت کے لحاظ سے اس کا پیمانہ وسیع یا محدود ہوتا ہے، اور مقصد ہی کا مزاج تیاری کے ممکن طریقوں میں سے مناسب تر طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔ بسا اوقات مختلف مقاصد کے لیے بڑی حد تک ایک ہی طرح کی تیاریاں کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر مقصد کے لیے وہ ناگزیر ہوتی ہیں۔ لیکن اِس ظاہری مماثلت کے اندر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ مختلف مقاصد کی ملتی جلتی تیاریوں میں بھی ہر مقصد کی روح اپنی جُداگانہ شان کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے اور ابتدائی مراحل سے گزر کر تکمیلی مراحل جتنے جتنے قریب آتے جاتے ہیں، ان تیاریوں کے راستے بالکل ایک دوسرے سے الگ اور دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر دیکھیے، اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے۔ آپ خواہ کسی غرض سے اسلحہ بنائیں، بہرحال صنعت کے چند طریقے آپ کو وہی اختیار کرنے ہوں گے جو کسی دوسری غرض کے لیے اسلحہ بنانے والا اختیار کرے گا۔ لیکن ابتدا ہی سے وہ مقصد جس کے لیے آپ اسلحہ بنا رہے ہیں، آپ کی اس تیاری کے پیمانے اور اس کی نوعیت اور اس کے مناہج کو ان دوسرے لوگوں کی تیاریوں سے مختلف کردے گا جو دوسرے مقاصد کے لیئے کام کر رہے ہیں۔ فرض کیجیئے، آپ صرف ایک فنِ لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت سے خوبصورت اسلحہ تیار کرنا چاہتے ہیں، جس سے آپ کا مقصد محض اپنے ادراکی

ذہنیت رکھنے والوں کے ذوقِ جمال کو تسکین دینا ہے۔ ایک دوسرا شخص پیشہ ور اسلحہ ساز ہے۔ اور ایک تیسرا شخص اس لیے اسلحہ بناتا ہے کہ اسے ایک فوج تیار کرنی ہے۔ اور ان جنگی ہتھیاروں سے خود اپنا جنگی مقصد حاصل کرنا ہے۔ ان تین مختلف مقاصد کے لیے آپ اور وہ دونوں اسلحہ سازی کے بہت سے مشترک طریقے اختیار کریں گے۔ لیکن تینوں کے مقاصد کا اختلاف پہلے قدم ہی سے تینوں کی راہیں الگ کر دے گا۔ اور تکمیلی مراحل کی طرف جتنا جتنا قدم بڑھے گا یہ راہیں ایک دوسرے سے بعید اور بعید تر ہوتی چلی جائیں گی۔

فنِ لطیف ہونے کی حیثیت سے آپ جو اسلحہ سازی کریں گے اُس میں آپ کے لیے نفیس نفیس تلواریں اور بندوقیں بنانا بجائے خود مقصود ہوگا کسی دوسرے مقصد کے لیے ان کو آلہ و ذریعہ بنانے کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ آپ کی نگاہ میں اصل اہمیت اسلحہ کی نفاست، خوشنمائی اور ستھرائی کی ہوگی۔ خواہ وہ کارزار میں اپنی کاٹ اور مار کے اعتبار سے بالکل ناقص ہی کیوں نہ ثابت ہوں۔ آپ اسلحہ سازی کے طریقوں میں سے اختیار صرف انہی طریقوں کو کریں گے جن سے لطیف ترین، نازک ترین، حسین ترین ہتھیار بن سکیں اور عجائب دکھا کر ہر صاحبِ ذوق سے دادِ تحسین لیں۔ اُن طریقوں کی طرف تو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی آپ کو گوارا نہ ہوگا جن سے بھاری بھرکم ہولناک اور بھیانک قلعہ شکن ہتھیار اور میدان مار اسلحہ بنا کرتے ہیں۔ آپ کی تلواریں اس لیے نہ ہوں گی کہ صفوں کو اُلٹ دیں بلکہ اس لیے ہوں گی کہ ہوا میں ریشمی رومال کاٹ دیں۔ آپ آتش بار اسلحہ آتش باری کے لیے نہیں بلکہ آتش بازی کے لیے بنائیں گے۔ آپ کی توپ اس لیے نہ ہوگی کہ میدان جیتے بلکہ اس لیے ہوگی کہ اس کا گولہ آسمان پر جا کر پھٹے اور رنگ برنگ کے پھول برسائے پھر آپ کے اس کارخانے کی کشش بھی اُن خریداروں کو نہ کھینچے گی جنہیں لڑنے کے لیے ہتھیار درکار ہیں بلکہ کھینچے گی اُن خوش ذوق لوگوں کو جو لڑائی بھڑائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، محض آپ کی طرح آرٹ کے دلدادہ ہیں۔ وہ آپ کے بنائے ہوئے اسلحہ ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور انہیں خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر اپنے کمرہ کی زینت

بنائیں گے۔ بہت سے بہت اگر کوئی کام انہوں نے ان ہتھیاروں سے لیا بھی تو بس یہ کہ کچھ نشانہ بازی کی مشق کرلی، کچھ تلوار کے ہاتھ صاف کر لیے، کبھی کوئی جانور مار لیا اور کبھی تماشائیوں کے مجمع میں سپہ گری کے کمالات دکھا کر خراجِ تحسین وصول کر لیا۔

رہا پیشہ ور اسلحہ ساز تو وہ اچھے سے اچھا اسلحہ بنا کر سرِ بازار رکھ دے گا کہ جس کا جی چاہے قیمت دے اور خرید لے جائے۔ اس کی تلوار اُس کے اپنے کام کی نہ ہوگی، خریدار کے کام کی ہوگی۔ وہ اس پہ باڑھ نہ رکھے گا اور خریدار اُس کی کاٹ سے فائدہ اُٹھائے گا۔ ہر قسم کے خریداروں کی ضروریات کے لیے اُس کے کارخانے میں ہر قسم کے ہتھیار ملیں گے۔ شکاری شکار کے لیے، ڈاکو ڈاکہ زنی کے لیے، جہانگیر کشور کشائی کے لیے، مجاہد راہِ خدا میں جہاد کے لیے، غرض ہر ایک اپنے مقصد کے لیے وہاں سے ہتھیار پائے گا۔ وہ خود کسی مقصدِ خاص کا خادم نہ ہوگا بلکہ مقاصد دوسروں کے ہوں گے اور وہ سب کا یکساں خادم ہوگا۔ اِس بے مقصد اسلحہ سازی کا اثر لازماً صنعتِ اسلحہ کے طریقوں پر بھی پڑے گا۔ فن کے معلوم و معروف طریقے تو پوری مہارت کے ساتھ اس کارخانے میں استعمال کیے جائیں گے، لیکن کارزار میں کام آنے کے لیے اسلحہ میں جن عملی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے انہیں پیدا کرنے کا طریقہ اس پیشہ ور فن کار کو سرے سے معلوم ہی نہ ہوگا۔ اس کا حال وہی ہوگا جو پہلی جنگِ عظیم میں امریکہ کے اسلحہ ساز کارخانوں کا تھا کہ بازار کے چلتے ہوئے اسلحہ تو وہ خوب بنا سکتے تھے مگر کارزار کے عملی تجربوں سے جنگ آزما قوموں نے اسلحہ سازی میں جو کمالات پیدا کیے تھے ان کی ہوا تک اِن پیشہ ور اسلحہ سازوں کے مال کو نہ لگی تھی۔ جیسا کہ مسٹر لائیڈ جارج نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے، امریکہ کے اسلحہ اپنی چمک دمک اور شان و نفاست سے نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے مگر میدان کی امتحان گاہ میں ناکام ثابت ہوتے تھے۔

بخلاف اِس کے جو شخص اسلحہ اِس لیے بناتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر ایک جنگی مقصد ہے جس کے لیے وہ اپنی فوج کو اپنے ہی ہتھیاروں سے مسلح کرنا چاہتا ہے، اس کا معاملہ آپ سے آپ اُس پیشہ ور اسلحہ ساز کے معاملہ سے قطعاً مختلف ہوگا۔ ڈھلائی اور صیقل گری

اور آتش کاری کے ابتدائی اصول اس کے ہاں بھی وہی ہوں گے جو آرٹسٹ اور پیشہ ور کے ہاں ہوں گے، مگر ان کا استعمال اس کے ہاں بالکل مختلف طور پر ہوگا۔ اس کو اسلحہ کی نفاست و خوشنمائی کی اتنی پروا نہ ہوگی جتنی ان کی کاٹ اور مار کی ہوگی۔ کوئی ہتھیار چاہے کتنا ہی خوشنما ہو، اگر میدان کی آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو وہ اس کے کسی کام کا نہ ہوگا۔ البتہ بھونڈے سے بھونڈا ہتھیار بھی جو اس آزمائش میں پورا اتر سکے اُس کی نظر میں نہایت پسندیدہ ٹھہرے گا۔ اُسے مظہر العجائب ہتھیاروں کی حاجت نہ ہوگی، بس کارگر ہتھیار مطلوب ہوں گے۔ اُسے وہ توپ درکار ہوگی جس کا گولہ قلعوں کو پاش پاش کر دے چاہے اس سے پھول ایک بھی نہ جھڑے۔ اس کو وہ تلوار مرغوب ہوگی جو دشمن کے اندر دوش تا کمر اُتر جائے چاہے چمک کا نام بھی اس میں نہ ہو۔ اور ہوا کے رومال کا ایک تار بھی وہ نہ کاٹ سکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر ستھرائی اور نفاست و خوشنمائی بھی ہو تو کیا کہنے، لیکن مقابلۃً وہ کارگر مگر بھونڈے ہتھیار کو حسین ترین مگر کند ہتھیار پر ہزار درجے ترجیح دے گا۔ پھر وہ صناعتِ اسلحہ سازی کے معلوم و متعارف طریقوں کا غلام بھی نہ ہوگا، بلکہ میدان کے تجربوں پر انہیں پرکھے گا اور ان تجربات کی روشنی میں اصولِ صناعت کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقوں سے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا، خواہ وہ فن کے مروجہ طریقوں کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر اس کا مقصد ہی یہ متعین کرے گا، کہ صناعتِ اسلحہ سازی کے اصول پر جن اقسام کے ہتھیار بننے ممکن ہیں، ان میں سے وہ کس قسم کے ہتھیار بنائے اور کس قسم کے نہ بنائے۔ بہت سے وہ ہتھیار جو فنِ لطیف کی اغراض کے لیے یا پیشہ ور کی دوکان کے لیے عین مطلوب ہیں اسرے سے اس کے کارخانہ کی اسکیم میں جگہ ہی نہ پائیں گے، اور بہت سے ان ہتھیاروں کو اس کے ہاں سرِ فہرست جگہ ملے گی جنہیں بنانے کی ضرورت نہ فن کار محسوس کرتا ہے نہ پیشہ ور۔ پھر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کا تصور تک نہ کر سکے گا کہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیار —— اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے۔ فن کار اپنے فن میں مگن ہوتا ہے۔ اس کا کسی کارزار سے تعلق ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کا دوست یا دشمن ہو۔ پیشہ ور ہر خریدار کا نیازمند ہوتا ہے، اس کو

اس سے کیا بحث کہ خرید نے والے اس کا بنایا مال کس غرض سے خرید رہے ہیں۔ مگر یہ جنگ آزما اسلحہ ساز تو میدان میں دوست بھی رکھتا ہے اور دشمن بھی۔ اُس کے لیے تو ناممکن ہے کہ اپنا ایک تیر بھی دشمن کے ترکش میں جاتا دیکھ سکے۔ جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا کارخانہ دشمن کے ہاتھ پڑ کر اُس کے لیے اسلحہ بنائے گا تو یہ اُسے خود اپنے ہاتھ سے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیتا ہے اور اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں نے برسوں کی محنت اور اربوں روپے کے صرف سے یہ کارخانہ بنایا تھا۔

جس طرح اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے اُسی طرح تزکیۂ نفس بھی ایک قسم کی تیاری ہی ہے۔ تزکیہ کے دو معنے ہیں۔ پاک صاف کرنا اور نشوونما دینا۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے تزکیۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو غیر مطلوب صفات سے پاک کیا جائے اور مطلوب صفات کی آبیاری سے ان کو پروان چڑھایا جائے۔ پس درحقیقت تزکیۂ نفس اور اخلاقی تیاری دونوں ہم معنی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس طرح دوسری تمام تیاریوں کے معاملہ میں "تیاری بجائے خود" ایک مہمل چیز ہے اسی طرح یہ اخلاقی تیاری بھی بذاتِ خود مُہمل ہے تاوقتیکہ یہ بات واضح طور پر متعین نہ ہو کہ تیاری کس مقصد کے لیے ہے؟ مقصد ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والی چیز ہے کہ کونسی صفات اس کے حصول میں مانع ہیں جن سے نفس کو پاک کیا جائے اور کونسی صفات اس کے حصول میں مددگار ہیں جن کو نشوونما دینے کی سعی کی جائے۔ مقصد ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کس پیمانے کا انسان درکار ہے جسے بنانے کی کوشش کی جائے اور کس پیمانے کے انسان غیر مفید یا ناکافی ہیں جن کے بنانے کی یا تو کوشش ہی نہ ہو یا جن کے بن جانے پر اکتفا نہ کیا جائے۔ مقصد ہی کی نوعیت پر اس سوال کا فیصلہ بھی منحصر ہے کہ تزکیۂ نفس کے طریقوں میں سے کونسا طریقہ پیمانۂ مطلوب کے انسان تیار کرنے کے لئے مناسب تر ہے، اور تزکیہ کی کن کن تدابیر کو کس تناسب کے ساتھ استعمال کیا جائے کہ اس پیمانہ کے انسان ڈھل سکیں!

یہ مقصد کا سوال اس تزکیۂ نفس کے مسئلے میں اتنا اہم ہے کہ نہ صرف تزکیہ کی نوعیت اور اس کے پیمانے اور اس کی منہاج ہی کا اس پر انحصار ہے بلکہ فی الحقیقت ایک

قسم کے تزکیہ اور دوسری قسم کے تزکیہ میں فرق و امتیاز بھی اس کے لحاظ سے ہوتا ہے اور مختلف اقسام کے تزکیوں کی قیمت بھی اسی کی بنا پر مشخص کی جاسکتی ہے۔ بہت سے لوگ تزکیۂ نفس کو بجائے خود کوئی بہت بڑی قیمتی چیز سمجھتے ہیں اس لیے مقصد سے قطع نظر کر کے بس تزکیہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ حالانکہ محض تزکیہ ایک بے معنی چیز ہے۔ اسی طرح بہت سے ناواقف لوگ اُس مماثلت سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جو مختلف مقاصد کے تزکیوں کی بعض مشترک تدابیر میں پائی جاتی ہیں۔ ایک بلند ترین اور صحیح ترین مقصد کے لیے جو طریقے کسی حکیم نے اختیار کیے تھے انہی طریقوں کو جب اُس مقصد سے ہٹے ہوئے لوگ دوسرے پست یا غلط مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو دیکھنے والے طرح طرح کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ جب یہ ان طریقوں کو استعمال کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد بھی وہی ہوگا جو اُس حکیم کا تھا۔ کوئی گمان کرتا ہے کہ ان طریقوں کا استعمال بجائے خود محمود ہے، قطع نظر اس سے کہ کس مقصد کے لیے وہ استعمال کیا جائے۔ اور کوئی بے چارہ سادہ لوحی کی اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ پست اور غلط مقاصد کے لیے تزکیۂ نفس کرنے والے اُس بڑے حکیم کے نسخے کی ترکیب اور تناسب میں ترمیم کر کے، اُس کے بعض اجزاء کو نکال کر، بعض اجزاء کی مقدار بعض دوسرے اجزاء سے بڑھا کر اور بعض بظاہر مُباح اجزاء کا اپنی طرف سے اضافہ کر کے اُسے اپنے مقاصد کے لیے مناسب بناتے ہیں تو وہ غریب اس نئی ترکیب کے راز کو نہیں پاسکتا اور یقین لے آتا ہے کہ یہ نسخہ بھی صحیح ہے۔ حالانکہ اگر باضابطہ حکیمانہ طریقہ سے تزکیۂ نفس کے مسئلے کا مطالعہ کیا جائے، مقاصد کے لحاظ سے تزکیوں کی انواع و اقسام میں امتیاز کیا جائے، اور تدابیر تزکیہ کا اس اعتبار سے جائزہ لیا جائے کہ مختلف نوعیت کے تزکیوں میں بعض مشترک تدبیروں کا استعمال کس طرح مختلف طور پر ہُوا کرتا ہے، ہر نوعیت کے تزکیہ میں ان تدابیر کی رُوح دوسری نوعیتوں کے تزکیوں سے کس قدر مختلف ہوتی ہے، اور ان تدابیر کے تناسب کا تزکیے کے مزاج میں کتنا دخل ہے، تو اس قسم کی ساری غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں اور حقیقت بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اسلحہ سازی کی جو مثال ابھی ہم نے اوپر دی ہے اگر آپ اُسے نظر میں رکھیں اور پھر اس مسئلہ پر غور کریں تو سارا معاملہ بآسانی آپ کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ آپ اِس مثال میں ہتھیار کی جگہ انسان کو رکھ دیں اور اسلحہ ساز کے مقام پر اُس شخص کو رکھ دیں جو تزکیہ سے انسانوں کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ لامحالہ یہاں بھی سب سے پہلے وہی سوال پیدا ہوگا جو اسلحہ سازی کے معاملہ میں پیدا ہُوا کہ یہ شخص آخر کس غرض کے لیے انسان تیار کرنا چاہتا ہے؟ انسان سازی آرٹ کے نظر سے بھی ہو سکتی ہے اور پیشہ ورانہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس غرض سے بھی ہو سکتی ہے کہ آپ دنیا میں خود اپنی ایک اسکیم رکھتے ہیں اور اپنے تیار کیے ہوئے انسانوں کی طاقت سے اس کو جاری کر کے اپنے دنیوی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس غرض سے بھی ہو سکتی ہے کہ آپ دنیا میں خدا کی اسکیم کو جاری کر کے اُس کی رضا کو پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان تمام مختلف اغراض کے لیے جو انسان سازی کی جائے گی اس میں بہت سی چیزیں مشترک ہوں گی۔ مثلاً متعدد انسانی صفات ایسی پائی جائیں گی جنہیں سب یا اکثر انسان ساز دُور کرنا چاہیں گے۔ کیونکہ وہ ان سب کی یا اکثر کی جُداگانہ اغراض کے حصول میں مانع ہوتی ہیں۔ اسی طرح متعدد صفات ایسی ملیں گی جنہیں وہ سب یا اکثر نشوونما دینے کے خواہشمند ہوں گے کیونکہ وہ انکی الگ الگ اغراض کے حصول میں مددگار ہوتی ہیں۔ اسی طرح اخلاقی تیاری کی بہت سی تدبیریں بھی آپ ایک غرض انسان سازی میں وہی پائیں گے جو دوسری غرض کی انسان سازی میں پائیں گے۔ لیکن ان ظاہری مماثلتوں کے باوجود مختلف اقسام کی انسان سازی کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہی رہیں گے، اس لیے کہ غرض و مقصد کا اختلاف اُن کے راستوں کو لازماً جُدا کر دے گا۔ جن صفات کو غیر مطلوب سمجھنے میں یہ سب متفق ہوں گے۔ ان کے غیر مطلوب ہونے کی وجہ ہر ایک کی نگاہ میں دوسرے سے مختلف ہوگی، ان کی غیر محمودیت کے مراتب بھی سب کے ہاں یکساں نہ ہوں گے، اور اُن کے سوا بہت سی صفات ایسی ملیں گی جو ایک کے ہاں سخت مذموم ہوں گی اور دوسرے کے ہاں صفاتِ مذمومہ کی فہرست میں سرے سے ان کا ذکر تک نہ ملے گا۔ پس نہ صرف

یہ کہ مشترک صفاتِ مذمومہ کے مذموم ہونے میں ہر ایک کا نقطۂ نظر دوسرے سے مختلف ہوگا بلکہ کُلی حیثیت سے ایک کی صفاتِ مذمومہ کا مجموعہ دوسرے کے مجموعہ سے مختلف پایا جائے گا۔ یہی صورتِ حال صفاتِ مطلوبہ کے معاملہ میں آپ دیکھیں گے کہ صفات کے مطلوب ہونے کی وجہ میں یہ سب غیر متفق ہوں گے، اُن کے مراتبِ مطلوبیت و محبوبیت میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہ ہوگا، اور ایک کی صفاتِ مطلوبہ کا مجموعہ دوسرے کے مجموعہ سے نہ ملے گا۔ اسی طرح تدابیر میں آپ دیکھیں گے کہ مشترک تدابیر میں بھی ہر ایک کے ہاں دوسرے سے مختلف مدارج کارفرما ہوں گی اُن کی اہمیت کے مدارج میں بھی اختلاف ہوگا اور مجموعی حیثیت سے ایک کا نظامِ انسان سازی اپنی ترکیب اور اپنی تدابیر کے تناسب میں دوسرے کے نظامِ انسان سازی سے بالکل غیر مشابہ ہوگا۔

انسان سازی اگرچہ نام کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے لیکن دیکھیے غرض و مقصد کے اختلاف سے مختلف قسم کے انسانوں میں کتنا بڑا اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے ان مختلف اسکولوں میں ہم فرق کیسے کریں گے اور کیسے یہ تعین کریں گے کہ ان میں سے کون محض آرٹسٹ ہے اور کون پیشہ ور ہے، کون دنیا میں اپنی اسکیم چلانے کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا ہے اور کون خدا کی اسکیم کو جاری کرنے کے لیے سعی و عمل کے میدان میں اُترنا چاہتا ہے؟ یہ فرق و امتیاز ظاہر ہے کہ دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہم ہر اسکول کے نظامِ تزکیہ کا جائزہ لیں دوسرے یہ کہ ہم ہر اسکول کے طرزِ عمل کو دیکھیں۔

آرٹسٹ کا امتیازی وصف یہ ہوتا ہے کہ خوش ذوقی، حُسن، لطافت، کمالاتِ معنوی، ظہورِ عجائب اور مشاہدۂ جمالِ معنوی اس کے نظام کی بنیادی قدریں ہوتی ہیں۔ اسی لیے آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے تزکیۂ نفس کے جتنے اسکول قائم ہوں گے اُن میں لازماً یہی چیزیں زیادہ نمایاں ہوں گی۔ اُن کے ہاں صفاتِ مذمومہ کی فہرست اس لحاظ سے مرتب ہوگی کہ جو صفات آرٹ کے نقطۂ نظر سے جتنی زیادہ مذموم ہیں ان کے دُور کرنے پر اتنا ہی زیادہ زور دیا جائے گا! طہارت، نظافت، آداب (ایٹی کیٹ) اور وضع

(فیشن)، اور اسی نوعیت کی دوسری چیزوں میں مقررہ ضابطوں سے معمولی انحراف کو بھی وہ بڑے معاصی میں شمار کریں گے۔ جن صفات سے اُن کے نزدیک روح کی پرواز میں فرق آتا ہے یا جو صفات لطائف کے کھلنے میں مانع ہوتی ہیں، یا جن سے کمالاتِ معنوی کا حصول نہیں ہو سکتا، وہ اُن کے ہاں اصلی صفاتِ غیر محمودہ قرار پائیں گی۔ اسی طرح صفاتِ محمودہ میں بھی آپ اُن کی پوری فہرست پر آرٹ کو مسلط پائیں گے۔ آپ کو صریح طور پر محسوس ہوگا کہ ان کو زیادہ تر دلچسپی زندگی کے حُسن سے ہے اور اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ کچھ چاہتے ہیں تو صرف وہ اخلاقی خوبیاں جن سے نفس میں لطیف قوتیں پیدا ہوں، عالمِ بالا کی طرف پرواز کی طاقت آئے اور ماوراۓ مادہ لذتوں کے اِدراک کی صلاحیت نشوونما پائے۔ گویا کہ وہ ایک نفیس ریڈیو سیٹ بنانا چاہتے ہیں جو نہایت متناسب اور خوش وضع بھی ہو اور لطیف ترین آوازوں کو بھی اخذ کر لے۔ یا ایک خوبصورت کیمرا بنانا چاہتے ہیں جو ستھرا بھی ہو اور جس کی پلیٹ پر لطیف ترین صورتیں مُرتسم بھی ہو سکیں۔ ان کے لیے دنیا میں کرنے کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کی خاطر انہیں خارج کی طاقتوں سے کشمکش اور مقابلہ پیش آئے، جس میں ذمہ داریوں کا بوجھ سہارنے کی طاقت درکار ہو، جس میں تمدن، معاشرت، سیاست اور تہذیبِ افکار و اعمال کے مسائل سے انہیں دوچار ہونا پڑے، اور کسی ایجابی اسکیم کو مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم نافذ کرنے کی ضرورت ہو۔ اس لیے وہ صفاتِ محمودہ وغیر محمودہ کے اُس پُورے شعبے کا نوٹس نہیں لیتے، جو دنیا کے میدانِ کارزار میں ایک متعین مقصد لے کر اُترنے والے کے نقطۂ نظر سے مطلوب یا غیر مطلوب ہُوا کرتی ہیں۔ انہیں عمارت کی مضبوطی سے بحث نہیں، صرف اُس کی زینت، اُس کے تناسب اور اُس کے رنگ روغن اور نقش و نگار سے بحث ہے۔ ان کو سیرت کا زور اور صلابت مطلوب نہیں، محض اُس کا حُسن مطلوب ہے۔ ان کو نفس کی وہ زبردست طاقتیں درکار نہیں جن سے وہ دنیا میں بھاری ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور بڑے کام انجام دینے کے لیے تیار ہو، بلکہ وہ لطیف قوتیں مطلوب ہیں جن سے وہ کشفِ صدور، کشفِ قبور، ادراکِ لطائفِ غیبی اور اسی

نوع کی دوسری چیزوں پر قادر ہو جائے۔ اس لیے ہی وہ تدابیر تزکیہ میں سے صرف انہی چیزوں کو اختیار کرتے ہیں جو ان کی اس غرض کے لیے موزوں ہوتی ہیں مسلمان آرٹسٹ ہوں یا غیر مسلم آرٹسٹ، سب کی غرض ان تدابیر سے فی الجملہ ایک ہی ہے اور سب کے ہاں ان تدابیر کا مزاج یکساں ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ مسلمان آرٹسٹ ان تدابیر کا انتخاب اسلام کے مجموعہ تدابیر میں سے کرتا ہے، اُن کے پُورے مجموعہ میں سے (جو کسی اور غرض کے لیے ایک اور ہی تناسب سے بنایا گیا تھا۔) الگ نکال کر اپنے لیے مفید مطلب بناتا ہے۔ ان کے ساتھ اُسی مزاج کی کچھ دوسری تدبیروں کا، (کبھی بشرطِ اباحت، اور کبھی بلا شرطِ اباحت) جوڑ لگاتا ہے اور اس طرح وہ نفوسِ زکیہ تیار کرتا ہے جو اس کے آرٹ کے نقطۂ نظر سے مثالی نفوس ہوتے ہیں۔

اب پیشہ ور مُزکّی کو لیجیے۔ اس کے ہاں آپ نصب العین کو بڑی حد تک مفقود پائیں گے۔ اس کے معمل میں آپ کو ہر ماڈل کے نفوسِ زکیہ مل جائیں گے۔ وہ کوشش کرے گا اُن صفاتِ قبیحہ کو دُور کرنے کی جو تزکیہ کی منڈی میں غیر مطلوب ہیں اور پورا زور صرف کر دے گا اُن صفاتِ حسنہ کو نشوونما دینے پر جن کی اس بازار میں مانگ پائی جاتی ہے۔ اسی غرض کے لیے وہ تزکیہ کی چند مناسب تدابیر اختیار کرے گا، پھر ان تدبیروں سے جو نفوسِ زکیہ تیار ہوں گے اُن کو چھوڑ دے گا کہ بازار میں جہاں کھپ سکیں، کھپ جائیں۔ اس کا حال پیشہ ور اسلحہ ساز کا ہو گا جسے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ اُس کی صیقل کی ہوئی تلواریں کس کمر میں بندھتی ہیں، اس لیے کہ دُنیا کے میدانِ کارزار میں اس کی نہ کسی سے جنگ ہے، نہ دُشمنی۔ وہ اس رزم گاہ میں ایک غیر جانبدار کاریگر ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اچھے اچھے پرہیزگار، فرض شناس، مُتدیّن، خوش معاملہ، آدمی تیار کر دے۔ اب اگر یہ اُس کے کارخانے کا مارکہ پیشانی پر لیے ہوئے، کسی ظالم کی پولیس میں "متقی" تھانہ دار بن جائیں، یا کسی طاغوت کی عدالت میں غیر الٰہی بلکہ صریح خلافِ شریعتِ الٰہی کی بنیاد پر مقدمہ لڑنے والے "متدیّن" وکیل یا خود فیصلہ کرنے والے "پرہیزگار" طاغوت بن جائیں، یا اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے اُن میدانوں میں دھاوے ماریں جہاں

عملاً اللہ کے کھلے باغیوں کی کبریائی قائم ہوتی ہو، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ؛ بلکہ ایسے جتنے کامیاب پُرزے اُس کی خانقاہ سے منسوب ہوں گے اُسی قدر زیادہ اس کی کامیابی کی شہادت فراہم ہوگی ۔ اس کی اصل کامیابی یہی ہے کہ اس کے تیار کیے ہوئے پُرزے خُدا کی یاد اور اُس کے خوف سے پائیداری حاصل کر کے خود خدا ہی کے باغیوں کی مشین میں نہایت خوبی کے ساتھ نصب ہو جائیں اور ان باغیوں کے اپنے ڈھالے ہوئے پُرزوں سے بھی کچھ زیادہ ہی قابلِ اعتماد ثابت ہوں ۔

اِس کاروبار میں یہ پیشہ وَرمُزکّی نہ محض اخلاقی حُسن و قُبح کے معیار کو اور نہ صرف تدابیرِ تزکیہ کے نظام کو اپنے پیشہ کے مزاج پر ڈھالتا ہے، بلکہ ایک الگ نظریۂ زندگی اور ایک پُورا فلسفۂ حیات وضع کر دیتا ہے جس کے بغیر اس کا یہ پیشہ قائم نہیں ہو سکتا ۔ اُس کے ساختہ پرداختہ اِنسانوں کے دماغ اِس تصوّر کی پیداوار کے لیے بالکل بنجر ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں وہ اپنا بھی کوئی نظامِ زندگی رکھتے ہیں جسے دوسرے نظاموں کی بجائے اپنا نظام قائم کرنے کے لیے انہیں مجاہدہ کرنا چاہیے ۔ اس کے برعکس وہ انہیں ہر نظامِ غالب میں بسہولت رہنے اور اس سے سازگاری کرنے اور اُس کے اندر کھپ جانے کے لیے تیار کرتا ہے اور مذہب، اخلاق، روحانیت اور تہذیب کا ایک ایسا مناسب خلاصہ نکال کر انہیں دے دیتا ہے جسے ساتھ رکھ کر وہ ہر نظامِ فاسد کے جُزوِ صالح بن سکتے ہیں ۔

دُنیوی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی بہت سی قسمیں ہیں ۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن کے پیشِ نظر اپنا یا اپنے خاندان یا طبقے کا کوئی مقصد ہوتا ہے ۔ وہ بھی جو حُبِّ قوم یا حُبِّ وطن کی بنا پر ایک مقصد لے کر اُٹھتے ہیں، اور وہ بھی مجرد انسانی مفاد کے لیے کوئی اسکیم چلانا چاہتے ہیں ۔ پھر ان میں سے بعض کسی روحانی و اخلاقی مذہب کو مانتے ہیں اور بعض نہیں مانتے ۔ جزئیات میں ان سب کے طریقِ انسان سازی میں کافی فرق معلوم ہوتا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ان سب کی مشترک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو اس حیثیت سے کم ہی دیکھتے ہیں کہ وہ انسان ہے ۔ اُس کے

ساتھ زیادہ تر دلچسپی انہیں اس حیثیت سے ہوتی ہے کہ وہ ان کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ گویا کہ وہ انسان نہیں بناتے بلکہ اپنی اسکیم کے آلات اور اپنی جنگ کے ہتھیار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صفاتِ محمودہ و غیر محمودہ میں سے وہ صفات اُن کی فہرست میں جگہ نہیں پاتیں جو انسانیت کے لحاظ سے محمود و غیر محمود ہیں ——— ایسی کچھ صفات سے وہ تعرض بھی کرتے ہیں تو انسانیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض افادیت کے لحاظ سے ——— دراصل ان کی پوری فہرستِ اخلاق اس بُنیاد پر مُرتّب ہوتی ہے کہ اُن کی اس اسکیم کے نفاذ کا آلہ ہونے کی حیثیت سے انسان میں کونسی صفات ہونی چاہئیں اور کونسی نہ ہونی چاہئیں۔ اسی بنیاد پر وہ اپنا نظامِ تزکیہ و تربیت تعمیر کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کے اِس نظامِ انسان سازی کے مزاج کو سمجھنا چاہیں تو صرف ایک بات اُس کی مکمل تشخیص کے لیے کافی ہے اور وہ یہ ہے کہ فی الواقع جو صفات انسانیتِ عالیہ کی خصوصیات میں سے ہیں اُن کو بھی یہ نظام اِس طور پر اپنے تربیت یافتہ انسانوں میں پرورش کرتا ہے کہ وہ شرفِ انسانیت کے بجائے محض ایک ہتھیار کی خوبی بن کر رہ جاتی ہیں مثلاً صبر، کہ وہ بہترین انسانی صفات میں سے ہے۔ مگر یہ نظام جن انسانوں میں اتنا صبر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ بموں کی بارش میں بھی ڈٹے رہتے ہیں اُن کے اندر اتنا بھی صبر پیدا نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کے معمولی سے تقاضے ہی کے مقابلہ میں ٹھہر جائیں۔

اِن سب سے مختلف معاملہ اس شخص کا ہے جو انسان کو اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہتا ہو کہ وہ خدا کے اِمتحان میں کامیاب ہو اور اُس منصبِ خلافت کا، جو خدا نے اِنسان کے سپرد کیا ہے، پُورا پورا حق ادا کر کے خدا کی رضا کو پہنچے۔ اس غرض کے لیے وہ اخلاق کے مسئلے کو اُس وسعت کے ساتھ اور پھر اُس جزرسی و باریک بینی کے ساتھ دیکھے گا جس کے ساتھ کوئی دوسرا اُسے نہیں دیکھتا۔ وہ اُس پورے دائرۂ زندگی کی پیمائش کرے گا جس میں انسان کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اُس دائرے کے ہر ہر حصّے کے مُتعلق تحقیق کرے گا کہ کس حصّہ میں کس پہلو سے آزمائش ہے اور اس آزمائش میں کامیابی کا مدار کس چیز پر ہے۔ پھر بحیثیتِ مجموعی پوری زندگی کے اِمتحان کے متعلق یہ مُشخّص کرے گا کہ اس میں فی الواقع

اللہ تعالیٰ کا وہ منشا کیا ہے جسے پورا کرنے پر ہی انسان کی کامیابی منحصر ہے۔ پھر اسی نقطۂ نگاہ سے وہ یہ دیکھے گا کہ انسان کے اندر اور اس کے باہر کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جو اس کی کامیابی کی راہ میں سدِ راہ ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا سدِ راہ ہونے کی حیثیت سے کیا مرتبہ ہے، اور اسی طرح باطن و خارج میں کیا چیزیں اس کی کامیابی کے لیے مفید و معاون ہیں اور اس افادیت و معاونت کے اعتبار سے اُن کے کیا مدارج ہیں یہی ہے بنیاد ہے جس پر وہ مطلوب و غیر مطلوب امور کی فہرست مرتب کرے گا، اور اسی بنیاد پر اس امر کا تعیین بھی کرے گا کہ کونسی چیز کس درجہ میں مطلوب و غیر مطلوب ہے اور اسے حاصل کرنے یا مٹانے پر کتنا زور صرف کرنا چاہیے۔ پھر یہی وہ بنیاد ہے جس پر وہ تزکیہ کی تدابیر کا انتخاب کرے گا۔ اس کے نظامِ تزکیہ میں ایسی تمام تدابیر جمع ہوں گی جن سے انسان کی کامیابی کے باطنی موانع دور ہوں اور اس کے اندر خارجی موانع کو ہٹانے اور مٹانے کا عزم اور بل بوتا نشوونما پا سکے۔ نیز جن سے وہ چیزیں اُس کے باطن میں اُبھریں اور ترقی کریں جو اس کی کامیابی میں مددگار ہو سکتی ہیں اور ان چیزوں کو وہ حاصل کرنے اور ترقی دینے کا مشتاق اور اہل بن جائے، جو خارج میں اس کے لیے موجبِ فوز و فلاح ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ وہ ایسی تمام تدبیروں کو اپنے نظام میں جمع کرے گا، بلکہ درحقیقت اس کے نظام میں ان تمام تدبیروں کے اندر اسی مقصد کی روح کارفرما ہوگی اور اسی مقصد کو ملحوظ رکھ کر وہ ان تدبیروں کو ایک تناسب کے ساتھ اپنے نظامِ تزکیہ میں جگہ دے گا۔

یہی آخری قسم کا تزکیۂ نفس اسلامی تزکیۂ نفس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نظامِ تزکیہ کے مصطلحات اور اس کے بعض اجزا کسی دوسری نوعیت کے نظامِ تزکیہ میں بھی پائے جائیں۔ لیکن سخت غلطی پر ہوگا وہ شخص جو محض اتنی مماثلت دیکھ کر اُسے اسلامی تزکیۂ نفس سمجھ بیٹھے گا۔ خوب سمجھ لیجیے کہ جہاں مطلوب اور غیر مطلوب اشیاء کی فہرست میں اسلام کی فہرست سے کچھ کمی بیشی پائی جاتی ہے، جہاں ان کے مراتبِ مطلوبیت و غیر مطلوبیت میں بھی کچھ اُلٹ پھیر ہے، جہاں تزکیۂ نفس کے کام میں آرٹ یا پیشہ وری یا دُنیا طلبی کا رنگ پایا جاتا ہے، اور جہاں تدابیرِ تزکیہ میں اور اُن کے اس تناسب میں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے قائم کیا تھا، تصرف بھی کیا گیا ہے، وہاں ضرور مقصدِ تزکیہ بدل گیا ہے اور مقصد کے بدل جانے کی وجہ سے نوعیتِ تزکیہ بھی بدل چکی ہے۔ ایسا تزکیہ نفس خواہ اُس میں تقویٰ اور طہارت کی کتنی ہی گفتگو ہو اور خواہ اس میں اسلامی تزکیۂ نفس کے مقدس ترین اجزا کتنے ہی مبالغے کے ساتھ شامل کیے گئے ہوں، بہرحال اُس قدر کا مستحق نہیں ہو سکتا جو صرف اسلامی تزکیۂ نفس ہی کے لیے مختص ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مقصد کے لیے لڑنے والے نے اگر تلوار پر صیقل کا ایک ایک ہاتھ مارنے کو بڑے اجر و ثواب کا کام قرار دیا ہو تو یہ اجر و ثواب کا حکم ہرگز وہاں چسپاں نہ ہوگا جہاں محض آرٹ کے طور پر صیقل کے ہاتھ مارے جا رہے ہوں یا جہاں اُس کے دشمن کے لیے تلواریں صیقل کی جا رہی ہوں[1]

(۳)

عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تطہیر یعنی پاک صاف کرنا۔ دوسرے تنمیہ یعنی نشوونما دینا، بڑھانا اور ترقی دینا۔ پس تزکیۂ نفس کا مفہوم یہ ہوا کہ نفس کو بُری صفات سے پاک کیا جائے اور اچھی صفات کی آبیاری سے اس کو نشوونما دیا جائے۔

یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں تربیت اور تعمیرِ سیرت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس سے مقصود اُس طرز کے انسان تیار کرنا مطلوب ہوتا ہے جو کسی کو مطلوب ہوں۔

اس تزکیہ و تربیت، بالفاظِ دیگر، انسان سازی کی شکل متعین کرنے والی چیز، جیسا کہ ہم ان صفحات میں اس سے پہلے بتفصیل بیان کر چکے ہیں، وہ نصب العین ہے جو انسان تیار کرنے والے کے پیشِ نظر ہو، جیسا نصب العین اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ویسے ہی آدمی وہ تیار کرنا چاہتا ہے۔ اور جیسے آدمی وہ تیار کرنا چاہتا ہے اس کے لحاظ

---

[1] ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء

سے وہ یہ طے کرنا چاہتا ہے کونسی صفات اصل نصب العین کی ضد اور اس کے حصول میں مانع ہیں اور کونسی صفات اس سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس کے حصول میں مددگار ہیں۔ پھر اسی کے لحاظ سے وہ ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جن سے غیر مطلوب صفات کو دبایا یا مٹایا جائے اور مطلوب صفات کو اُبھارا اور نشوونما دیا جائے۔

اب اگر ہم اسلامی تزکیۂ نفس کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس نصب العین کو جاننا چاہیے جو انسان سازی میں اسلام کے پیشِ نظر ہے۔ اس باب میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنے مدعا کی توضیح ایسے واضح طریقے سے کی ہے کہ کسی التباس و اشتباہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ (البینہ)

(ترجمہ) اُن کو اس کے سوا اور کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنی اطاعت کو اس کے لیے خالص کر کے، پُوری طرح یکسو ہو کر۔

اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بندگی کا معیارِ مطلوب یہ بیان فرماتے ہیں:

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

(ترجمہ) خوبی یہ ہے کہ تو اللہ کی بندگی اس طرح کر کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے، یا اگر اس حد تک نہیں تو کم از کم اس احساس کے ساتھ کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پھر قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آلِ عمران۔ ۱۱)

(ترجمہ) اور چاہیے کہ تم سے ایک ایسا گروہ وجود میں آئے جو نیکی کی طرف دعوت دے، بھلائی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایسے انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو فرداً فرداً اپنی گردن سے تمام اطاعتوں اور تمام بندگیوں کے حلقے اُتار کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کا حلقہ کسی مجبوری کے بغیر آپ اپنی ہی رضا و رغبت سے پہن لیں، اور پھر اللہ کی اطاعت و

خدمت اُس نوکر کی سی انتہائی وفاداری اور خوف و خشیت اور حُسنِ کارکردگی کے ساتھ کریں جو اپنے آقا کو سامنے کھڑا دیکھ کر، یا یہ محسوس کر کے کہ آقا کی نگاہ اُس پر ہے، زیادہ سے زیادہ بہتر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ اس کی کوئی بات آقا کے غضب کی موجب نہ ہو۔ پھر اس قسم کے افراد کو جوڑ کر اسلام ایک ایسا منظم گروہ وجود میں لانا چاہتا ہے جو دنیا کو خیر کی طرف بُلانے اور نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اُٹھے، جس کی ساری جدوجہد اور سعی و عمل صرف اس لیے ہو کہ دنیا سے فساد، جو اللہ کو مبغوض ہے مٹ جائے اور خیر و صلاح جو اللہ کو محبوب ہے، اس کی جگہ قائم ہو، جو خیر کا علم ہاتھ میں لے کر دنیا بھر سے اس کے لیے لڑ جانے پر تیار ہو اور سارے جہان سے اس کی کشمکش اور نزاع صرف اسی ایک بات پر ہو کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اس کے آگے سارے کلمے دب کر رہ جائیں۔

اسلام جو تزکیۂ نفس کرتا ہے وہ اسی مقصد کے لیے کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کے امتحان میں انسان کی کامیابی اور اللہ کے قُرب سے اس کی سرفرازی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اُس کی عبدیت کامل ہو اور وہ انفرادی و اجتماعی طاقت سے زمین پر اللہ کے منشا، یعنی قیامِ حسنات و ازالۂ سئیات کو پورا کرے۔ اسی مقصد کی مناسبت سے اسلام نے انسانی صفات کو محمود اور غیر محمود، اور مطلوب اور غیر مطلوب میں تقسیم کیا ہے۔ فرد اور جماعت دونوں میں جو صفات عبدیت کی ضد ہیں اور اقامتِ حق کی سعی میں مدد ملتی ہے وہی اسلام کی نگاہ میں محمود ہیں اور فرد اور جماعت کو ان سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ قرآن و حدیث کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو پوری تفصیل کے ساتھ اُن صفاتِ محمودہ اور غیر محمودہ کی ایک مکمل فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ اور اُن تدابیر کا بھی پورا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے تزکیۂ نفوس کے لیے تجویز کی ہیں۔ یہ چیز اس قدر واضح اور مکمل طریقے سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلعم میں ہمیں مل جاتی ہے کہ اس سے باہر کہیں اور اسے تلاش کرنے کی قطعاً کوئی حاجت باقی نہیں رہتی، البتہ جس کے پیشِ نظر اسلام کے مقصد سے الگ کچھ دوسرے مقاصد ہوں وہ بلاشبہ اس منبع میں اپنی پیاس بجھانے والی چیز نہیں پا سکتا اور مجبوراً اُسے دوسرے چشموں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

(ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۳ء)

تاویلِ قرآن کے صحیح اصول

(ایک امریکن پروفیسر کا خط اور اُسکا جواب)

پچھلے دنوں امریکہ کی ٹفٹس یونیورسٹی (Tufts University) کے ایک پروفیسر ڈاکٹر فری لینڈ ایبٹ (Freeland K. Abbott) نے ہمارے پاس چند سوالات اس درخواست کے ساتھ بھیجے تھے کہ ہم ان کا مفصل جواب دے کر اُن مشکلات کو رفع کریں جو انہیں فہم قرآن کے معاملہ میں پیش آ رہی ہیں۔ یہ سوال نامہ اور اس کا جواب چونکہ قرآن مجید کے دوسرے طالب علموں کے لیے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان صفحات میں اسے درج کیا جا رہا ہے۔

صاحبِ موصوف لکھتے ہیں:

"اسلام کو سمجھنے کی کوشش میں جس مسئلے کو میں نے سب سے زیادہ پریشان کن پایا وہ قرآن کی تاویل و تعبیر کا مسئلہ ہے۔ ذیل کے سوالات میں نے اس غرض کیلئے مرتب کیے ہیں کہ اس معاملے میں میرے ذہن کی الجھن کو صاف کیا جائے۔ میں نے ایک مخصوص مسئلے کو اپنے سوالات کا محور صرف اس لیے بنایا ہے کہ تاویلِ قرآن کے اصولوں کو جاننے کے ساتھ یہ بھی معلوم کر سکوں کہ مخصوص مسائل پر ان اصولوں کا اطلاق کس طرح ہوتا ہے۔

قرآن کہتا ہے "دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔" (بقرہ - آیت ۲۵۶) اس پر حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) کیا ایران میں بہائیوں کا استیصال اس آیت کے خلاف نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیوں؟ کیا پاکستان میں قادیانیوں کے خلاف ہنگامے اس آیت کے خلاف نہ تھے؟ اگر نہ تھے تو کیوں؟

(۲) اکراہ کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ لفظ قہر (coercion) سے زیادہ وسیع نہیں ہے؟ اگر موجودہ زمانے کی ایک ریاست میں مسلمانوں کو ٹیکس میں رعایات ملیں یا شہریت کے زیادہ فوائد حاصل ہوں تو کیا یہ بھی غیر مسلموں کے حق میں اکراہ نہ ہوگا؟ یقیناً ایک ایسا تاجر جو تھوڑے منافع پر کام کر رہا ہو اپنی روزی محفوظ رکھنے کے لیے ایسے حالات میں اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔

(۳) کیا یہاں لفظ "دین" اپنے عام و وسیع تر معنوں کی بہ نسبت محدود تر معنوں میں استعمال ہوا ہے؟

(۴) اس آیت کا ایک مفسر کہتا ہے کہ "مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ جب ان کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو انہیں اس اصول کی پیروی کرنی چاہیے کہ دین میں جبر سے کام نہ لیا جائے۔" یہ مفسر اس آیت کے حکم کو صرف اُس حالت کیلئے کیوں مخصوص کرتا ہے جب کہ مسلمان اقتدار رکھتے ہوں؟ کیا آپ اس تاویل سے اتفاق کرتے ہیں؟

(۵) اگر آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اُسوقت تک جبر سے کام لے سکتے ہیں جب تک کہ انہیں اقتدار حاصل نہ ہو جائے؟

(۶) اگر ایک اسلامی ریاست میں ایک مرتد واجب القتل ہے تو پھر کیا یہ دین میں جبر کا استعمال نہیں ہے؟

قرآن کہتا ہے "وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی۔ اُس کی کچھ آیات محکم ہیں اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری متشابہات ہیں۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ اس کتاب کی اُن آیات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور اُن کو معنی پہنائیں۔" (آل عمران۔ آیت۷)

(۷) کیا یہ صحیح ہے کہ آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے معنی صاف اور صریح ہیں اور اس بنا پر ان کی تاویل و تعبیر کی حاجت نہیں ہے؟ اگر بات یہی

ہے تو کیا یہ فرض کر لیا جائے گا کہ ان کے معنی سب لوگوں پر واضح ہیں؟ اور کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں اور ایک ہی درجے کا تعقّل رکھتے ہیں؟

(۸) کیا آیت لا اکراہ فی الدین محکم ہے؟ اگر نہیں ہے تو چند ایسی آیتوں کی نشاندہی کیجیے جو قطعی طور پر صریح الدلالت ہیں۔

(۹) سورۂ نساء کی تیسری آیت جس میں تعدّدِ ازدواج کی اجازت مذکور ہے محکم ہے یا متشابہ؟ اگر وہ محکم ہے تو اس کے معنی میں اتنا اختلاف کیوں ہے اور اس کی اتنی مختلف تاویلیں کیوں کی جاتی ہیں؟ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ اس کے معنی بالکل صاف ہیں تو کیا اس کی کوئی ضرورت ہے کہ وہ حدیث کی طرف رجوع کرے؟ (یہ واضح رہے کہ میں بجائے خود تعدّدِ ازدواج کے مسئلے سے دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ یہاں زیرِ بحث قرآن کی تاویل کا مسئلہ ہے۔

(۱۰) جب قرآن کی مختلف آیات ایک ہی موضوع سے متعلق ہوں اور ان کا مضمون ایک دوسرے سے مختلف پایا جائے تو ایک آدمی کس طرح فیصلہ کرے کہ ان میں سے کونسی آیت کس کی ناسخ ہے؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک آیت بعد میں نازل ہوئی ہے تو کیا یہ بات اسے ناسخ قرار دینے کے لیے کافی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا قرآن کو تاریخِ نزول کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کرنا مفید نہ ہوگا؟

(۱۱) کیا ایک اسلامی ریاست میں افراد کو یہ حق ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک آیات محکمات کے جو معنی خود سمجھتا ہو ان کی پیروی کرے؟ کیا اس کو یہ حق ہوگا کہ ان آیات کی کسی ایسی تعبیر کو ماننے سے انکار کر دے جو اس کی ذاتی تعبیر سے مختلف ہو، خواہ وہ حکومت کے مقرر کیے ہوئے کسی کمیشن ہی نے کیوں نہ کی ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۷ کا فائدہ کیا ہے؟

(۱۲) بائیبل کی کتاب رسولوں کے اعمال (باب ۱۰) میں ہے کہ تمام چار پاؤں والے جانور حلال ہیں۔ بخلاف اس کے بائیبل کا عہد نامۂ قدیم اور قرآن، دونوں بعض

جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ سب کتابیں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئی ہیں تو مسلمان ان کے اس اختلاف کی کیا توجیہہ کرتے ہیں؟ (واضح رہے کہ مجھے کسی خاص قسم کے گوشت کے کھانے یا نہ کھانے سے دلچسپی نہیں ہے بلکہ میں اُس تضاد کو رفع کرانا چاہتا ہوں جو کتبِ آسمانی میں پایا جاتا ہے یا مجھے محسوس ہوتا ہے)

(۱۳) تبلیغ کے لیے اسلام کے جوش کو کس طرح حق بجانب ٹھیرایا جا سکتا ہے جب کہ قرآن کہتا ہے کہ مختلف امتوں کے لیے خدا نے مختلف طریقے مقرر کیے ہیں اور یہ سب طریقے خدا ہی کے ہیں؟

(۱۴) کیا عالمِ طبعی سے متعلق انسان کا روز افزوں علم (بذریعہ طبعیات، کیمیا، ہیئت وغیرہ) انسان کو قرآن زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے قابل بنا دیتا ہے؟

(۱۵) قرآن جگہ جگہ یہودی اور مسیحی کتبِ مقدسہ کو الہامی کتابوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مگر بائیبل کے بہت سے علماء اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ کتابیں محض تاریخی دستاویزیں ہیں جن میں سے بعض کو ایک سے زیادہ مصنفوں نے تیار کیا ہے اور ان کے اندر الہامی ہونے کی شہادت کم ہی ملتی ہے۔ اب کیا قرآن ان کتابوں کے معاملے میں وحی والہام کو کسی مخصوص معنی میں استعمال کرتا ہے؟ کیا بائیبل کے علماء کی رائے غلط ہے؟ یا ہم یہ فرض کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد یہودیوں اور عیسائیوں کی کتبِ مقدسہ میں کوئی تغیر ہو گیا ہے؟"

اس سوال نامے کا جو جواب صاحبِ موصوف کو بھیجا گیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

قرآن کی تاویل کا صحیح طریقہ۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ قرآن مجید کی تاویل و تعبیر کا صحیح طریقہ اچھی طرح سمجھ لیں۔ آپ جس آیت کے معنی سمجھنا چاہتے ہوں، پہلے عربی زبان کے لحاظ سے اس کے الفاظ اور ترکیب (construction) پر غور کریں۔ پھر اسے سیاق و سباق (context) میں رکھ کر دیکھیں۔ پھر اسی مضمون سے تعلق رکھنے والی جو دوسری آیات

قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ہیں ان کو جمع کر کے دیکھیں کہ زیر بحث آیت کی ممکن تعبیرات میں سے کونسی تعبیر اُن سے مطابقت رکھتی ہے اور کونسی تعبیر اُن کے خلاف پڑتی ہے (اور یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کا کوئی قول اگر دو یا زائد تعبیرات کا محتمل ہو تو اس کی وہی تعبیر معتبر سمجھی جائے گی جو اس مضمون کے متعلق اسی شخص کی دوسری تصریحات سے مطابقت رکھتی ہو)۔ اس حد تک قرآن کا مطلب خود قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش جب آپ کر لیں تو اس کے بعد یہ بھی دیکھیے کہ جو شخص دراصل اس قرآن کو پیش کرنے والا تھا اُس کے قول اور عمل سے قرآن کی زیر بحث آیت کے مفہوم پر کیا روشنی پڑتی ہے، اور جو لوگ اس کے قریب ترین زمانے میں اُس کے پیرو تھے وہ اس آیت کا کیا مطلب سمجھتے تھے۔

(۲) آیت لا اکراہ فی الدین کے معنی۔

اس اصولی توضیح کے بعد اب میں اُس آیت کو لیتا ہوں جسے آپ نے مثال کے طور پر لیا ہے۔ اُس میں کہا گیا ہے کہ "دین میں کوئی جبر نہیں ہے"۔ عربی زبان کے لحاظ سے "دین میں" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک دین قبول کرنے یا اختیار کرنے کے معاملے میں۔ دوسرے دین کے نظام میں۔ ان دو تعبیروں میں سے کونسی تعبیر قابل ترجیح ہے؟ اس کا فیصلہ محض اس آیت کے الفاظ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے آپ کو سیاق و سباق کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

جس سیاق و سباق میں یہ آیت آئی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا ایک واضح تصور پیش کیا گیا ہے جو مختلف اقسام کے شرک میں مبتلا ہونے والی تمام موجود الوقت مذہبی جماعتوں کے تصورِ الٰہ سے مختلف ہے، اور جو اُس دین کا بنیادی عقیدہ ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ راہ راست گمراہی سے ممیز ہو چکی ہے، اب جو کوئی طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لائے اس نے ایک ایسی مضبوط رسی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے جو لوگ ایمان لائیں اللہ ان کا سرپرست ہے، وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور جو لوگ کفر کریں ان کے سرپرست طاغوت ہیں، وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں

سے جاتے ہیں ...... ۔ اس سیاق و سباق میں خط کشیدہ فقرہ صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ اللہ کے متعلق مذکورۂ بالا عقیدہ کسی سے زبردستی نہیں منوایا جائے گا، صحیح عقیدے کو غلط عقائد کے مقابلے میں پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے، اب جو کوئی غلط عقائد کو چھوڑ کر اللہ کو اس طرح مان لے جس طرح بتایا گیا ہے وہ خود فائدہ اٹھائے گا اور جو ماننے سے انکار کرے وہ آپ ہی نقصان میں رہے گا۔

اس کے بعد آپ پورے قرآن پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ متعدد جرائم کے لیے سزائیں تجویز کی گئی ہیں، بہت سی اخلاقی خرابیوں کو دبانے کا حکم دیا گیا ہے، بہت سی چیزوں کو ممنوع ٹھیرایا گیا ہے، متعدد چیزوں کو فرض و لازم قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ رسول اور اصحابِ امر کی اطاعت کریں۔ ان سب احکام کو نافذ (enforce) کرنے کے لیے بہرحال کسی نہ کسی طرح کی قوتِ جابرہ ...... (coercive power) کا استعمال ناگزیر ہے، خواہ وہ ریاست کی طاقت ہو یا سوسائٹی کے اخلاقی دباؤ کی طاقت۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ "دین میں کوئی جبر نہیں ہے" کہنے سے قرآن کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں سرے سے جابرانہ قوت کے استعمال کا کوئی مقام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دین اسلام کو قبول کرنے کے معاملہ میں جبر کا کوئی کام نہیں، جو قبول کرنا چاہے وہ اپنی آزاد مرضی سے قبول کرے اور جو قبول نہ کرنا چاہے اسے کوئی زبردستی ایمان لانے پر مجبور نہ کرے گا۔

اس مضمون پر مزید روشنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے براہ راست تربیت پانے والے اصحاب کے طرز عمل سے پڑتی ہے۔ انہوں نے کبھی کسی غیر مسلم کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا، مگر جو لوگ اسلام قبول کر کے مسلم سوسائٹی میں داخل ہو گئے ان کو اسلامی احکام کی تعمیل پر ضرور مجبور کیا اور اس غرض کے لیے اخلاقی و معاشرتی دباؤ ہی سے نہیں، حکومت کی طاقت سے بھی کام لیا۔ ان کے زمانے میں بکثرت غیر مسلم اسلامی حکومت کی رعایا بنے۔ انہیں عقیدے اور عبادت اور مذہبی رسوم ادا کرنے کی

پوری آزادی دی گئی اور ان کے شخصی قانون (personal law) کو بحال رکھا گیا، مگر اسلامی حکومت کا اجتماعی قانون (public law) ان پر بھی اسی طرح نافذ کیا گیا جس طرح وہ مسلمانوں پر نافذ کیا جاتا تھا۔

یہاں تک میں نے آیت کے اصل مفہوم کی تشریح کی ہے۔ اب میں آپ کے سوالات نمبر ۱ تا ۷ کا الگ الگ جواب عرض کرتا ہوں۔

۳۔ قادیانیوں کا معاملہ۔

(۱) ایران میں بہائیوں کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کے متعلق میرے پاس پوری معلومات نہیں ہیں، اس لیے میں اس پر کوئی اظہار رائے نہیں کر سکتا۔ لیکن پاکستان میں قادیانیوں کے معاملے پر آپ کا سوال سخت غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ قادیانیوں کو ملک سے نکال دیا جائے، یا مٹا دیا جائے، یا زبردستی قادیانیت چھوڑنے پر مجبور کیا جائے، یا حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ مطالبہ صرف یہ تھا اور ہے کہ جب وہ بنیادی عقیدے اور مذہبی اعمال اور معاشرتی نظام میں مسلمانوں سے خود الگ ہو چکے ہیں تو اس علیحدگی کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے اور انہیں بغیر کسی معقول وجہ کے مسلم سوسائٹی کا ایک حصہ نہ قرار دیا جائے۔ آپ خود غور کیجیے کہ یہ مطالبہ آخر کس منطق کی رو سے قرآن مجید کی زیر بحث آیت کے خلاف پڑتا ہے؟ کیا دین میں جبر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس گروہ کو تمام مسلمان دین سے خارج سمجھتے ہیں، اور جو خود بھی تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان سے عملاً الگ ہو چکا ہے، اسے دین میں داخل تسلیم کرنے پر مسلمانوں کو مجبور کرنا چاہیے؟ رہے وہ فسادات جو مارچ ۵۳ء میں ہوئے تھے، تو یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ وہ قادیانیوں کے خلاف تھے۔ ان کو قادیانیوں کے خلاف ہنگاموں (anti-Qadiani disturbances) کا نام بالکل غلط دیا گیا ہے جس سے ناواقف حال لوگوں کو خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہاں کے عام مسلمان شاید قادیانیوں کو قتل و غارت کرنے پر تل گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فسادات حکومت اور عوام کے درمیان اس کشمکش کی وجہ سے برپا ہوئے تھے کہ ایک طرف عوام

قادیانیوں کے بارے میں مذکورۂ بالا مطالبہ تسلیم کرانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے اور دوسری طرف حکومت ان کے اس ایجی ٹیشن کو طاقت سے دبا دینا چاہتی تھی۔ پس تصادم دراصل حکومت اور عوام کے درمیان ہوا تھا نہ کہ قادیانیوں اور عوام کے درمیان قادیانیوں کی جان و مال پر عوام نے صرف اُس وقت حملہ کیا جب انہیں یقین ہو گیا (اور اس یقین کے لیے اچھے خاصے وزنی وجوہ تھے) کہ فسادات کے دوران میں پولیس اور فوج کی وردیاں پہن کر بعض قادیانی مسلمانوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے (ملاحظہ ہو تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۵۶)

۴۔ مسلمانوں کے امتیازی حقوق کا معاملہ۔

(۲) مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹیکس عائد کرنے کے معاملے میں کوئی امتیاز اسلامی قانون کے اندر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی اسلامی دور میں عملاً غیر مسلم تاجروں سے مسلمان تاجروں کی بہ نسبت زیادہ تجارتی محصول لیا جاتا تھا، مگر دراصل وہ کسی مستقل شرعی حکم کی بنا پر نہ تھا، اور نہ اس سے مقصود غیر مسلم تاجروں کو اسلام لانے پر مجبور یا آمادہ کرنا تھا، بلکہ وہ ایک وقتی تدبیر تھی جو مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی، کیونکہ اُس وقت مسلمان اکثر و بیشتر فوجی اور سول خدمات میں لگ گئے تھے اور مفتوح ممالک کی پوری معاشی زندگی (تجارت، صنعت و حرفت، زراعت وغیرہ) بالکل غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس پر اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ اس ترجیح کے نتیجہ میں قلیل منافع پر کام کرنے والا تاجر (marginal businessman) اپنی روزی برقرار رکھنے کے لیے مسلمان ہونے پر مجبور ہو سکتا تھا، تو میں کہوں گا کہ آپ کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ مسلمان ہوتے ہی اس پر زکوٰۃ عائد ہو جاتی جس کا بار جزیے اور محصول تجارت کے مجموعے سے زیادہ تھا۔ زکوٰۃ اس کے تمام تجارتی سرمایے اور گھر کے زیورات اور جمع شدہ رقم پر ڈھائی فی صدی سالانہ کے حساب سے لگتی۔ بخلاف اس کے بڑے بڑے مال دار غیر مسلم کو بھی ۴۸ درہم (تقریباً سو ڈالر) سالانہ سے زیادہ جزیہ نہ دینا پڑتا تھا اور محصول تجارت میں اس کو مسلمان کی بہ نسبت

حد سے حد صرف ۵۰ فی صد زیادہ دینا ہوتا تھا۔

(۳) اس سوال کا جواب میری ابتدائی تشریح میں گزر چکا ہے۔

۵۔ اُلٹا مطلب۔

(۴ – ۵) جس مفسر کے قول کا حوالہ آپ نے دیا ہے اس کا منشا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جب تک مسلمان برسرِ اقتدار نہ ہوں وہ زبردستی اپنے دین میں لوگوں کو داخل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں البتہ جب وہ اقتدار حاصل کر لیں تو جبر کا استعمال چھوڑ دیں، بلکہ اس نے آیت کی یہ تفسیر غالباً اس مفروضے پر کی ہے کہ جبر کا سوال پیدا ہی اُس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی شخص یا گروہ کو کسی دوسرے شخص یا گروہ پر کسی نہ کسی طرح کا جابرانہ اثر و اقتدار حاصل ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ ایک غیر مقتدر آدمی سے یہ کہنا بے معنی ہے کہ تو جبر نہ کر۔ مجھے معاف کیجیے اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے اس مفسر کے قول کا جو الٹا مطلب لیا ہے وہ منطق کے لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔

۶۔ مرتد کی سزا کا مسئلہ۔

(۶) مرتد کے بارے میں اسلام کا قانون بظاہر اس آیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ آیت کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جو اسلام میں داخل نہ ہوئے ہوں۔ انہیں کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ انہیں داخل ہونے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس مرتد کے بارے میں اسلامی قانون کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جو اسلام میں داخل ہو کر پھر اس سے نکلنا چاہیں۔ ان لوگوں پر جبر کے استعمال کی اصل غرض یہ نہیں ہے کہ اُن کو دین میں رکھا جائے بلکہ یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو، جو ریاست کی بنیاد ہے، انتشار (disintegration) سے بچایا جائے اسلامی قانون جس طرح ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسلامی ریاست کے اندر رہتے ہوئے علانیہ اسلام کو چھوڑ دے، اسی طرح وہ ایک غیر مسلم ذمّی کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ریاست کے حدود میں رہتے ہوئے اس کی وفاداری سے علانیہ انکار کر دے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی ریاست بھی اپنے اجزاءِ ترکیبی کے

انتشار کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں سب ہی داخل نہ ہونے والے اور داخل ہو کر نکل جانے والے کے درمیان فرق کرتے ہیں اور دونوں کے ساتھ ایک سا معاملہ کوئی بھی نہیں کرتا۔ کیا امریکی شہریت یا برطانوی قومیت اختیار نہ کرنے والے اور اختیار کر کے چھوڑ دینے والے کی پوزیشن ایک سی ہے؟ کیا امریکی وفاق میں شامل نہ ہونے والی ریاست اور شامل ہو کر نکل جانے والی ریاست کے ساتھ آپ ایک ہی معاملہ اختیار کریں گے؟

۷۔ محکمات اور متشابہات کے معنی۔

اب دوسری آیت کو لیجیے جو آپ نے سورۂ آل عمران سے نقل کی ہے۔ اس کے متعلق جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کا جواب طلب کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ "آیات محکمات" اور "آیات متشابہات" کا مفہوم اور ان کا باہمی فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔ آیات متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں انسانی حواس سے ماوراء حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ حقیقتیں چونکہ براہِ راست انسان کے تجربے اور مشاہدے میں نہیں آئی ہیں، اور اس بنا پر انسانی زبان میں ان کے لیے ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں جو انہی کے لیے وضع کیے گئے ہوں، اس لیے لامحالہ ان کو بیان کرنے میں وہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو انسان نے دراصل محسوس اشیاء کے لیے وضع کیے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے زندگی، بینائی، سماعت، گویائی وغیرہ الفاظ کا استعمال یا اُس کے لیے عرش اور کرسی ثابت کرنا اور یہ کہنا کہ وہ آسمان میں ہے۔ یا یہ کہنا کہ وہ محبت کرتا ہے یا غضبناک ہوتا ہے۔ اس طرح کے الفاظ اور اسالیبِ بیان حقیقت کا ایک مجمل تصور تو دے سکتے ہیں، اور وہی دینا مقصود بھی ہے لیکن ان الفاظ اور بیانات کی مدد سے حقیقت کا پورا پورا تفصیلی تصور حاصل کرنا، اور اُن ماورائے حواس حقائق کی پوری پوری کیفیت اور نوعیت (nature) معلوم کر لینا بہرحال ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن ان کی تاویل کی کوشش کرنے والوں کو غلط ذہنیت کا شکار قرار دیتا ہے کیونکہ وہ الفاظ اس کے متحمل ہیں ہی نہیں کہ انسان ان کے معانی متعین کر سکے یا ان کی کوئی ایسی تعبیر کر سکے جس سے اصل حقیقت اُس کے ادراک کی گرفت میں آجائے۔

اس کے برعکس آیاتِ محکمات وہ آیات ہیں جو انسان اور کائنات سے تعلق رکھنے والے محسوس حقائق، اور تجربہ و مشاہدے میں آنے والے مسائل و معاملات سے بحث کرتی ہیں یا انسان کو وہ احکام اور ہدایات دیتی ہیں جن پر اسے عمل کرنا ہے۔ ان آیات میں چونکہ وہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو زیرِ بحث اشیاء ——— کے لیے انسانی زبان میں وضع کیے گئے ہیں، اس لیے انسان ان کی تاویل و تعبیر کر سکتا ہے۔ اُن کے معانی متعین کرنے کی کوشش ممکن بھی ہے اور جائز بھی بلکہ وہ شریعت میں مطلوب ہے، کیونکہ قرآن کے منشا کو سمجھنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ کوشش نیک نیتی کے ساتھ ہو، رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہو، اور ان معقول طریقوں کے مطابق ہو جو ضابطیں کسی کلام کا حقیقی مفہوم و مراد معلوم کرنے کے لیے (نہ کہ اس کو اپنی خواہشات اور اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے) استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد میں آپ کے بقیہ سوالات کا سلسلہ وار جواب دوں گا۔

"آیاتِ محکمات" کا غلط مفہوم۔

(۷) اس سوال کا جواب اوپر کی تشریح کے بعد غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ "آیاتِ محکمات" کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ وہ ایسی آیات ہیں "جن کی تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ اس کے برعکس قرآن مجید تو آیات متشابہات کی تاویل سے منع کرکے ان آیات کی طرف انسان کی توجہ اسی غرض کے لیے پھیرتا ہے کہ غور و فکر، اور بحث و تحقیق اور تاویل و تعبیر کی کوششوں کا صحیح رخ یہ آیات ہیں نہ کہ آیات متشابہات۔

آیاتِ محکمات کونسی ہیں۔

(۸) آیت لا اکراہ فی الدین یقیناً آیات محکمات میں سے ہے، اس لیے کہ "دین" اور "اکراہ" اور دین میں اکراہ نہ ہونا"، یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے معنی ہم لغت سے، قواعدِ زبان سے، سیاق و سباق سے، قرآن کے دوسرے بیانات سے، اور سنت، اجماع اور قیاس کی مدد سے متعین کر سکتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کی وہ تمام آیات محکم ہیں جن میں انسان سے کسی چیز کے ماننے یا کسی چیز کا انکار کرنے، یا کسی چیز پر عمل کرنے یا کسی چیز کو چھوڑ

دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ نیز وہ سب آیات محکم ہیں جو محسوس و مشہود اشیاء کا ذکر کرتی ہیں یا ان امور و مسائل سے بحث کرتی ہیں جو انسان کے تجربے میں آتے ہیں۔

تعددِ ازواج کا مسئلہ۔

(۹) اوپر کی تشریح کے بعد یہ بات آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ متشابہ نہیں بلکہ محکم ہے۔ آپ کا یہ سوال کہ "اگر یہ محکم ہے تو اس کی تعبیر میں اتنا اختلاف کیوں ہے" متعدد غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کی پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ "جو آیت محکم ہو اس میں تعبیرات کا اختلاف نہ ہونا چاہیے" اور یہ غلط فہمی آپ کو اس لیے ہوئی ہے کہ آپ محکم آیت کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ وہ سرے سے محتاج تعبیر ہی نہیں ہوتی۔ آپ کی دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ اس آیت کی تعبیر میں کچھ بہت اختلافات رونما ہوئے ہیں اور بڑے وسیع اختلافات ہیں۔ حالانکہ علماء اسلام کے درمیان ۱۳ سو برس تک اس آیت کا یہ مفہوم متفق علیہ رہا ہے کہ یہ ایک مرد کو ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی اجازت دیتی ہے، اس کے لیے بیک وقت چار کی حد مقرر کرتی ہے، اس کے لیے عدل کی شرط لگاتی ہے، اور عدل سے مراد برتاؤ اور حقوق میں عدل ہے نہ کہ دلی لگاؤ میں برابری۔ اب رہیں وہ تعبیرات جو انیسویں صدی کے آخری دور سے بعض مسلمانوں نے کرنی شروع کردی ہیں۔ اور جن کی بنا پر آپ کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی ہے کہ آیت کی تعبیر میں وسیع اختلافات رونما ہوگئے ہیں، تو میں یہ صاف کہوں گا کہ درحقیقت وہ تعبیرات نہیں بلکہ معنوی تحریفات ہیں جن کو قرآن کی جائز تفسیر کے حدود میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ یہ تعبیرات دراصل ایسے لوگوں نے کی ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ آپ لوگوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور پھر قرآن کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ ضرور وہ اسی بات کو حق کہے جسے آپ لوگ حق کہتے ہیں۔ اس طرح کسی چیز کو معنی پہنانے کی کوشش کرنا میرے نزدیک منافقت اور بے ایمانی ہے۔ میں اگر ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتا کہ اس معاملہ میں یا کسی معاملے میں بھی قرآن کا نقطۂ نظر غلط اور اہل مغرب کا نقطۂ نظر صحیح ہے تو صاف صاف قرآن کا انکار کر کے آپ حضرات کے نظریے پر ایمان لانے کا اعلان کر دیتا اور یہ کہنے میں ہرگز تامل نہ کرتا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔

یہی رویہ ہر مخلص اور راست باز آدمی کا ہونا چاہیے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ ہمارے اندر منافقین کی ہمت افزائی کرتے ہیں صرف اس لیے کہ وہ زندگی کے معاملات میں آپ کے ہم نوا ہیں۔ آپ کو ان کی ہم نوائی اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ منافقت بری نہیں معلوم ہوتی جو اس کے پیچھے کارفرما ہے۔

۱۱۔ قرآن کی تاویل میں حدیث کی اہمیت:

آپ نے اس سوال کے ضمن میں ایک اور سوال یہ چھیڑ دیا ہے کہ اگر ایک شخص کسی آیت کا مطلب صاف محسوس کر رہا ہو تو اسے حدیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ایک شخص خواہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ یہ خدا کی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، دونوں صورتوں میں اس کا یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا کہ اسے قرآن کو سمجھنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تشریح سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اگر وہ اُسے آنحضرتؐ کی تصنیف سمجھتا ہے تو اسے ماننا ہوگا کہ مصنّف نے اس کی جو تشریح بھی کی ہو وہی اس کا اصل مدعا ہے۔ اور اگر وہ اسے خدا کا کلام مانتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا ہی نے اس کی تعلیم دینے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور کیا تھا تب بھی اسے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کے کلام کا جو مفہوم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا تھا وہی اس کا مستند مفہوم ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کوئی حدیث جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہو، صحیح ہے یا نہیں اور اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کے دلائل کیا ہیں، مگر بجائے خود یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں ہم حدیث سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

۱۲۔ قرآن کی نزولی ترتیب غیر ضروری ہے۔

(۱۰) اگر ایک ہی مسئلے میں قرآن کے اندر دو مختلف حکم پائے جاتے ہوں تو بعد کا حکم پہلے حکم کا ناسخ مانا جائے گا مگر اس کے لیے سارے قرآن کو تاریخ نزول کے اعتبار سے مرتب کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ موجودہ ترتیب ہی میں مستند روایات کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسا حکم پہلے نازل ہوا تھا اور کونسا بعد میں آیا۔

۱۳۔ انفرادی تاویل کا حق۔

(۱۱) ایک اسلامی ریاست میں ہر صاحب علم قرآن کی تاویل کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے، لیکن اس کی تاویل سب مسلمانوں کے لیے قانون نہیں ہو سکتی۔ قانون وہی تاویل ہو گی جو اہل علم کے اتفاق یا کثرت رائے سے اختیار کی جائے، یا جس کے مطابق ایک عدالتِ مجاز فیصلہ دے۔ انفرادی معاملات میں انفرادی تاویل بلاشبہ ہر صاحب علم کا حق ہے، مگر اجتماعی معاملات میں انفرادی تاویل کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟

۱۴۔ قرآن کس انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔

(۱۲) "نئے عہد نامے" (New Testament) کی کتابِ اعمال تو در کنار، چاروں انجیلیں (Gospels) بھی الہامی کتابیں نہیں ہیں، نہ قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ البتہ قرآن اُس انجیل کی تصدیق کرتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ انجیل کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اُس انجیل کے منتشر اجزاء زبانی روایات کے ذریعہ سے نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں کے مصنفین کو پہنچے تھے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں مختلف مقامات پر انہیں درج کیا ہے۔ ان کتابوں میں حضرت عیسیٰؑ کی جو تقریریں اور امثال ملتی ہیں وہ اُسی انجیل کے متفرق اجزاء ہیں اور ان میں آپ مشکل ہی سے کوئی بات ایسی پائیں گے جسے قرآن کے خلاف کہا جا سکے۔

۱۵۔ تبلیغ اسلام کے لیے وجہ جواز۔

(۱۳) آپ نے قرآن کی اس آیت کا حوالہ نہیں دیا ہے جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں لیکن اگر وہ آیت سورۂ حج کی آیت نمبر ۶۷ ہے تو اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لیے اللہ نے ایک طریقہ مقرر کیا تھا اور اُس زمانے میں وہی معتبر تھا۔ اسی طرح اب اس دور کے لوگوں کے لیے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ایک طریقہ مقرر کیا ہے اور اس دور میں یہی معتبر (valid) ہے یہ ہے اس بات کی وجہِ جواز کہ مسلمان اہل کتاب سمیت تمام غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی

دعوت دیں۔

۱۶۔ قرآن فہمی میں علوم طبیعی کی واقفیت کا مقام۔

(۱۴) اس میں شک نہیں کہ انسان کا علم دنیا اور اس کے حقائق کے متعلق جتنا زیادہ بڑھے گا، اس کو قرآن میں اتنی ہی زیادہ بصیرت حاصل ہوگی لیکن اس سے نہ تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے براہ راست شاگردوں سے بھی زیادہ قرآن کو سمجھنے لگے گا، اور نہ یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جو شخص بھی علم ہیئت، طبعیات اور کیمیا وغیرہ کے ذریعہ سے دنیا کا خوب علم حاصل کرے وہ لازماً قرآن کا بہتر سمجھنے والا قرار پائے۔ قرآن کے صحیح فہم کے لیے ہر چیز سے مقدم یہ شرط ہے کہ آدمی اُس کو خدا کی کتاب مانے، اس کو سرچشمہ ہدایت تسلیم کرے، اُن ضروری علوم سے واقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لیے درکار ہیں، اور پھر اپنا کافی وقت قرآن اور اسلامی نظام فکر و حیات پر غور و فکر کرنے میں صرف کرے لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ اُس پیغمبر سے بھی بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا ہے جسے خود خدا نے اپنی کتاب کی تعلیم دینے کے لیے مقرر کیا تھا (یا جو آپ لوگوں کے نزدیک خود اس کتاب کا مصنف تھا)

۱۷۔ قرآن کن کتب مقدسہ کی تصدیق کرتا ہے۔

(۱۵) قرآن مجید جن کتابوں کی تصدیق کرتا ہے وہ "پرانا عہد نامہ" اور "نیا عہد نامہ" نہیں ہیں بلکہ توراۃ، زبور اور انجیل ہیں۔ توراۃ کو یہودیوں نے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے نہیں رکھا بلکہ اُس کے مختلف اجزاء پرانے عہد نامہ کی پہلی پانچ کتابوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اندر شامل (incorporate) کر دیے۔ آپ ان کتابوں میں سے اُس توراۃ کے اجزاء کو اس علامت کی مدد سے چھانٹ سکتے ہیں کہ جہاں جہاں کوئی عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے کہ خداوند نے موسیٰ سے یہ کہا، یا خداوند نے یہ حکم دیا یا موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے یہ تقریر کی وہاں غالباً اس توراۃ کا کوئی جز نقل کیا گیا ہے۔ یہی صورت زبور کی بھی ہے کہ پرانے عہد نامے کی پوری کتاب "زبور" (Psalms) نہیں بلکہ صرف زبور داؤد (Psalms of David) کی

قرآن نے تصدیق کی ہے اور اس کے اجزا[1] کتاب زبور میں شامل پائے جاتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ انجیل کا بھی ہے کہ اس کو پیروان مسیح علیہ السلام نے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے محفوظ نہ رکھا بلکہ مسیح علیہ السلام کے سوانح نگاروں (متی، مرقس، لوقا، یوحنا وغیرہم) نے اپنی اپنی کتابوں میں اس کے وہ حصے درج کر دیے ہیں جو ان کو زبانی روایات کے ذریعے سے پہنچے تھے اور انہیں اس علامت کی مدد سے چھانٹا جا سکتا ہے کہ مسیح نے یوں کہا یا مسیح نے یہ تمثیل دی، یا لوگوں کو خطاب کر کے یہ وعظ کیا۔ آپ میری اس نشاندہی پر پرانے اور نئے عہد نامے میں تورات، زبور اور انجیل کے ان اجزاء کو چھانٹ لیں اور پھر قرآن کا ان سے مقابلہ کر کے دیکھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے، اور جو تھوڑا سا اختلاف ہے اس کی بھی یہ معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ قرآن اپنے اصل الفاظ میں ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تینوں کتابیں مستقل کتابوں کی حیثیت سے موجود تھیں یا نہیں، لیکن کم از کم تورات کے متعلق یہ بات خود پرانے عہد نامے کے بیانات سے بھی[2] اور ہمارے ہاں کی احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کے ہاں ہر ایک مدت تک ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے پائی جاتی تھی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کا ایک نسخہ مدینے کے یہودیوں کے پاس موجود تھا۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

---

[1] اگر اس امر میں کسی کو شک ہو کہ یہ کتابیں اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہیں یا نہیں، تو وہ مثال کے طور پر صرف پہاڑی کے وعظ کی عبارات متی اور لوقا کی انجیلوں میں نکال کر دیکھ لے۔ دونوں روایتوں میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کی موجودگی میں مشکل ہی سے وحی کے اصل الفاظ محفوظ ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

[2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ۲ سلاطین باب ۲۲-۲۳۔

حکمتِ قرآنی اور اصلاحِ تمدن

ایک صاحب سوال کرتے ہیں:-

"سورۂ آل عمران میں تیرھویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک جنگ احد پر مسلسل تبصرہ کیا گیا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ تیرھویں رکوع میں جنگ احد پر تمہیدی تقریر ابھی شروع ہی کی گئی تھی کہ یکایک بیچ میں سود کی حرمت کا ذکر آگیا چنانچہ چودھویں رکوع کا بیشتر حصہ اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد آیت وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ سے پھر جنگ احد پر کلام شروع کیا گیا ہے۔ اس موقع پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا اپنے ماقبل اور مابعد سے کیا ربط ہے؟ ایک جنگ کے واقعات پر کلام کرتے ہوئے بیچ میں یہ بحث آخر کس تعلق سے چھیڑ دی گئی؟

(۲) اس موقع پر خاص طور سے سود در سود یا بڑھا چڑھا کر سود لینے کو منع و تحریم کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟

جواب:- جو لوگ قرآن مجید کی تعلیمات کو مدبرانہ اور محققانہ انداز میں سمجھنے کا شوق رکھتے ہوں ان کے لیے منجملہ دوسرے امور کے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کے تاریخی پس منظر

(Historical background) کو سامنے رکھیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ آیات کا باہمی ربط سمجھنا انکے لیے آسان ہوگا، بلکہ وہ اس حکمت تشریع کو بھی سمجھ سکینگے جسے احکام کے تدریجی ارتقاء میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، قرآن مجید نے ابتدا ہی میں ان کا صاف صاف بے کم وکاست اعلان کر دیا تھا، اور آخر وقت تک ان میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا۔ یہ کہ مخلوقات کا اِلٓہ بجز اللہ وحدہ لاشریک لہ کے اور کوئی نہیں، یہ کہ عبادت اور استعانت اس ایک اِلٓہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، یہ کہ ہر ہر انسان اسی ایک حاکم اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہے اور بالآخر اپنے پورے کارنامۂ حیات کے ساتھ اس کی عدالت میں پیش ہونے والا ہے، یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوع انسانی کی طرف اللہ کے رسول ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے اور صراطِ مستقیم بجز "اسلام" کے اور کوئی نہیں، یہ تمام باتیں دعوتِ محمدی صلعم کی ابتدا میں جس طرح کہی گئی تھیں اسی طرح آخر وقت تک کہی جاتی رہیں۔ ان میں کوئی ارتقا نہیں۔ جو دعویٰ اول دن کیا گیا تھا وہی آخر تک قائم رہا۔ فرق جو کچھ ہوا وہ صرف اتنا تھا کہ کبھی اسے تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا اور کبھی اختصار کے ساتھ۔

بخلاف اسکے تمدنی اصلاح (Social reform) کے باب میں قرآن نے تدریج کو ملحوظ رکھا ہے۔ ابتدا میں تمام تر زور ایمان کو مستحکم کرنے پر صرف کیا گیا، اور اسکے ساتھ مدنیت صالحہ کے وہ اصول ذہن نشین کرائے جاتے رہے جن پر آگے چل کر نئی تہذیب کی عمارت تیار کرنی تھی۔ مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تمام تر انہی دو باتوں تک محدود تھا۔ اسکے بعد مدینہ میں جب عملاً نئی تہذیب کی تعمیر شروع کی گئی، اور وقت آیا کہ مدنیت صالحہ کے ان مجرد اصولوں (Abstract principles) کو جنہیں مکہ میں پیش کیا گیا تھا متعین صورت (Concrete form) میں اجتماعی زندگی کے اندر

نافذ کیا جائے، تو اس کام میں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیا گیا کہ پورے اصلاحی پروگرام کو یکلخت عملی جامہ پہنا دیا جاتا، بلکہ تدریجی عمل کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ نئی سوسائٹی جیسے جیسے بنتی گئی، جیسے جیسے مواقع پیش آتے گئے، ان کے لیے قانون بنایا جاتا رہا۔ پھر نئے اصلاحی قدم کے لیے آمادگی نفس کے موقع (Psychological moment) کا انتظار کیا جاتا، اور جب وہ موقع آتا تو ایسے مؤثر انداز میں حکم سنایا جاتا کہ سیدھا دلوں کی تہوں میں اتر جاتا اور وہاں سے کامل اطاعت بن کر عملی دنیا میں نمودار ہوتا۔

تمدن کی اصلاح کے لیے قرآن کے پیش نظر جو پروگرام تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ معاشی معاملات میں سے سود کے عنصر کو بالکلیہ خارج کر دیا جائے، اور اس کی جگہ انسان اور انسان کے معاشی تعلقات کو فیاضی، فراخدلی اور امداد باہمی کی روح پر قائم کیا جائے۔ اس دفعہ کو نافذ کرنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ مکہ معظمہ میں سود کی حرمت کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا، بلکہ محض اس نئے معاشی نظریہ کو پیش کرنے اور دماغوں میں اتارنے کی کوشش کی گئی کہ انفرادی سرمایہ داری (Individualistic capitalism) اگر خود غرضی اور تنگ نظری پر مبنی ہو — جو سود خواری کی اصلی بنیاد ہے — تو اس کا نتیجہ اجتماعی نقصان ہے، اور جو فرد یہ جماعت دشمنی کا (Anti-social) شیوہ اختیار کرتا ہے وہ اگرچہ بظاہر پھلتا پھولتا نظر آتا ہے، مگر آخرکار دنیا اور آخرت دونوں میں اپنی بربادی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ بخلاف اسکے اگر اسی انفرادی سرمایہ داری کی بنیاد جماعتی حقوق کے صحیح احساس پر مبنی ہو تو اس سے بظاہر فرد کی دولت گھٹتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ بڑھتی ہے، کیونکہ جو فرد اجتماعی خوشحالی میں مددگار بنتا ہے وہ نتیجۃً دنیا میں بھی اپنی دولت بڑھاتا ہے اور آخرت میں بھی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ	کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ جسکو چاہتا ہے فراخی کیساتھ رزق دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے تنگ دیتا ہے۔ یقیناً اس میں ایمان لانے

فِی ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ	والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ لہذا تو
فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ	اپنے رشتہ دار کو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق
وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ	دے۔ یہ فعل ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ
یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓىٕكَ هُمُ	کی خوشنودی چاہتے ہیں اور یا آخر وہی فلاح پانے
الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا	والے ہیں۔ اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ بعض لوگوں کا
فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ	کے مال میں بڑھوتری ہو تو اللہ کے نزدیک تو اس
وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ	سے مال نہیں بڑھتا۔ البتہ مال ان کا بڑھتا ہے
اللّٰهِ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم۔۴)	جو خدا کی خوشنودی کے لیے زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مکی معاشرہ کی زندگی میں اُس نئی معاشی پالیسی کے لیے جسے آگے چل کر نافذ کرنا تھا، دوسرے پہلوؤں سے بھی زمین تیار کی جاتی رہی۔ انسان کی حقیقی ضروریات سے جو دولت بچ جائے اسے جمع کرنے کی سخت مذمت کی گئی کیونکہ خودغرضانہ سرمایہ داری کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی ہے۔ بخلاف اسکے ایک طرف تجارتی کاروبار کی ہمت افزائی کی گئی اور دوسری طرف باربار یہ امر ذہن نشین کیا گیا کہ جو کچھ تم کماؤ اس میں تمہاری جماعت کے کم نصیب افراد کا حق ہے۔ وَفِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔

اتنا کام مکی معاشرہ میں کیا جا چکا تھا۔ اسکے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر جب نئی اجتماعی زندگی کی بنا رکھی گئی تو اس معاشی پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کیا جانے لگا۔

ہجرت کے تیسرے سال جب جنگ احد واقع ہوئی تو وہ موقع آ گیا۔ جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کا اصل سبب مال کا لالچ تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور اپنی ڈیوٹی سے ہٹ کر جماعت کے وجود کو خطرے میں ڈالا۔ جیسا کہ تاریخ

پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں، غزوۂ احد میں آنحضرت صلعم نے تین ہزار مشرکین کے بالمقابل اپنی سات سو کی مختصر جمعیت کو بہترین جنگی موقف (Strategical position) پر رکھا تھا، یعنی احد کی پہاڑی آپ کی پشت پر تھی اور دشمن کے لیے گھیراؤ ڈالنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ احد کی جانب سے مشرکین کے لیے عقبی حملہ کرنے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر حضورؐ نے عبداللہ بن جبیر کے تحت ۵۰ تیر اندازوں کا ایک مضبوط دستہ بٹھادیا تھا تاکہ اگر دشمن اس طرف سے حملہ کرنا چاہے تو یہ دستہ دور ہی سے اس کو تیروں پر رکھ لے۔ اس جنگی نقشہ کی کامیابی کا تمام تر دارومدار اسی پر تھا کہ تیر اندازوں کا یہ دستہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کو سخت تاکیدی حکم دیا کہ "اگر ہمیں شکست ہو اور تم دیکھو کہ شکاری پرندے ہمیں اُچکے لیے جا رہے ہیں تب بھی ہماری مدد کو نہ آنا، اور اگر ہم فتحیاب ہوں اور تم دیکھو کہ دنیا کی دولت لُٹ رہی ہے تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا"۔ لیکن جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور بہادرانِ اسلام نے مار مار کر مشرکین کے منہ پھیر دیے اور شکست خوردہ دشمن کے لشکر میں لوٹ شروع ہوئی تو تیر اندازوں کی یہ جماعت اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ پچاس میں سے ۴۰ آدمی اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت پر جا گرے، اور مشرکین کو موقع مل گیا کہ پشت کے درے کی طرف سے حملہ کر کے مسلمانوں کو گھیر لیں۔ اسی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فتح شکست سے بدل گئی، ان کے بہترین آدمی شہید ہوئے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے، اور ایسا سخت وقت آگیا کہ اگر مشرکین کی عقل نہ ماری گئی ہوتی اور وہ بلا کسی معقول وجہ کے خود بخود پسپا نہ ہو گئے ہوتے تو مدینہ کی بھی خیر نہ تھی۔

یہ تھا وہ نفسیاتی موقع جس کو معاشی اصلاح کا پہلا قدم اٹھانے کے لیے چن لیا گیا۔ احد سے واپس مدینہ پہنچتے ہی سورۂ آل عمران کی وہ آیات نازل ہوئیں جن کا ذکر سائل نے اپنے سوال میں کیا ہے۔ ان آیات میں غزوۂ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے شکست کا اصلی سبب جو مشخص کیا گیا

ہے وہ یہی ہے کہ تم میں سے بہت سے لوگ مال کی محبت میں مبتلا ہیں اور یہ زر پرستی تمہیں نافرمانی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ نیز یہ کہ تم میں صبر و تقویٰ کی جگہ وہن اور فشل (ضعف) پایا جاتا ہے، جو نتیجہ ہے حب دنیا کا۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰىٓ اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ

اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تھا یعنی یہ کہ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں فتح ہو گی چنانچہ جنگ کے ابتدائی حصہ میں) تم ہی ان کو مار رہے تھے۔ مگر جب اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی جو تمہیں محبوب ہے۔ (یعنی مال غنیمت) اور اسے دیکھ کر تم میں کمزوری آگئی اور تم نے (اپنے امیر عبداللہ بن جبیرؓ سے) حکم میں جھگڑا کیا اور (رسول کی) نافرمانی کی (تو وہ وعدہ ختم ہو گیا)۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے ہیں اور بعض آخرت۔ پس اللہ نے تم کو کفار کے مقابلے سے پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔

جب شکست کا اصل سبب یہ تشخیص ہوا تو اس کا علاج بھی یہی تجویز ہونا چاہیے تھا کہ دلوں میں مال کی محبت کا سرچشمہ جس جگہ واقع ہے اس پر حملہ کیا جائے چنانچہ ٹھیک اسی مقام پر انگلی رکھ دی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

اے ایمان والو! بہت بڑھا چڑھا کر سود نہ کھایا کرو۔ اور اللہ سے ڈرو کہ اسی طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

مطلب یہ ہوا کہ یہ مال کی محبت جو تمہارے دلوں میں جائز فطری حد سے بڑھ گئی ہے اور جس کی وجہ سے تمہاری روح میں کمزوری پیدا ہو گئی ہے، اسکے بڑھنے کا سبب یہ ہے کہ

تم مدتوں سے سود خواری کے خوگر ہو جس نے تمہارے قلب کے ریشہ ریشہ میں مال کی محبت پیوست کر دی ہے۔ تم جب اپنے کسی حاجت مند بھائی کو کچھ مال دیتے ہو تو ایک ایک دن گن کر اُس پر اپنے فائدے کا حساب لگاتے چلے جاتے ہو۔ اس عادت اور خصلت سے بڑھ کر اور کونسی چیز عشقِ زر کی بیماری پیدا کرنے والی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ کم از کم سود در سود اور ہر سال بڑھتا چڑھتا سود[1] تو آج ہی سے چھوڑ دو۔

یہ محض مشورہ نہ تھا بلکہ حکم تھا اور ایسا سخت تاکیدی حکم تھا کہ اس کے بعد ہی وہ تہدیدی فقرہ ارشاد ہوا جسے سن کر سارے مسلمان کانپ اٹھے۔ فرمایا؛

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔	ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

مسلمان، اور اُس آگ میں ڈالا جائے جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہو! اس سے بڑھ کر ایک سچے مسلمان کے لیے خوفناک بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ ڈراونی آیت ہے، کیونکہ اس میں مسلمان کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اس نے اللہ کی حرام کی ہوئی چیز سے پرہیز نہ کیا تو اسے وہ سزا دی جائیگی جو کافروں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ عشقِ مال اور بندگیِ زر کی جگہ مسلمان میں کیا صفات ہونی چاہئیں، اور وہ تقویٰ کیا ہے جس کے متعلق ہم نے تم سے[2] وعدہ کیا تھا کہ "اگر تم میں صبر اور تقویٰ ہو تو ہم

---

[1] اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۔ سود کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کو مثلاً ایک سال کے وعدے پر روپیہ قرض دیا اور ساتھ ایک شرح سود مقرر ہو گئی۔ دوسرے سال کے آغاز میں اگر قرض ادا نہ ہوا تو پھر ایک سال کی مہلت دی اور شرح سود بھی بڑھا دی گئی۔ اس طرح ہر سال شرح سود میں اضافہ کیا جاتا رہتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کوئی مدت تک اگر سود نہ ادا ہوتا تو سود کی رقم کو اصل میں شامل کر کے اس پر پھر سود لگا دیا جاتا۔

تمہاری مدد کریںگے"

وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ وَسَارِعُوا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

اور اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائیگا۔ اور دوڑو اپنے رب کے دامن رحمت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کی وسعتوں جیسا ہے، جو متقیوں کے لیے مہیا کی گئی ہے (کون متقی ؟) وہ جو تنگ حالی اور خوش حالی، دونوں حالتوں میں (اپنے مقدور بھر راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور انسانوں کے قصور معاف کردیتے ہیں۔ ایسے ہی محسنوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ (اور متقی کون ؟) وہ جو کبھی اگر کوئی برا کام یا اپنے نفس پر ظلم (یعنی گناہ) کرتے بھی ہیں تو فوراً انہیں خدا کا خیال آجاتا ہے جس کے اثر سے وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کا معاف کرنے والا ہو؟ (یہ متقی) اپنے فعل پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتادیا کہ اگر مشرکین اور کفار کے مقابلہ میں غلبہ اور فتح چاہتے ہو تو اپنے اندر سے دنیا طلبی، زرپرستی، نفسانی خواہشات کی بندگی نکال ڈالو اور انکی جگہ یہ ایجابی (Positive) خوبیاں پیدا کرو۔ تاکہ تمہارا اخلاقی مرتبہ ان سے بلند ہوجائے اور تم زمین پر خدا کی نیابت کے اہل بن جاؤ۔ ورنہ اگر تم بھی اخلاقی حیثیت سے ویسے ہی رہے جیسے

کفار و مشرکین ہیں، تو آخر تم سے اللہ کا کیا رشتہ ہے، اور کفار قریش سے کیا دشمنی ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں تمہاری نصرت و حمایت کرے؟

دیکھیے! یہاں قرآنی حکمت (Wisdom) اور انسانی حکمت کا فرق کیسا حیرت انگیز ہے۔ اگر کوئی انسان، جسکی نگاہ محض اسباب دنیا پر ہوتی، جنگ احد کے حالات پر نگاہ ڈالتا اور مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب کی تشخیص کرتا، تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتا کہ کفار کی مالی حالت بہت اچھی تھی، قریش کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل اور مدینہ کے یہودی سرمایہ داران کی پشت پر تھے، انکے پاس دوسو سواروں کا رسالہ تھا، انکے بیشتر آدمی زرہ پوش تھے، ان کے اسلحہ زیادہ اچھے تھے۔ برعکس اسکے مسلمان صرف پچاس سواروں کا رسالہ لا سکے تھے! ان کے پاس بمشکل ۱۰۰ آدمی زرہ پوش تھے۔ انکی بے سروسامانی کا حال یہ تھا کہ اپنے مقتولوں کی تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہ کر سکے تھے۔ اس وجہ سے کفار کا پلہ بھاری رہا اور مسلمانوں نے نقصان اٹھایا۔ کمزوری کا یہ سبب تشخیص کرنے کے بعد وہ اگر کوئی علاج تجویز کرتا تو یہ کرتا کہ مسلمانوں کو اپنی مالی حالت درست کرنی چاہیے۔ جو لوگ ان میں سود نہیں کھاتے انہیں بھی سود خواری شروع کر دینی چاہیے۔ شرح سود پہلے سے زیادہ بڑھا دینی چاہیے۔ غرض ہر ممکن طریقہ سے اپنی جماعت کی دولت میں اضافہ کرنا چاہیے۔ مگر خدائی حکمت ملاحظہ ہو کہ کمزوری کا سبب مال کی کمی کو نہیں بلکہ مال کی محبت کو ٹھیرایا جاتا ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس عشق مال کی بیماری کو دور کرنے کے لیے شرح سود میں تو فوراً تخفیف کرنی چاہیے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مرحلہ پر صرف شرح سود (Rate of interest) کی تخفیف پر کیوں کتفا کیا گیا، سود کو قطعی بند کیوں نہ کر دیا گیا؟ تو اس کا جواب وہی ہے جسکی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اسلام محض اخلاقی اصول بیان

کرنے والی حکمت ہی نہیں ہے بلکہ زندگی میں عملاً اپنے اصولوں کو نافذ کرنے والا تدبر Statesmanship) بھی ہے ۔ ایک ملک کے معاشی نظام کو یکایک بدل ڈالنا کسی طرح ممکن نہیں ۔ اگر جبر اور خونریزی سے اسکی کوشش بھی کی جائے تب بھی سابق نظام کے اثرات فوراً نہیں مٹ سکتے ۔ اسلیے اسلام نے اپنی جدید معاشی پالیسی پر رفتہ رفتہ عمل کیا ۔ سنہ ہجری میں جیساکہ ابھی بیان ہوا ، جنگ احد کے بعد پہلا قدم شرح سود کی تخفیف کی صورت میں اٹھایا گیا ۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ اور اجناس کے کاروبار میں سٹہ (Speculation) کو روکا اور ایک ہی جنس کی چیزوں کے مبادلہ میں کمی وبیشی کو سود قرار دیا ۔ اس کے بعد آپنے مبادلۂ زر (Exchange) کی طرف توجہ فرمائی اور سونے چاندی بصورت جنس (Bullion) یا بصورت زر (Money) دونوں کے مبادلہ میں ناجائز نفع بازی (Profiteering) کا دروازہ بند کردیا ۔ آخری ضرب اور فیصلہ کن ضرب فتح مکہ کے بعد لگائی گئی جبکہ قریب قریب پورا عرب اسلام کا سیاسی اقتدار قبول کرچکا تھا ۔ اس وقت پورے زور کے ساتھ حکم دیا گیا کہ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا " اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کردیا ہے " اِتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا " اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود تمہارا لوگوں کے ذمہ باقی ہے اسے چھوڑ دو " فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ " اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو خدا اور اسکے رسول کی طرف سے تمہارے ساتھ اعلان جنگ ہے " اُس وقت اسلام یہ طاقت رکھتا تھا کہ بزور سود کو بند کردے اور پورے ملک کے معاشی معاملات کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرے ، اس لیے اس نے نہ صرف تحریم سود کا اعلان کیا بلکہ اس اعلان کو بجبر منوا کر چھوڑا ۔ سودی معاملات کرنے والے قبائل کو دھمکی دی گئی کہ اس کاروبار کو نہ چھوڑوگے تو تم پر چڑھائی کی جائیگی ۔ نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا گیا کہ سودی کاروبار بند کردیں ورنہ اسلامی حکومت انکی حفاظت سے بری الذمہ ہے ۔ ترجمان القرآن اگست ۱۹۳۹ء

توحید اور شرک

ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات بے حد و حساب ہیں جن کا کوئی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بلاشبہ اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہم کو خالص توحید اور بے آمیز توحید کی تعلیم دی، جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کسی دوسرے کی ادنیٰ سے ادنیٰ شرکت کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں ہے اور تمام حیثیتوں سے خدائی صرف ایک معبودِ برحق کے لیے مخصوص ہے۔ یہ کتنی بڑی نعمت ہے، اس کی صحیح قدر آپ صرف اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب توحید اور شرک کے فرق کو خوبی سمجھ لیں۔

عالم انسانی اور شرک۔

شرک کا لازمی خاصہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کو بانٹتا اور انسانوں کو انسانوں سے پھاڑتا ہے پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جو یہ شہادت دیتی ہو کہ تمام دنیا کے مشرکین کسی ایک معبود پر، یا چند معبودوں پر کبھی جمع ہوئے ہوں۔ ساری دنیا تو درکنار زمین کے کسی ایک خطے میں بسنے والے مشرک بھی کسی معبود یا معبودوں کے کسی گروہ پر متفق نہیں پائے گئے۔ قبیلوں اور قبیلوں کے معبود الگ رہے ہیں اور یہ جدا جدا معبود بھی ہمیشہ نہیں رہے بلکہ زمانے کی ہر گردش کے ساتھ بدلتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح شرک کبھی کسی دور میں انسانیت کو جمع کرنے والی طاقت نہیں رہا بلکہ ایک تفرقہ پرداز طاقت رہا ہے اور وہ صرف عقیدے ہی کے اعتبار سے انسانوں کو ایک دوسرے سے نہیں پھاڑتا، اس کی فطرت چونکہ متحد کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ اس لیے جو تفرقے اس کی بدولت پیدا ہوتے ہیں وہ رفتہ رفتہ انسانوں میں، قوموں اور قبیلوں اور نسلوں اور زبانوں اور رنگوں اور وطنوں کے اختلافات ابھار

دیتے ہیں۔ پھر یہی اختلافات آگے بڑھ کر لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حق مارنے اور ایک دوسرے پر ظلم ڈھانے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار انہی کی بدولت دنیا میں خونریزیاں ہوتی ہیں، قتل وغارت کا بازار گرم ہوتا ہے، لڑائیاں ہوتی ہیں، اور شروفساد سے خدا کی زمین بھر جاتی ہے۔ آج تک جتنی لڑائیاں بھی انسانوں اور انسانوں کے درمیان ہوئی ہیں، آپ ان کے اسباب کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے پیچھے شرک اپنی کسی نہ کسی صورت میں کارفرما رہا ہے، یا اس کی پیدا کردہ خباثتوں میں سے کوئی خباثت ان کی محرک ہوئی ہے۔

توحیدِ الٰہ کا انعام توحیدِ اُمت۔

اس کے برعکس توحید، اگر شرک کی آمیزش سے پاک ہو، تو اس کا لازمی خاصہ انسانیت کو بانٹنے اور انسانوں کو انسانوں سے پھاڑنے کے بجائے، ان کو باہم جوڑنا اور ایک رب العالمین کی بندگی واطاعت پر جمع اور متحد کرتا ہے۔ جتنے لوگ بھی مخلوقات کی خدائی کے ہر تصور سے اپنے ذہن کو پاک کرکے صرف ایک خدا کو معبود برحق مان لیں گے، اور خداوندِ عالم کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کسی چیز میں بھی کسی مخلوق کی شرکت کے باطل کے خیال کو اپنے دل ودماغ کے ہر گوشے سے نکال باہر کریں گے، وہ لازماً ایک امت بنیں گے۔ یقیناً ان میں وحدت پیدا ہوگی۔ ضرور وہ ایک دوسرے کے رفیق اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں گے۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک اللہ کی وحدانیت کے سوا کوئی دوسری چیز انسانوں کو جمع کرنے والی پائی گئی ہو۔ اگر انسان جمع ہو سکتے ہیں تو صرف اس ایک معبود پر جو حقیقتاً ساری کائنات کا معبود ہے۔ اسی کے ماننے پر ان کے اندر اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور اسی کی بندگی پر اتفاق انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا سکتا ہے۔ توحید الٰہ کا نتیجہ توحید امت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی ہے نہ غلط ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر کبھی کسی جگہ آپ دیکھیں کہ توحید پر ایمان کا دعویٰ تو موجود

ہے لیکن اس دعویٰ کرنے والی امت میں وحدت موجود نہیں ہے۔ بلکہ الٹے تفرقے اور تعصبات اور باہمی نفرت و مخالفت کے فتنے برپا ہیں تو چشم بصیرت سے ان کا جائزہ لے کر آپ بآسانی معلوم کرلیں گے کہ اس امت میں شرک گھس آیا ہے اور اسی کے بے شمار شاخسانوں میں سے کوئی نہ کوئی شاخسانہ اس کے افراد اور گروہوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ رہا ہے۔ یہ بات نہ ہو تو جس طرح دو اور دو پانچ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح شرک کی آمیزش کے بغیر ایک خدا کو ماننے والے دس متحارب گروہوں میں بٹ نہیں سکتے۔

اب دیکھیے کہ تمام انسانوں کو ہر زمانے اور ہر دور میں ایک امت کے اندر جمع کرنے کے لیے توحید کی بنیاد فراہم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس وحدت کو دائم و قائم رکھنے کے لیے مزید کیا اہتمام فرمایا ہے۔

انسان کے لئے خدائی رہنمائی۔

اس نے ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیج کر اور ایک کتاب نازل کر کے انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کے لیے ایک ایسی رہنمائی عطا فرما دی جس سے باہر جا کر انسان کو کہیں اور ہدایت تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایک امت میں جمع ہو جانے کے بعد انسان اگر متفرق ہو سکتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ان کو کسی ایک ماخذ سے پورا انتظامِ زندگی نہ ملے اور وہ مختلف حالات، مختلف مقامات اور مختلف زمانوں میں دوسرے ذرائع سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہوں۔ ایسی صورت میں تو بلاشبہ انسان ہدایت کے لیے بہت سے ذرائع کی طرف رجوع کریں گے اور اس سے لازماً ان کے اندر تفرقہ برپا ہوگا۔ لیکن جب ہر زمان و مکان کے لیے ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ذریعے سے ہدایت مل جائے تو وحدتِ معبود پہ جمع ہونے والی امت کے لیے تفرقے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اِلّا یہ کہ لوگ یا تو جہالت کی بنا پر اس کی ہدایت سے واقف ہی نہ ہوں، یا پھر ذہن و فکر کی کجی کے باعث اصل ہدایت میں اپنی طرف سے کچھ گھٹائیں اور کچھ بڑھائیں اور اس طرح کی کمی و بیشی کرنے والا ہر گروہ

یہ دعویٰ کرے کہ اس کا تیار کردہ دین ہی اصل دین ہے جس کی پیروی نہ کرنے والا گمراہ یا فاسق یا کافر ہے۔

جوابدہی! صرف خالق برحق کے سامنے۔

دوسری اہم چیز جو وحدتِ امت کے استحکام اور راہِ راست پر اس کے ثابت قدم رہنے کے لیے فراہم کی گئی ہے وہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان صرف ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ وہی ایک خدا دنیا میں بھی اس کی قسمت بنانے اور بگاڑنے کے مکمل اختیارات رکھتا ہے اور وہی ایک خدا روزِ جزا کا بھی مالک ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی انسانوں کے اعمال کی باز پُرس کرنے والا، نہ کسی کے ہاتھ میں سزا یا جزا دینے کے اختیارات ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ عقیدہ نہ صرف وحدتِ امت کا ضامن ہے بلکہ اسی پر انسانی سیرت و کردار کے راست و درست رہنے کا انحصار ہے۔ اس عقیدے کے ان لازمی نتائج کو ضائع کرکے اگر کوئی چیز انسانوں کو پراگندہ اور بے راہرو بنانے والی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگ دنیا میں خدا کے سوا دوسری مختلف ہستیوں کو حاجت روا قرار دینے لگیں اور آخرت کے بارے میں یہ سمجھنے لگیں کہ وہاں خدا کے انصاف میں مداخلت کرنے کے اختیارات کچھ دوسری ہستیوں کو حاصل ہوں گے۔

وحدت کا عظیم ترین منظر۔

اس کے بعد دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی چیزیں ہم پر لازم کی ہیں۔ جو وحدتِ امت کو عملاً قائم اور دائماً سرگرم رکھنے والی ہیں۔ ان میں اولین چیز نماز ہے جو روزانہ پانچ وقت کے لیے دنیا بھر کے مسلمانوں پر فرض کر دی گئی ہے۔ اس کے لیے ایک قبلہ مقرر ہے جس کی طرف ہر نماز کے وقت مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب، اور ان مختلف سمتوں کے درمیان رہنے والے سب مسلمانوں کو رُخ کرنا ہوتا ہے۔ اس نقشے کو ذرا چشمِ تصور کے سامنے لا کر تو دیکھیے کہ خانۂ کعبہ ایک مرکز ہے اور تمام روئے زمین کے مسلمان اسی ایک مرکز کی طرف رُخ کیے ہوئے قیام و قعود اور رکوع و سجود کر رہے ہیں۔ ہر نماز کے وقت یہ دائرہ حرم پاک سے شروع ہوتا ہے۔

جہاں خانہ کعبہ کے گرد نماز پڑھنے والے تمام لوگ ایک ہالہ بنے ہوتے نظر آتے ہیں، اور پھر یہی دائرہ پھیلتے پھیلتے تمام روئے زمین پر محیط ہو جاتا ہے۔ یہ روزانہ پانچ وقت کا عمل ہے۔ اس سے بڑھ کر وحدت کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اسلام کے سوا یہ مظاہرہ آپ اور کہاں پاتے ہیں۔

اس پنج وقتہ نماز کو فرض کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے جماعت کے ساتھ ادا کرنا لازم کیا ہے، الا یہ کہ کوئی مسلمان اپنی جگہ تنہا ہو اور اسے جماعت نہ مل رہی ہو۔ اللہ کی عبادت کا مقصد تو فرداً فرداً نماز پڑھنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا، مگر وحدتِ امت کا مقصد نماز با جماعت کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ اسی لیے لازم کیا گیا کہ جہاں دو مسلمان بھی موجود ہوں وہاں ایک امام اور دوسرا مقتدی بنے اور دونوں مل کر باجماعت نماز ادا کریں۔

خدا پرستوں کی عالمگیر برادری۔

نماز کے لئے لوگوں کو بلانے کا طریقہ بھی اسلام میں ایسا بے نظیر مقرر کیا گیا ہے جو دنیا کے کسی مذہبی یا لا مذہب گروہ کو اپنے کسی اجتماع کی دعوت دینے کے لیے میسر نہیں ہے۔ نماز کا بلاوا دینے کے لیے روئے زمین پر ہر جگہ ہر روز پانچوں وقت ایک ہی زبان میں اذان کی آواز بلند کی جاتی ہے، قطع نظر اس سے کہ بلانے والوں اور بلائے جانے والوں کی اپنی زبان خواہ کچھ بھی ہو۔ اس مشترک زبان کی اذان دنیا میں جہاں بھی بلند ہو گی اسے سننے والا ہر مسلمان جان لے گا کہ یہ نماز کا بلاوا ہے اور فلاں مقام سے بلند ہو رہا ہے۔ جہاں مجھے اپنے برادرانِ ملت کے ساتھ جمع ہو کر خدائے واحد کی عبادت بجالانی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ اذان صرف نماز کا بلاوا ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کے پورے عقیدے کا اعلان بھی ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ اور میری فلاح اسی ایک خدا کی عبادت سے وابستہ ہے جس کی طرف آنے کے لیے مجھے پکارا جا رہا ہے۔ کیا اس سے بہتر طریقِ دعوت کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے؟ یہ دعوت

دنیا میں ہر جگہ لوگوں کو نماز کے لیے جمع بھی کرتی ہے اور ایک ہی عقیدے پر متفق بھی۔

نماز۔

پھر نماز کے اوقات، اس کو ادا کرنے کے طریقے اور اس میں پڑھی جانے والی چیزیں تمام دنیا میں یکساں ہیں بعض جزوی چیزوں میں اگر کچھ فرق ہے بھی تو وہ ایسا نہیں ہے کہ جنوبی افریقہ کا مسلمان شمالی امریکہ میں یا جاپان کا مسلمان مراکو یا فرانس میں جاکر یہ محسوس کرے کہ یہاں نماز کے بجائے کوئی اور عبادت کی جا رہی ہے اس طرح یہ نماز خدا پرستی کے جذبے کو ہردم تازہ بھی کرتی ہے اور خدا پرستوں میں عالمگیر برادری کا احساس زندہ و متحرک بھی رکھتی ہے۔

روزہ۔

ایسا ہی معاملہ روزہ کا بھی ہے۔ اگر صرف روزے کی عبادت ہی مقصود ہوتی تو ہر مسلمان کو بس یہ حکم دے دینا کافی تھا کہ وہ سال میں تیس روزے جب چاہے رکھ لے لیکن خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کو امتِ واحدہ بھی بنانا مقصود تھا، اس لیے رمضان کا ایک ہی مہینہ ہر سال روزے رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تاکہ تمام مسلمان ایک ساتھ ایک عبادت انجام دیں۔ روزے کی ابتدا اور اس کی انتہا کا بھی ایک ہی وقت رکھا گیا تاکہ سب کا روزہ ایک ساتھ شروع اور ایک ساتھ ختم ہو۔ روزے کے احکام بھی یکساں رکھے گئے تاکہ تمام مسلمان عمر بھر ہر سال پورے ۳۰ (یا ۲۹) دن کے روزے ایک ہی طریقے سے، ایک ہی طرح کی پابندیوں کے ساتھ رکھتے رہیں۔ اس سے لازماً دنیا بھر کے مسلمانوں میں یہ شعور زندہ اور تازہ رہتا ہے کہ وہ ایک ہی شرع کی پابندی کرنے والی امت ہیں۔ اس پر مستزاد تراویح کی نماز ہے جو پنج وقتہ نماز کے علاوہ ساری دنیا میں رمضان کی ہر رات کو باجماعت ادا کی جاتی ہے اور اس میں بالعموم پورا قرآن پڑھا جاتا ہے۔ یہ عبادت بھی ہے خدا کے کلام پاک کی تبلیغ اور تذکیر بھی ہے اور وحدتِ امت کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے والی چیز بھی۔ قرآن کو ہر سال مہینہ بھر تک روزانہ سننے والے خواہ اس کی زبان سے

واقف ہوں یا نہ ہوں، اس کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں، بہرصورت ان سب میں یہ مشترک احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب ایک کتاب کے ماننے والے ہیں اور وہ کتاب ان کے رب کی کتاب ہے۔

حج۔ اب ذرا حج کو دیکھئے جس سے بڑھ کر ملتِ اسلام کے ایک عالمگیر ملت ہونے کا مظاہرہ کسی دوسری عبادت میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر اس مسلمان پر جو حج کی استطاعت رکھتا ہو، یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ عمر میں ایک مرتبہ اس فریضے کو انجام دے۔ اور یہ فریضہ چند مقرر تاریخوں ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے جو سال بھر میں صرف ایک بار آتی ہیں۔ اس طرح روئے زمین پر جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہوں وہاں سے ایک ہی زمانے میں تمام ذی استطاعت مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں جمع ہونا پڑتا ہے آپ غور کیجیے، یہ وہ چیز ہے جو ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے عام انسانوں کو کھینچ کر ایک جگہ لاتی ہے۔ صرف سیاسی مدبرین کو نہیں لاتی جیسے یو این او میں جمع ہوتے ہیں۔ صرف قوموں کے لیڈروں کو بھی نہیں لاتی جیسے بین الاقوامی کانفرنسوں میں آیا کرتے ہیں۔ یہ ہر ملک اور ہر قوم کے عوام کو لاکھوں کی تعداد میں کھینچ لاتی ہے، اور اس غرض کے لیے لاتی ہے کہ وہ سب مل کر ایک خدا کی عبادت کریں۔ ایک ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کریں۔ ایک ساتھ مکہ سے منیٰ، اور منیٰ سے عرفات، اور عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ کی طرف کوچ کریں۔ ایک ساتھ قربانیاں کریں۔ ایک ساتھ رمی جمار کریں۔ ایک ساتھ عرفات میں وقوف اور منیٰ میں چند روز قیام کریں۔ ایک ہی زبان میں سب لبیک لبیک کی آوازیں بلند کریں۔ ایک ساتھ اس قبلے کے گرد نمازیں ادا کریں جس کی طرف رُخ کر کے ہر روز پانچ مرتبہ وہ اپنی اپنی جگہ نماز پڑھتے رہے ہیں۔ ان میں ہر نسل، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر وطن کے لوگ یکجا ہوتے ہیں۔ ہر زبان بولنے والے اکٹھے ہوتے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھروں سے طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے آتے ہیں۔ ان میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ شاہ بھی ہوتے ہیں اور گدا بھی۔ مگر وہاں یہ سارے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ حرم کے حدود میں پہنچنے سے پہلے ہی سب کے لباس اتروا کر ایک ہی

طرح کا فقیرانہ لباس احرام پہنوا دیا جاتا ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے اور کس کا کیا مرتبہ ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس اونچے مقام سے اتار کر عام انسانوں کی سطح پر لے آیا جاتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب و تمدن رکھنے والوں کو بھی تمدن کی بالکل نچلی سطح پر رہنے والوں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے لاکھوں آدمیوں کے ہجوم میں طواف و سعی کرتے ہوئے ایک رئیس کو بھی اسی طرح دھکے کھانے پڑتے ہیں جس طرح کوئی عام آدمی دھکے کھاتا ہے۔ خداوندِ عالم کے دربار میں پہنچ کر ہر شخص کے دماغ سے کبریائی کا خناس نکال دیا جاتا ہے۔ رنگ و نسل اور زبان و وطن کے سارے تعصبات ختم کر کے دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے مسلمانوں کے اندر ایک امت ہونے کا احساس اس قوت کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے کہ اس کا اثر کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ دنیا کے کسی مذہب اور کسی لامذہبی گروہ کے پاس بھی اپنے پیروؤں کو اس قدر عالمگیر پیمانے پر متحد کرنے اور ہر سال اس اتحاد کی تجدید کرتے رہنے کا ایسا کیمیا اثر نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ صرف اس خدا کی حکمت کا کرشمہ ہے جس کی وحدت کو مان کر، جس کے رسولؐ اور جس کی کتاب کی پیروی قبول کر کے، جس کے حضور اپنی جوابدہی کا شعور پیدا کر کے مسلمان ایک امت بنتے ہیں۔

اور یہ عید الاضحیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مزید فضل یہ ہے کہ اس نے حج کی ان برکات کو بھی صرف ان لوگوں تک محدود نہیں رکھا جو اس عبادت کے مناسک ادا کرنے کے لیے مرکزِ اسلام میں جمع ہوتے ہیں، بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ موقع پیدا کر دیا کہ حج ہی کے زمانے میں وہ اپنی اپنی جگہ حاجیوں کے شریکِ حال بن سکیں۔ یہ عید الاضحیٰ کی نماز اور یہ قربانی جو ان تین دنوں کے اندر زمین کے ہر گوشے میں کی جاتی ہے۔ اسی غرض کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جس روز (یعنی ۹ ذی الحج کو) حج ادا کرنے

کے لیے حاجی منیٰ سے عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں' اسی روز صبح سے وہ ہر فرض نماز کے بعد باآواز بلند اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد کا ورد شروع کر دیں۔ ان تکبیرات کا سلسلہ مزید چار روز تک جاری رکھیں تاکہ منیٰ میں حاجیوں کے قیام کا پورا زمانہ دنیا میں ان تکبیرات کو بلند کرتے ہوئے گذر جائے۔ عید الاضحیٰ کی نماز کے لئے وہی دس ذی الحج کی تاریخ رکھی گئی ہے جو حاجیوں کے لیے یوم النحر (قربانی کا دن) ہے ——————— (قربانی کا دن)
— حکم ہے کہ اس نماز کے لیے جاتے وقت بھی اور واپس ہوتے وقت بھی یہی تکبیرات بلند کی جائیں۔ اسی دن ساری دنیا میں نماز عید کے بعد وہی قربانیاں شروع ہو جاتی ہیں جو حاجی منیٰ میں کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا کا ہر مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اسی امت کا ایک فرد ہوں جس امت کے لاکھوں آدمی اس وقت حج کر رہے ہیں' اور حج کے پورے زمانے میں وہ تکبیرات کہتے ہوئے' نماز پڑھتے ہوئے اور قربانی کرتے ہوئے گویا حاجیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ عید الاضحیٰ میں اگرچہ حج جیسا عظیم اور عالمگیر اجتماع نہیں ہوتا مگر اپنے اپنے مقام پر مسلمان ہر جگہ بڑے سے بڑا اجتماع کر کے نماز ادا کرتے ہیں' اور مجموعی طور پر تمام روئے زمین پر ایک ہی زمانے میں اس عید کا منایا جانا ایک دوسرے انداز میں امت کی عالمگیر وحدت کا مظاہرہ بن جاتا ہے :

توحید' ایک مکمل نظام حیات کی بنیاد۔

اختصار کے ساتھ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توحید' رسالت' کتاب اور آخرت کے عقائد سے وہ بنیاد فراہم کر دی جس پر قوم' وطن' رنگ' زبان اور نسل کے تمام تعصبات ختم کر کے دنیا کے سارے انسان ایک عالمگیر امت بن سکتے ہیں۔ پھر عبادات کے ایسے طریقے مقرر فرما دیئے جو اس امت میں محض وحدت ہی نہیں بلکہ نہایت مضبوط عملی وحدت پیدا کرتے ہیں اور اس پر مزید یہ کہ اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی آخری کتاب کے ذریعہ سے اس نے وہ مکمل نظامِ زندگی عطا فرما دیا جو پوری انسانیت کے

لیے ہر زمان و مکان میں ایسا جامع قانون ہے کہ اپنی کسی ضرورت کے لیے بھی کسی جگہ اور کسی دور کے انسانوں کو ہدایت کی طلب میں کسی دوسرے ذریعۂ رہنمائی کی طرف رجوع کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

پھر یہ کفرانِ نعمت کیوں۔

اب اس کے بعد اس سے بڑی بدقسمتی، اور شرمناک بدقسمتی کیا ہوگی کہ جس امت کو اللہ تعالیٰ نے ایسا جامع و مکمل نظامِ حیات دیا جس امت کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے اس نے اتنا بڑا انتظام کیا، اور جس امت کے سپرد اس نے یہ کام کیا کہ وہ دنیا میں اس دینِ توحید کو پھیلائے تاکہ پوری انسانیت اس پر جمع ہو جائے، وہ اپنے اصل کام کو پس پشت ڈال کر اپنی اس وحدت ہی کے ٹکڑے اڑا دینے پر تل گئی ہے۔ وہ مامور تو اس خدمت پر تھی کہ دنیا سے ان اسباب کو ختم کر دے جن کی وجہ سے انسان انسان کو ملیچھ سمجھتا ہے، اچھوت سمجھتا ہے۔ قابلِ نفرت سمجھتا ہے، حقیر و ذلیل سمجھتا ہے اور خدا کی زمین کو ظلم و ستم اور قتل و غارت سے جہنم بنا دیتا ہے۔ اس کا مشن تو یہ تھا کہ دنیا کو ایک خدا کی بندگی، ایک قانونِ حق کی پیروی، اور ایک عالمگیر برادری میں جمع کر کے ظلم کی جگہ عدل، جنگ کی جگہ امن، نفرت و عداوت کی جگہ خیر اندیشی و محبت قائم کرے اور نوعِ انسانی کے لیے اسی طرح رحمت بن جائے جس طرح اس کے ہادی و رہنما محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ اپنی توانائیاں آپس کے تفرقے برپا کرنے پر صرف کر رہی ہے۔ اس کے لیے سب سے دلچسپ مشغلہ یہ بن گیا ہے کہ اس کے افراد اور گروہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں اور مخالفت کو بڑھا کر نفرت و عداوت کی حد تک لے جائیں۔ نیک نیتی کے ساتھ رائے اور علم و تحقیق کا اختلاف تو رحمت بن سکتا ہے اور سلف صالحین میں وہ رحمت ثابت بھی ہوا ہے۔ لیکن اب اس امت میں اختلاف کے معنی مخالفت کے ہو گئے ہیں اور کسی سے کسی مسئلے میں اختلاف ہو جانے کا مطلب یہ ہو گیا ہے کہ آدمی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جائے، یہاں تک کہ اس کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔

اور جو کہیں اختلاف مذہبی نوعیت کا ہو جائے تو پھر اسے جہنم کے دروازے تک پہنچائے بغیر دم لینا حرام ہے۔ اس سے بڑی بد نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جن کے لیے وحدت کا اتنا بڑا سامان کیا تھا۔ ان کے لیے اب تفرقے کے سارے دروازے کھل گئے ہیں اور وحدت کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ مسجدیں الگ ہو گئی ہیں۔ ایک مسجد میں دوسرے مسلک کا آدمی نماز پڑھ لے تو وہ جگہ ناپاک ہو جاتی ہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہو۔ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے آدمی سے مصافحہ تک کرنے سے اجتناب کرتا ہے کہ کہیں اس کا ہاتھ گندا نہ ہو جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ سب کچھ کس چیز کا نتیجہ ہے؟

یہ سب کچھ اسی چیز کا نتیجہ ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ مختلف لوگوں نے توحید اور دین و شرع میں نئی نئی چیزوں کی آمیزش کی ہے، اصل دین کے عقائد و احکام میں کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا ہے، جو چیزیں اہم نہ تھیں انہیں اہم ترین بنایا ہے اور جو اہم تھیں انہیں غیر اہم بنا دیا ہے۔ اور پھر انہی آمیزشوں اور اسی کمی بیشی کو مدارِ ایمان قرار دے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے مختلف گروہ آپس ہی میں برسرِ پیکار ہو گئے ہیں۔ اس حالت میں ہدایت سے بیگانہ انسانوں کو حق کی دعوت دے کر اس عالمگیر برادری میں شامل کرنا تو الگ رہا، جو اس برادری میں پہلے سے شامل ہیں تو انہیں بھی اس سے خارج کرنے کا کام کارِ ثواب سمجھ کر انجام دیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں غیر مسلموں کے لیے ایک تماشا بنا کر رکھ دیا ہے، اور مستشرقین کو یہ کہنے کی ہمت ہوتی ہے کہ یہ امت سرے سے کوئی امت ہی نہیں ہے۔ اس وقت اشاعتِ اسلام کی راہ میں اگر کوئی سب سے بڑی رکاوٹ ہے تو وہ ہماری یہی حالت ہے۔ خدا ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں راہِ راست دکھائے۔ آمین۔

---

(۲)

دنیا کے تمام مذہبوں اور مسلکوں میں بنیادی نقص یہ ہے کہ جو انسان ان پر ایمان لاتے ہیں وہ اپنے اور ساری کائنات کے خالق کے متعلق نہ تو صحیح تصور رکھتے ہیں اور نہ اس کے بارے میں صحیح طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ صرف اسلام ایسا دین ہے۔ جو خالقِ کائنات اور خالقِ انسان کے بارے میں ہمیں صحیح تصور عطا کرتا ہے جسے توحید کہتے ہیں۔ وہ انسان کو صحیح طرزِ عمل بتاتا ہے جو اسے اختیار کرنا چاہیے۔ یہ چیز تمام اقوامِ عالم میں مسلمانوں کو ممیز کرتی ہے۔ یہ وہ اصل امتیازی نشان ہے جس کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ توحیدِ خالص کے ماننے والے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جو بنیادی طور پر مسلمانوں کو دیگر قوموں سے ممیز کرے   مگر یہ ایک عجیب بات ہے اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ مسلمان اپنی اس اصل امتیازی حیثیت کو فراموش کر گئے ہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں نے ایک بہت بڑی نعمت سے اپنے آپ کو خود محروم کر لیا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک سب سے پہلا کام جو نہایت ضروری ہے یہ ہے کہ ہم واضح طور پر اور صاف صاف توحید کو نہ صرف سمجھیں بلکہ ایک ایک بچے کے دل و دماغ میں توحید کا صحیح تصور اتارنے کی کوشش کریں۔ جب تک یہ بنیادی خرابی دور نہیں ہوتی اس وقت تک اس سلسلے میں کوئی دوسری اصلاح کارگر نہیں ہو سکتی۔

توحید کیا ہے؟

توحید کیا ہے؟ کیا محض یہ کہ آدمی مانے کہ خدا موجود ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گذری ہے اور نہ آج ہے جو من حیث القوم خدا کے وجود سے انکار کرے۔ کچھ نہ کچھ دہریئے تو ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ روس کی دہریت پرستی کا بھی بہت شہرہ رہا ہے لیکن روسی حکمران اپنی پانچ فی صد آبادی کو بھی منکرِ خدا نہیں بنا سکے۔ جبکہ خدا کی نفی کے لیے پروپیگنڈا کرتے ہوئے انہیں چالیس برس سے زائد ہو گئے ہیں۔ اس پروپیگنڈے پر دولت اور طاقت خرچ کی جا رہی ہے لیکن عالم یہ ہے کہ پچھلی جنگ عظیم میں جب جرمن

فوجیں مسلسل فتوحات حاصل کرتی ہوئی روس میں گھستی چلی گئیں تو اسٹالن نے عوام سے کہا کہ مسجدوں اور گرجاؤں میں جاکر خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے۔ گویا وہ لوگ جو خدا سے دعا کرتے ہیں اور اس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہمیں چلاتے رہتے ہیں وہ بھی خدا کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خدا کے وجود سے من حیث القوم انکار انسان کے لیے کبھی ممکن نہیں ہو سکا۔

پھر توحید کے معنی یہ نہیں کہ آدمی یہ مانے کہ خدا ایک ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو بہت ساری ہستیوں کو خدا مانتی ہو۔ ہندوستانی مشرکین کے نزدیک پرماتما ایک ہی ہے ——— قدیم زمانے کے زرتشتی خدا کو ایک ہی مانتے تھے ——— قرآن پاک کفار مکہ سے سوال کرتا ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہتے ہیں اللہ نے۔ قرآن پاک سوال کرتا ہے کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہتے ہیں اللہ نے۔ قرآن پاک سوال کرتا ہے کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ وہ کہتے ہیں اللہ نے ——— درحقیقت اصل گمراہی جس میں انسان قدیم زمانے میں بھی مبتلا تھا اور آج بھی ہے۔ یہ ہے کہ آدمی اللہ ایک ہی مانتا ہے لیکن الٰہ بہت سے مانتا ہے۔

شرک کی نوعیت!

قرآن پاک نے سارا زور اس پر صرف کیا ہے کہ آدمی بہت ساری ہستیوں کی بجائے صرف ایک اللہ ہی کی ہستی کو رب اور الٰہ مانے۔ کتاب الٰہی نے اصلاح کے لیے سارا زور بیان اسی پر صرف کیا ہے۔ قرآن میں اللہ کے ہونے کے دلائل پر اتنا زور نہیں جتنا اسکے الٰہ اور رب ہونے کے دلائل پر ہے، دہریت کے ابطال پر مشکل سے دو تین آیتیں آئی ہیں اور شرک کی تردید میں بے شمار آیات موجود ہیں ——— اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کے معاملے میں لوگ بنیادی طور پر چار غلطیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

۱۔ اللہ کی ذات میں شرک!

۲۔ اللہ کی صفات میں شرک!

۳۔ اللہ کے اختیارات میں شرک!

۴ - اللہ کے حقوق میں شرک!

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کی کھلی ہوئی مثال عیسائی پیش کرتے ہیں، وہ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ یہ بات کہ اللہ کی ذات کسی بشر یا کسی مخلوق کے وجود میں اپنا ظہور کرے ایک لغو اور مہمل بات ہے۔ انسان کبھی ذہن میں نہیں لا سکتا کہ وہ جو ساری کائنات کا خالق ہے۔ ایک انسان کے وجود میں حلول کر جائے۔ ابن اللہ کا عقیدہ، ذات میں شرک کا عقیدہ ہے۔ اسی طرح مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ یہ بھی اللہ کی ذات میں شرک ہے، اسی طرح ہند کے مشرکین کا عقیدہ بھی کہ بھگوان نے رام کی ہستی میں حلول کیا، اللہ کی ذات میں شرک پر مبنی ہے۔

(۲) دوسری بڑے پیمانے پر غلطی صفات میں شرک کی ہے۔ یہ اللہ کی صفت کہ وہ ما کان وما یکون کو جانتا ہے۔ یہ اس کی صفت ہے کہ وہ کائنات کے ذرے ذرے کو جانتا ہے۔ یہ اس کی صفت ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کائنات کے ہر شخص کی بات سنتا ہے۔ کوئی شخص زمین کے ایک کونے سے پکارتا ہے تب بھی سنتا ہے اور کوئی دوسرا شخص اسی وقت زمین کے دوسرے کونے سے پکارتا ہے تب بھی وہ سنتا ہے پھر اس کے بصیر ہونے کی صفت ہے یعنی وہ ہر چیز کو بیک وقت دیکھ رہا ہے۔ اگر دوسری ہستیوں کے بارے میں بھی انسان یہ سمجھے کہ جیسے اللہ علیم ہے وہ بھی اسی طرح علیم ہیں، اور جس طرح اللہ سمیع و بصیر ہے اسی طرح وہ سمیع و بصیر ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ توحید کا صحیح تصور اس کے دماغ میں اتر ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی آدمی اپنے بستر پر لیٹے لیٹے کسی بزرگ کو پکار رہا ہے کہ میری مدد کرو تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی طرف منتقل کر رہا ہے۔

(۳) اسی طرح خدا کے اختیارات کو مخلوق کی طرف منتقل کرنا اللہ کے اختیارات میں شرک ہے۔ ساری مخلوق کی قسمت بنانا یا بگاڑنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس نے آدمی کے لئے جتنا کچھ مقرر کیا ہے، کوئی اس سے کم یا زیادہ نہیں کر سکتا۔ اگر دنیا کی ساری طاقتیں کسی کو ہلاک کرنا چاہیں مگر اللہ کو یہ منظور نہ ہو تو کوئی اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ اور

اللہ کسی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرے تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی اسے نہیں بچا سکتیں انسان نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اللہ کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو شریک قرار دیا ہے۔ اگر انسان اللہ کی ذات وصفات اور اختیارات میں شرک کی غلطیاں نہ کرے تو پھر دوسروں کی پرستش بھی کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ پرستش اسی کی کرتا ہے جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ اس کی قسمت بنانے یا بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اگر وہ سمجھ لے کہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار یا اختیار نہیں تو وہ اللہ کے اختیارات میں شرک کرنے سے باز رہے گا۔

(۴) انہی تین غلطیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے حقوق میں بھی شرک کرنے لگتا ہے۔ اُسے عبادت اللہ کی کرنی چاہیے۔ جھکنا اللہ کے آگے چاہیے۔ مگر وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ کسی اور میں خدائی صفات اور اختیارات ہیں تو پھر اس کے آگے جھکنا شروع کر دیتا ہے۔ قرآن جو بات انسان کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ سمیع وعلیم اور خبیر وقدیر وہ ہے۔ دعائیں سننے اور قبول کرنے کے اختیارات صرف اللہ کے ہیں اور بندگی و پرستش اسی کی ہونی چاہیے۔ قرآن میں جگہ جگہ مضبوط دلائل کے ساتھ بار بار ان باتوں کو دہرایا گیا ہے۔ تاکہ انسان اللہ کے سوا دوسروں کو اِلٰہ بنانے سے بچ جائے۔

الوہیت میں شرک کی اس غلطی کی طرح، جس غلطی میں انسان ہمیشہ مبتلا ہوتا ہے وہ ربوبیت میں شرک کی غلطی ہے ——— رب کے معنی ہیں ——— پروردگار۔ آقا۔ سردار اور مالک ان دونوں معنوں میں انسانوں نے اللہ کے ساتھ مخلوق کو شریک کیا ہے۔

ربوبیت میں شرک!

لوگوں نے سمجھا کہ ہمیں رزق دینے میں اللہ کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں۔ ہمیں پرورش کرنے، روزگار دلوانے اور صحت و تندرستی عطا کرنے میں دوسرے بھی شریک ہیں چنانچہ جب دوسروں کو رب قرار دیا تو اس کے آگے جھکنے لگے۔ انسان جب تک کسی کو اپنا رب نہ سمجھے گا، اس کے آگے نہیں جھکے گا۔ پروردگاری کی صفت انسان ان

ہستیوں کی طرف منتقل کرتے رہے ہیں جو ان کے تصور کے مطابق 'فوق الفطرت طاقتوں کے مالک ہیں' بعض لوگوں نے فرشتوں کے بارے میں' بعضوں نے انسانوں کے بارے میں' بعضوں نے سیاروں' ستاروں' جانوروں اور درختوں تک کے بارے میں ربوبیت کا تصور قائم کیا۔ ربوبیت کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ انسان' انسان کا رب ہے نمرود کا دعویٰ تھا کہ چونکہ عراق کی سرزمین میں اقتدار میرے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے رب میں ہوں ۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۔ میرا رب وہ ہے جسے چاہتا ہے جلاتا ہے جسے چاہتا ہے مارتا ہے ـــــ تو اس پر نمرود کہنے لگا۔ اَنَا اُحْيِ وَاُمِيتُ ۔ میں بھی جسے چاہوں جلاتا ہوں اور جسے چاہوں مارتا ہوں۔ ـــــ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ـــــ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ۔ میرا رب تو سورج مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا؟ تو ـــــ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ـــــ کافر مبہوت ہو گیا ـــــ وہ مبہوت اس لئے رہ گیا کہ اپنے دل میں وہ بھی اس بات سے آگاہ تھا کہ اس کائنات کا رب میں نہیں مگر وہ اپنی سرزمین میں ربوبیت چلانا چاہتا تھا۔

اسی طرح فرعون کا واقعہ ہے۔ فرعون نے اعلان کیا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ـــــ اس کی بنیاد یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا پورے مصر پر میرا اقتدار ہے۔ آلیس لی ملك مصر و هٰذه الانهار وتجري من تحتي؟ ـــــ اور اس کا خیال تھا کہ چونکہ مصر کا سارا نظام میرے اقتدار میں چل رہا ہے اس لئے ربِّ اعلیٰ میں ہوں ـــــ لیکن توحید ـــــ ربوبیت میں کسی تقسیم کی قائل نہیں۔ اس لئے قرآن میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا ذکر آیا ہے ـــــ اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ بات انسان کے ذہن نشین کرائی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور الٰہ نہیں ہے ـــــ یہ اصل مقصود ہے قرآن پاک کا۔

لوگوں کی زندگیوں میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں۔ جب انکے دماغ میں سے الوہیت اور ربوبیت کا غلط تصور نکل جائے۔ اگر ربوبیت اور الوہیت کے بارے میں گمراہی دور نہ ہو تو کوئی چیز نہیں جس سے لوگوں کی اصلاح ہو سکے۔

قادیانی مسئلہ اور اس کا صحیح حل

ماہ مئی ۱۹۷۴ء کے حادثۂ ربوہ پر مسلمانوں میں جو ردِ عمل واقع ہوا اور غلام احمدی اُمت کو اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے الگ کرنے کے لئے پاکستان کے تمام مسلمانوں نے کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ جو جدوجہد شروع کی وہ اگرچہ بالکل ایک فطری امر ہے، مگر میں اس کو بروقت نہیں بلکہ بہت بعد از وقت سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ردِ عمل اُس وقت رُونما ہوا ہے جب مسلم معاشرے کے اندر اس فتنے کو پرورش پاتے اور پروان چڑھتے ۸۰ ـ ۹۰ سال بیت چکے ہیں، اور اب اس کے استیصال کے لئے یہ آخری موقع ہمیں ملا ہے جس کو اگر ہم نے کھو دیا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ فتنہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ لَا قَدَّرَ اللہ

درحقیقت اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی شخص حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھلم کھلا نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے اور اس کی دعوتِ باطل کو اِسی مسلم معاشرے میں پھیلنے کا موقع حاصل ہوتا چلا جائے۔ یہ اتنا بڑا گناہِ عظیم ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کیا جانا چاہیئے تھا، کجا کہ اس کے معاملہ میں اس قدر تساہل برتا جاتا کہ وہ صدی کی آٹھ نو دہائیوں تک نہ صرف ہمارے ملک میں، بلکہ دوسرے مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں بھی پھیلتا چلا جاتا۔ اس معاملہ میں ہم اُس دَور کے لئے تو اللہ جلّ شانہٗ کے سامنے کچھ عذر بھی پیش کر سکتے ہیں جبکہ ہم پر انگریزی حکومت مسلط تھی، اور ہم اُس کے آگے بے بس تھے، اور وہ اس فتنے کی آبیاری کر رہی تھی۔ لیکن انگریزوں سے آزاد ہونے کے بعد جب پاکستان کا اقتدار خود مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اُس وقت ۲۷ سال تک اس فتنے کی آبیاری خود انگریزوں سے بھی بڑھ کر ہمارے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہوتا، اور اس کو اتنی طاقت پکڑ جانے کا موقع دینا کہ وہ پاکستان

کی حکومت پر قابض ہو جانے کا حوصلہ کرنے لگے، ایسا اکبر الکبائر ہے جس پر کوئی عذر ہم اپنے رب کے حضور پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر ہم اسی پچھلے طرز عمل کو جاری رکھتے ہیں تو خدا کے عذاب سے ہمیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس لئے میں عام مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں کہ جو تحریک انہوں نے اس فتنۂ غلام احمدیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے شروع کی ہے اسے ایک قطعی فیصلے تک پہنچائے بغیر ہرگز نہ چھوڑیں، اور ملک کی حکومت اور قومی اسمبلی سے بھی کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حضور اپنی جواب دہی کو یاد کریں سیاسی اغراض و مصالح کو بھول جائیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ وہ فیصلہ کریں جو عین ان کے دین و ایمان کے مطابق ہے۔

یہ معاملہ جو اس وقت اسمبلی میں زیر بحث ہے، اپنے اندر کوئی پیچیدگی نہیں رکھتا بلکہ کھلے آسمان کی طرح صاف اور عیاں ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی واقفیت بھی حاصل ہو وہ جانتا ہے کہ اسلام میں نبوت ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اگر نبی سچا ہو اور کوئی اس کو نہ مانے تو کافر۔ اور اگر وہ جھوٹا ہو اور کوئی اسے مان لے تو کافر۔ بہر حال ایک دعوائے نبوت کے بعد یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے ایک امت میں جمع ہو سکیں۔ نبوت ایک سنگین دیوار ہے جو دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے حائل ہو جاتی ہے اور انہیں نہیں ملنے دیتی جب تک کہ وہ منہدم نہ ہو جائے۔ ہر نبوت اپنے ماننے والوں کی ایک الگ امت بناتی ہے۔ اور نہ ماننے والوں کو قطعی طور پر ان سے جدا کر دیتی ہے۔

یہ تو ہے بجائے خود نبوت کی اصولی حیثیت۔ لیکن اسلام میں اس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھنے والا کوئی شخص سچا نبی ہو سکے۔ اس لئے کہ قرآن حکیم، احادیث صحیحہ اور اجماع امت کی رو سے حضورؐ اللہ کے آخری نبی ہیں صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کے نبی ہونے کی دلیل کیا ہے بلکہ بالاتفاق اس کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اس سے اور اس کے ماننے والوں سے جنگ کی اور ان کو وہ حقوق بھی نہیں دیئے جو اسلامی

قانون میں مسلح بغاوت کرنے والے مسلمانوں یا ذمیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور سے آج تک ۱۴ سو برس کی مدت میں ہر زمانے کے مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے کہ بعثتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص جھوٹا ہے، کافر ہے، اور اس پر ایمان لانے والا بھی کافر ہے۔ حتیٰ کہ ایسے مدعی سے اس کی نبوت کی دلیل پوچھنا بھی کفر ہے۔ کیونکہ دلیل پوچھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا سمجھ رہا ہے اور اُسے کھلا سمجھنا بجائے خود قرآن و حدیث اور اجماع کی رو سے کفر ہے۔

اب دیکھیے! ایک طرف تو دعوائے نبوت بعد از خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اسلام کا یہ صریح اور متفق علیہ حکم ہے اور دوسری طرف یہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اپنی نبوت تسلیم کرنے کی لوگوں کو دعوت دی۔ نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا، اور ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائی جس کا کوئی فرد اپنے باپ کا جنازہ بھی نہیں پڑھ سکتا اگر وہ اس نئی نبوت پر ایمان نہ لایا ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہ مدعی آخر سچا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ سچا نہیں ہے تو اس کے کافر ہونے اور اس کی تصدیق کرنے والے سب لوگوں کے کافر ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ اور اس نئے نبی کی یہ اُمت مسلمانوں ہی کے اندر کا ایک فرقہ کیسے قرار پا سکتی ہے جبکہ وہ اسلام کی سرحد توڑ کر خود اس سے باہر نکل چکی ہے؟

لیکن اس نئی اُمت اور اس کے بانی مدعیِ نبوت کی انتہائی چالاکی ہے کہ اس نے اسلام کی سرحد سے نکل کر بھی اپنے دین کو اصل اسلام قرار دیا۔ اسلام ہی کے نام سے اس کی تبلیغ کی، اور لاکھوں مسلمانوں کو اس گمراہی میں مبتلا کیا کہ کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ کافر رہتے ہیں جب تک کہ مرزا غلام احمد کی نبوت کا کلمہ اس کے ساتھ نہ ملائیں۔ اگر یہ لوگ سیدھی طرح اسلام سے نکل کر کسی دوسرے نام سے اپنی الگ اُمت بنا لیتے اور اپنے آپ کو مسلمان نہ کہتے تو اتنا بڑا فتنہ نہ بنتے جتنا بڑا فتنہ وہ اُمت در اُمت کی صورت اختیار کرکے بن گئے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کا کوئی دوسرا نام رکھ کر

اُس کی تبلیغ کرتے تو کسی ایک مسلمان کو بھی اس بات پر آمادہ نہ کر سکتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی چھوڑ کر مرزا غلام احمد کی پیروی قبول کرلے۔ وہ نہ انگریزی حکومت کے دور میں مسلمانوں کے حقوق کا بڑا حصہ ہتھیا سکتے تھے اور نہ پاکستان قائم ہونے کے بعد انہیں یہ موقع مل سکتا تھا کہ حکومت کے نظم و نسق اور اس کی مسلح افواج اور اس کے زیر اثر معاشی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلتے اور بڑھتے چلے جاتے۔ مگر یہ ان کی انتہائی عیاری تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان سے الگ اپنی امت بھی منظم کی اور پھر مسلمانوں کی اُمت میں شامل رہ کر وہ سرطان کے پھوڑے کی طرح جسدِ ملت میں اپنی جڑیں بھی پھیلاتے رہے یہ ان کی اسی عیاری کا نتیجہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھا جاتا رہا ، مسلمانوں کو توڑ توڑ کر وہ اپنی امت میں ملاتے اور اپنی امت بڑھاتے رہے اور ایک منظم طریقے سے پیہم کوشش کر کے وہ مسلم معاشرے اور حکومت پر اس طرح چھاتے چلے گئے کہ اب وہ پاکستان کے حکمران بن جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ربوہ کا حادثہ اِسی پس منظر میں پیش آیا ہے اور یہ گویا مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آخری تنبیہہ ہے کہ اگر ان میں کچھ بھی دینی حس باقی ہے تو امتِ محمدیہ کے اندر اُمتِ غلام احمدیہ کے پھلنے پھولنے کا ہر راستہ بند کر دیں۔ ہزار ہزار شکر ہے اس خداوند عظیم کا کہ اس تنبیہہ پر پاکستان کے علماء و مشائخ، سیاسی لیڈر اور عام مسلمان بھی پوری طرح بیدار ہو گئے، اور حکومت بھی بروقت اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسا کہ صمدانی ٹریبونل کا قیام مسٹر بھٹو کی ۱۳ جون والی تقریر اور پوری قومی اسمبلی کے ایک کمیٹی کی صورت میں اس مسئلے کے حل کی کوشش میں لگ جانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع پر چند ضروری تجاویز پیش کرتا ہوں جن سے میرے نزدیک یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ میری پہلی تجویز یہ ہے کہ پاکستان کے دستور کی دفعہ ۲ میں، جو ریاست کا مذہب اسلام قرار دیتی ہے، حسب ذیل دو شقوں کا اضافہ کیا جائے :-

(۱) اللہ کی توحید، تمام انبیاء کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی ماننا، تمام

کتب الٰہیہ کے بعد قرآن مجید کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کرنا اور آخرت پر ایمان رکھنا اسلام کے لازمی بنیادی عقائد ہیں جن میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(ا) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبی ہونے کا دعویٰ کرے، اور ایسے مدعی کو جو شخص اپنا مذہبی پیشوا مانے وہ کافر اور خارج از اسلام ہے قطع نظر اس سے کہ وہ مدعی خود اپنے آپ کو، یا اس کے پیرو گردہ اس کو ظلی یا بروزی یا اُمتی یا غیر تشریعی نبی کہے، یا مسیح موعود، مجدد، محدث وغیرہ ناموں سے یاد کرے۔

۲- میری دوسری تجویز یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۰۶ کی شق (۳) میں جہاں اقلیتوں کا ذکر ہے وہاں بدھ مت والوں کے بعد "مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں" کا اضافہ کر دیا جائے۔

۳- میری تیسری تجویز یہ ہے کہ دفعہ ۶ شق (۱) کے بعد حسب ذیل شق (۲) کا اضافہ کر کے بقیہ شقوں کو ان دونوں شقوں کے مطابق کر دیا جائے۔

> "کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، یا ایسا دعویٰ کرنے والے کو اپنا مذہبی پیشوا مانے، یا لوگوں کو اُسے مذہبی پیشوا ماننے کی دعوت دے یا اسے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دے، وہ بھی خیانت عظمیٰ (high treason) کا مرتکب سمجھا جائے گا۔"

ان ترمیمات سے دستور کی حد تک نئی نبوت کے فتنے کا کما حقہ سدِ باب ہو جاتا ہے میری تجویز کردہ ان دستوری ترمیمات پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ دستور جیسی دستاویز میں کسی شخصِ خاص کا نام لینا مناسب نہیں ہے۔ ہمارا دستور قرآن سے زیادہ مقدس نہیں ہو سکتا۔ اس میں جب ابو لہب کا نام لیا گیا ہے تو ہمارے دستور میں مرزا غلام احمد کا نام لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ قادیانی مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس گروہ کے بانی کا نام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ قومی اسمبلی ایک قرارداد کے ذریعہ سے حکومت کو

حسبِ ذیل تدابیر جلدی سے جلدی اختیار کرنے کا مشورہ دے۔

۱۔ تمام ملازمینِ حکومت سے ایک ڈیکلریشن فارم پُر کرایا جائے جس میں ہر ملازم یہ واضح کرے کہ وہ مرزا غلام احمد کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہے یا نہیں۔

۲۔ جو شخص غلط ڈیکلریشن دے اس کی غلط بیانی جس وقت بھی ظاہر ہو اسی وقت اس کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور اس کے تمام حقوق جو سرکاری ملازمت کی بنا پر اسے حاصل ہوں، ساقط کر دیئے جائیں اور اس کو آئندہ ہر ملازمت کے لئے نا اہل قرار دے دیا جائے۔

۳۔ رائے دہندوں کی فہرست اور مردم شماری میں پیروان مرزا غلام احمد کا خانہ علیحدہ رکھا جائے۔

۴۔ شناختی کارڈوں اور پاسپورٹوں میں بھی مرزا غلام کے پیروؤں کے لئے ان کے نام کے ساتھ ان کے مذہب کی تصریح کی جائے۔

۵۔ تمام کلیدی اسامیوں سے اس گروہ کے افراد کو ہٹا دیا جائے۔

۶۔ سرکاری ملازمتوں میں اس گروہ کے لوگوں کا تناسب ان کی آبادی کے مطابق کر دیا جائے اور تناسب سے بہت زیادہ مناصب اُن کو دے کر مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی جاتی رہی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔

۷۔ ربوہ کی زمین جن شرائط پر انہیں دی گئی ہے ان پر نظرِ ثانی کی جائے اور مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھ کر از سرِ نو شرائط مقرر کی جائیں۔ نیز اگر یہ ثابت ہو کہ انہوں نے گرانٹ کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے تو اس گرانٹ کو منسوخ کر دیا جائے۔

۸۔ ربوہ کو جسے انہوں نے ریاست در ریاست بنا رکھا ہے کھلا شہر قرار دیا جائے۔ اور وہاں مسلمانوں کو جائداد حاصل کرنے، سکونت اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کے پورے مواقع دیئے جائیں۔

ایسی قرارداد پاس ہونے کے بعد اگر حکومت اس پر مستعدی کے ساتھ انتظامی کارروائی کرے تو ملک بہت جلد اُن خطرات سے محفوظ ہو سکتا ہے جو اس فتنے کے

۸۰ ۔ ۹۰ سال تک پروان چڑھتے رہنے سے اب علانیہ رونما ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ میں وزیراعظم صاحب سے دو گزارشیں اور کروں گا۔ ایک یہ کہ صمدانی ٹریبونل کی رپورٹ کو بلاکم و کاست شائع کریں۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کی تحریک پر جو بے جا پابندیاں ملک میں لگائی گئی ہیں، جو گرفتاریاں اس تحریک کو روکنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہیں، اور پریس کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے، اس پورے سلسلے کو انہیں فوراً ختم کر دینا چاہیے، کیونکہ یہ سب کچھ ان کی ۱۳ جون والی تقریر کی روح اور معنی کے بالکل خلاف ہے۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۷۴ء)

غلافِ کعبہ

اُس کی شرعی حیثیت اور اسکی تاریخ

اُس سال ایک مدتِ دراز کے بعد پاکستان کو غلافِ کعبہ تیار کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں ایک مرتبہ اس ملک سے غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا اور پھر ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک ہندو پاکستان کے لوگوں کو اس خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ اُس کے بعد اب یہ تیسرا موقع ہے کہ اس ملک کے لوگ یہ سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر مسلمانانِ پاکستان میں عام جوشِ مسرت پایا جاتا ہے۔

اس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غلافِ کعبہ کے متعلق ایک مختصر مضمون لکھا جائے تاکہ عام لوگ اس کی تاریخ اور اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور یہ بھی جان لیں کہ شریعت میں اس کی حیثیت کیا ہے؟۔

شرعی حیثیت

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ خانہ کعبہ وہ عمارت ہے جو اب سے چار ہزار سال پہلے اللہ تعالےٰ کے جلیل القدر پیغمبر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کی تھی۔ اور یہ بات بھی

قرآن میں بصراحت ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو اپنا گھر قرار دیا اور ہمیشہ کے لئے قبلۂ اہل توحید بنا دیا۔ یہ امور تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں، اس لئے ان پر کسی بحث و گفتگو کی حاجت نہیں۔ البتہ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اس پر غلاف چڑھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس میں کیا حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ کوئی بدعت ہے جو بعد کے کسی زمانے میں شروع ہوئی ہے۔ یہ خیالات بھی بعض ذہنوں میں پائے جاتے ہیں کہ اس عمارت پر غلاف چڑھانا بے جا اسراف ہے، کیوں نہ اتنا روپیہ غریب انسانوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے۔ یہ شبہات بھی بعض حلقوں کی طرف سے ظاہر کئے گئے ہیں کہ اس غلاف کے احترام اور اس کی روانگی کے اہتمام اور اس کی مشایعت اور زیارت میں شرک کا شائبہ ہے۔ یہ غلط فہمیاں چونکہ واقفیت کی کمی کے باعث لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے سب سے پہلے ہم ان کو رفع کریں گے۔

کسی فعل کے متعلق جب معتبر و مستند ذرائع سے ثابت ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے، یا وہ آپ کے سامنے ہوا ہے اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا ہے، تو اس کے بارے میں یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ بدعت ہے۔ کعبہ کے متعلق یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے، جبکہ یہ گھر کفار قریش کی تولیت میں تھا اس پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اور فتح کے بعد جب وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تولیت میں آیا تو نہ صرف یہ کہ آپؐ نے اسے باقی رکھا بلکہ غلاف چڑھانے کے طریقہ پر خود عمل کیا، اور غلاف چڑھانے کے اس فعل کا ذکر تعظیم و تکریم کے ساتھ فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ :-

کانوا یصومون عاشوراء   رمضان کے روزے فرض ہونے سے

قبل ان یفرض رمضان وکان یومًا تستر فیہ الکعبۃ (بخاری، کتاب الحج)	پہلے مسلمان یوم عاشوراء (۱۰ محرم) کا روزہ رکھا کرتے تھے اور یہ وہ دن تھا جب خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔

اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود ہجرت سے پہلے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

انی لمستتر باستار الکعبۃ اذجاء ثلاثۃ نفر، ثقفی وختناہ قرشیان، کثیر شحم بطونھم قلیل فقہ قلوبھم، فتحدثوا بینھم حدیثا، فقال احدھم تری ان اللہ عزوجل یسمع ما قلنا؟ قال الآخر اراہ یسمع اذا رفعنا ولا یسمع اذا خفضنا۔ قال الآخر ان کان یسمع شیئًا منہ انہ یسمعہ کلہ (مسند احمد۔ مرویات ابن مسعود رضی اللہ عنہ)	میں خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا کہ تین آدمی آئے، ایک قبیلۂ ثقیف کا تھا اور دو اس کے قریشی داماد تھے۔ تینوں بڑے موٹے تازے تھے مگر عقل وفہم سے عاری۔ انہوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ پھر ایک نے کہا تمہارا کیا خیال ہے، یہ باتیں جو ہم نے کی ہیں کیا اللہ تعالےٰ نے ان کو سن لیا ہے؟ دوسرے نے کہا۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب ہم زور سے بات کرتے ہیں تو اللہ اس کو سن لیتا ہے اور جب آہستہ بولتے ہیں تو وہ اسے نہیں سنتا۔ تیسرے نے کہا، اگر وہ کچھ سنتا ہے تو پھر ساری باتیں سنتا ہے۔

یہ دونوں روایات ظاہر کرتی ہیں کہ فتح مکّہ سے پہلے اہل عرب خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت انسؓ بن مالک کی حسب ذیل روایت ثابت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کر لیا تو آپؐ نے زمانۂ جاہلیت کے اس طریقے کو برقرار رکھا۔ حالانکہ جاہلیت کی جتنی یادگاریں اسلام کے خلاف تھیں ان کو آپؐ نے بلا تاخیر مٹا دیا تھا۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور

دخل مکة وعلی رأسہ المغفر فلما نزعہ جاء رجل فقال ابن خطل متعلق باستار الکعبۃ فقال اقتلہ (بخاری، کتاب المغازی - ابوداؤد، کتاب الجہاد، نسائی، کتاب الحج۔)

آپؐ سر پر خود پہنے ہوئے تھے جب آپؐ نے خود اتارا تو ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ ابن خطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا کھڑا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا اسے قتل کر دو۔

اس روایت کی تائید حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ کی یہ روایت کرتی ہے جو ان کے صاحبزادے حضرت مُصعبؓ بن سعد نے نقل کی ہے۔

لما کان یوم فتح مکۃ امّن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس الا اربعۃ نفر وامرأتین وقال اقتلوھم وان وجدتموھم متعلقین باستار الکعبۃ۔ (نسائی۔ کتاب تحریم الدم)

جب فتح مکہ کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو امان دی مگر چار مردوں اور دو عورتوں کے متعلق فرمایا کہ ان کو قتل کر دو خواہ وہ کعبہ کے پردوں ہی سے چمٹے ہوئے ہوں۔

ان روایتوں کے باوجود یہ شُبہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید عین فتح کے موقع پر حضورؐ نے غلاف نہ اُتروایا ہو اور بعد میں اس کو اتروا دیا ہو۔ لیکن ایک دوسری روایت اس شبہ کو رفع کر دیتی ہے۔ اس میں حضرت عُروہ بن زبیر فتح مکہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ اس روز حضرت سعد بن عُبادہ نے ابوسفیان کو مخاطب کر کے کہا۔ الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبۃ۔ (آج قتل و خون کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔) اس بات کی شکایت ابوسفیان نے جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا۔

کذب سعد، ولکن ھٰذا یوم یعظم اللہ فیہ الکعبہ، ویوم تکسی فیہ الکعبہ (بخاری، کتاب المغازی، غزوہ الفتح)

سعد نے غلط کہا۔ بلکہ آج تو وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا اور وہ دن ہے جب کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا۔

آخری فقرے کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ "اس ارشاد سے حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم کعبہ پر غلاف چڑھائیں گے اور ایسا ہی ہُوا۔" اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کا یہ ارشاد اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ کعبہ پر غلاف چڑھانا اس کی تعظیم کے مقتضیات میں سے ہے۔ اسی بنا پر علماء امت اس کے جواز پر متفق ہیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں "کعبہ کے لئے وہ تعظیم ہے جو دوسری مساجد کے لئے نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کعبہ کو حریر و دیبا سے ڈھانکنا جائز ہے، مگر مساجد پر اس طرح کے پردے ڈالنے کے جواز میں اختلاف ہے۔ ...... کعبے کو دیبا کے غلاف سے ڈھانکنے کے جواز پر اجماع ہے۔" (فتح الباری، کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبہ۔)

اور یہی بات علامہ بدرالدین عینی بھی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس میں غلاف کعبہ کے مشروع ہونے کی دلیل پائی جاتی ہے۔" (عمدۃ القاری کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبہ۔)

اسرافِ بےجا کا شُبہ

رہا یہ شبہ کہ اس میں بے جا اسراف ہے، کیوں نہ یہی کپڑا غریبوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے، تو اس کا جواب ہمیں اُس واقعہ میں مل جاتا ہے جو بخاری، ابن ماجہ اور طبرانی نے نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحب ابو وائل، خانۂ کعبہ کے کلید بردار شَیبہ کے پاس کچھ روپے لے کر پہنچے اور اس مقدس گھر کے لئے ہدیہ کے طور پر پیش کئے۔ شَیبہ نے پوچھا، کیا یہ تم اپنی طرف سے دے رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ایک اور شخص کا ہدیہ ہے جو اس نے میرے سپرد کیا تھا۔ میرا اپنا مال ہوتا تو میں ہدیہ نہ کرتا۔ اس پر شَیبہ نے کہا۔ جہاں تم بیٹھے ہو اسی جگہ (یعنی خانۂ کعبہ کے اندر) ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا میں کعبہ کے خزانے میں رتی بھر سونا اور

چاندی بھی نہ رہنے دوں گا۔ سب کچھ نفرادِ مسلمین میں تقسیم کر دوں گا۔ میں نے کہا آپ کے دونوں پیشروؤں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ) نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا کہ وہ تو یقیناً راست رو لوگ تھے، میں انہی کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت عبدالرزاق نے حضرت حسن بصریؒ سے نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کعبہ کے خزانے کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ حضرت اُبیؓ بن کعب کے سامنے انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا آپ کو یہ کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ یہ کیوں؟ انہوں نے جواب دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن تمام ہدیوں اور نذر کے اموال کو جُوں کا توں رہنے دیا تھا جو زمانۂ جاہلیت سے کعبہ کے خزانے میں چلے آ رہے تھے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر سونے چاندی کے وہ ظروف تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رہنے دیئے جو خانۂ کعبہ کے لئے زمانۂ جاہلیت میں ہدیۃً دیئے گئے تھے تو غلافِ کعبہ پر جو مال خرچ ہوتا ہے وہ اِسراف کی تعریف میں کیسے آسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل ہی کی وجہ سے علمائِ اسلام میں کبھی خانۂ کعبہ کو ریشمی غلاف پہنانے کے جواز پر اختلاف نہیں ہوا۔ صحابہؓ و تابعین کے زمانے سے ریشمی غلاف پہنانے کا یہ عمل چلا آ رہا ہے۔ اور اس مسئلے میں کسی کی اختلافی رائے منقول نہیں ہوئی۔

شرک کا شُبہ

اس کے بعد یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کعبے پر غلاف چڑھانا تو درست، مگر کیا وہ غلاف جو کعبے کے لئے تیار کیا گیا ہو اس کا بھی مستحق ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، اس کی زیارت اور مشایعت کی جائے اور

اسے بڑے اہتمام کے ساتھ روانہ کیا جائے ؟ کیا ان افعال میں شرک نہیں پایا جاتا؟ یہ غلاف آخر ایک کپڑا ہی تو ہے محض اس بنا پر کہ یہ کعبے پر چڑھانے کے لئے تیار کیا گیا ہے، اُس کی تعظیم و تکریم کیسے جائز ہو گئی ۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ خانہ کعبہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے۔ معاذاللہ وہ نہ خود خدا ہے، نہ خداوند عالم اس میں رہتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اسے تمام دنیا کے اہل توحید کا قبلہ بنا دیا جس کی طرف رُخ کر کے ہر مومن قیام وقعود اور رکوع وسجود کرتا ہے۔ دوسرے مقامات پر تو کعبہ سامنے نہیں ہوتا لیکن مسجد حرام میں تو سب کی آنکھوں کے سامنے وہ موجود ہوتا ہے اور مسجد کے اندر ہر طرف سے لوگ اسی کی طرف رُخ کر کے ارکان نماز ادا کرتے ہیں جن میں رکوع بھی شامل ہے اور سجدہ بھی۔ پھر حج اور عمرے میں اس عمارت کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ اور ہر طواف کی ابتدا حجرِ اسود کو چوم کر کی جاتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایک پتھر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا ان میں سے کسی فعل کو بھی شرک کہا جا سکتا ہے ؟ ۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے شرک کی جڑ کاٹنے کے لئے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اظہار عبودیت کی جو جو صورتیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور انسانی فطرت پرستش کی جن جن شکلوں کا تقاضا کرتی ہے، اُن سب کو ہر دوسری جگہ ممنوع ٹھیرا دیا، اور صرف ایک خانہ کعبہ کو اپنا گھر قرار دے کر حکم دے دیا کہ ان سب صورتوں سے یہاں ہمارے حضور بندگی بجالاؤ۔ اپنے معبود کے سامنے رکوع وسجود کرنا چاہتے ہو تو اس گھر کی طرف رُخ کر کے جھکو، اور کسی دوسری چیز کے آگے نہ جھکو۔ طواف کرنا چاہتے ہو تو یہ ہمارا گھر ہے، اس کا طواف کرو، کسی اور چیز کا طواف نہ کرو۔ آستانہ بوسی کرنا چاہتے ہو تو حجرِ اسود ہمارا سنگِ آستاں ہے، اسے چومو اور کسی دوسرے آستانے

کو نہ چومو۔ معبود کی چوکھٹ سے چمٹ کر دعائیں کرنا چاہتے ہو تو ملتزم ہماری چوکھٹ ہے، اس سے لپٹو اور گڑگڑا کر دعائیں مانگو۔ تیرتھ یاترا کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہارے لئے تیرتھ ہے، اس کی زیارت کے لئے دنیا بھر سے کھنچ کھنچ کر آؤ اور ہر دوسرے تیرتھ کی یاترا چھوڑ دو۔ اپنے معبود کی بارگاہ پر چادر ریں چڑھانا چاہتے ہو تو یہ ہماری بارگاہ ہے، چادر چڑھانے کا جو جذبہ تمہارے دل میں ہے، یہاں چادر چڑھا کر اس کی تسکین کر لو اور پھر کسی دوسری جگہ چادریں نہ چڑھاتے پھرو۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے ساری دنیا میں ایک گھر کو اپنی طرف نسبتِ خاص دے کر پرستش کی ان ساری شکلوں کو جو مشرکین اپنے بناوٹی معبودوں کے لئے اختیار کرتے تھے۔ ہر آستانے پر حرام کر دیا اور اہلِ توحید کو حکم دیا کہ وہ ساری شکلیں ہمارے اس آستانے پر برتی جائیں اور بس اسی جگہ کے لئے مختص رہیں۔ یوں خانۂ کعبہ کا حکم ہر دوسرے مقام سے مختلف ہو گیا ہے۔ جو کچھ دوسری جگہ شرک ہے وہ یہاں توحید ہے۔

ایسا ہی معاملہ ان اشیاء کا ہے جو اللہ تعالےٰ کی خاطر خانۂ کعبہ میں پیش کرنے کے لئے لے جائی جائیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان کو شعائر اللہ (خدا پرستی کی نشانیاں) قرار دیا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ. (المائدہ-۲)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے شعائر کو حلال نہ کر لو، اور نہ ماہ حرام کو اور نہ ہدی کو اور نہ اُن ہاروں کو جو ہدی کے گلے میں لٹکائے جاتے ہیں اور نہ بیت الحرام کے قصد سے سفر کرنے والوں کو
وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ (الحج-۳۶)	اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ — اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ
فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج: ۳۲) — دلوں کے تقویٰ کی نشانی ہے۔

دیکھیے! ماہ حرام کیا ہے؟ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہی تو ہے۔ مگر کعبے کی نسبت نے اسے شعائر اللہ میں داخل کر دیا۔ ہدی کے اونٹ آخر جانوروں کے سوا اور کیا ہیں؟ مگر چونکہ وہ کعبے کی طرف نذر کے طور پر لے جائے جاتے ہیں اس لیے وہ بھی شعائر اللہ میں شمار ہو گئے۔

اہلِ عرب قدیم زمانے میں ان اونٹوں کے گلے میں جوتوں کے ہار لٹکا دیتے تھے تاکہ دور سے ہی دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ یہ ہدی کے اونٹ ہیں یہ ہار بھی شعائر اللہ بن گئے، کیونکہ انہیں اللہ کے گھر سے نسبت نصیب ہو گئی۔ اب ان شعائر کی تعظیم و تکریم ان اشیاء کی تعظیم و تکریم نہیں بلکہ اس نسبت کی تعظیم و تکریم ہے جو انہیں اللہ کے گھر سے حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ اس بات کی علامت قرار دے رہا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے دل میں تقویٰ ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھنے میں آخر کیا مشکل ہے کہ جو کپڑا کعبے پر غلاف چڑھانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اس کا احترام بھی ایک کپڑے کا احترام نہیں بلکہ اس نسبت کا احترام ہے جو اسے کعبے کے ساتھ حاصل ہو گئی ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے جو شخص بھی آتا ہے، اسے اللہ کے گھر کی محبت کھینچ کر لاتی ہے نہ کہ ایک کپڑے کو دیکھنے کی خواہش۔ اسے بیت اللہ کی طرف بھیجنے کے لیے جو مشایعت کی جاتی ہے وہ اس شوق کا ایک مظہر ہے جو مسلمان خود بیت اللہ کی زیارت کے لیے اپنے دلوں میں پالتے ہیں۔ اس حد تک جو کچھ کیا جائے وہ تو شرک کی تعریف میں نہیں آتا۔ البتہ اس سے تجاوز کرکے اگر کوئی شخص غلاف کو چومے اور اس کا طواف کرے اور اس سے چمٹ کر دعائیں مانگے اور اس کی طرف رُخ کرکے رکوع و سجود کرنے لگے تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا کیونکہ یہ سب امور صرف بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں، غلاف کے کپڑے

کو اللہ نے اپنا گھر قرار نہیں دیا ہے۔

غلافِ کعبہ کی تاریخ

اب ہم مختصراً یہ بیان کریں گے کہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی ابتداء کب ہوئی اور اُس وقت سے آج تک اس کی تاریخ کیا رہی ہے۔ اس تاریخ کے مآخذ حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) فتح الباری شرح صحیح بخاری، علامہ ابن حجر۔ (۲) سیرۃ ابن ہشام۔ (۳) اخبارِ مکہ، محمد بن عبداللہ الاَزرَقی۔ (۴) شفاء الغرام، تقی الدین الفاسی۔ (۵) الاعلام، قطب الدین الحنفی۔ (۶) تاریخ الکعبہ، عبداللہ باسلامہ۔ (۷) مرأۃ الحرمین، ابراہیم رفعت پاشا۔

فتح مکہ سے پہلے

غلاف کے بارے میں زمانۂ قدیم کی تاریخ کا کوئی مرتب اور معتبر ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ لیکن اُس زمانے کی جو روایات علماء اسلام تک پہنچی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبے پر غلاف چڑھایا تھا۔ اس کے بعد صدیوں تک تاریخ خاموش ہے۔ پھر یہ ذکر ملتا ہے کہ عدنان نے یہ خدمت انجام دی۔ اس کے بعد پھر کئی صدی تک کی تاریخ غائب ہے۔ تیسرا شخص جس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے سرخ رنگ کے دھاری دار یمنی کپڑے (الوصائل) کا مکمل غلاف کعبے پر چڑھایا۔ وہ یمن کا ایک بادشاہ اسعد تھا جس کا زمانہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سو برس پہلے گزرا ہے۔

غلاف کی مسلسل تاریخ ہم کو اُس وقت سے ملتی ہے جب خانۂ کعبہ کا انتظام قبیلۂ قریش کے ہاتھوں میں آیا۔ اس قبیلے کی روایات زمانۂ اسلام تک محفوظ رہی ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اس نے انتظام سنبھالا

اس کے مختلف خاندان ہر سال باری باری سے کعبے پر غلاف چڑھایا کرتے تھے پھر بنی مخزوم کے ایک سردار ابو ربیعہ نے یہ طے کیا کہ ایک سال غلاف وہ چڑھایا کرے گا اور ایک سال کا غلاف قریش کا کوئی خاندان اپنی طرف سے چڑھائے۔

اس کے علاوہ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اور قبائلی سردار جب زیارت کے لئے آتے تھے تو کعبے پر لٹکانے کے لئے طرح طرح کے پردے لاتے تھے۔ جتنے لٹکائے جا سکتے تھے اتنے لٹکا دیئے جاتے اور باقی کعبے کے خزانے میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ جب کوئی پردہ بوسیدہ ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا پردہ لٹکا دیا جاتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا واقعہ ہے کہ حضورؐ کی دادی کے ایک صاحبزادے (غالباً حضرت عباسؓ بن عبد المطلب) گم ہو گئے تھے۔ انہوں نے نذر مانی کہ اگر بچہ مل گیا تو وہ کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھائیں گی۔ جب وہ مل گئے تو انہوں نے اپنی نذر پوری کی اور سفید رنگ کا ریشمی غلاف کعبے پر چڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کعبے پر ریشم کا غلاف چڑھایا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پانچ سال پہلے جب قریش نے کعبے کی ازسرِنو تعمیر کی تو پورے قبیلے نے بڑے اہتمام سے کعبے پر غلاف چڑھایا ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ قبیلۂ بنی سُلیم کے ایک صاحب اپنی ماں کے ساتھ زیارتِ کعبہ کے لئے گئے ہوئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانہ میں اُنہوں نے کعبے پر مختلف قسم کی اور مختلف رنگوں کی چادریں لٹکی ہوئی دیکھی تھیں۔

فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کا یہ اعلان کہ فلاں فلاں اشخاص اگر کعبے کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے، اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اُس وقت کعبے پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔

فتح مکّہ کے بعد

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، فتح کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ آج وہ دن ہے جب اللہ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا اور اب ہم اس پر غلاف چڑھائیں گے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک عورت غلافِ کعبہ کو خوشبو دینے کے لئے بخور جلا رہی تھی۔ اتفاقًا کپڑا آگ پکڑ گیا اور پورا غلاف جل گیا۔ اس طرح اللہ تعالٰے نے زمانۂ جاہلیت کا لبادہ کعبے پر سے خود اتار دیا اور پھر زمانۂ اسلام میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اللہ کے گھر پر غلاف چڑھایا۔ یہ روایت علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں حضرت سعید بن المُسَیَّب سے نقل کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں کعبے پر یمنی کپڑے کا غلاف چڑھاتے تھے۔ پھر جب مصر فتح ہو گیا تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ قباطی (مصری کپڑے) کا غلاف بنوانے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے اپنے عہدِ خلافت میں غلاف چڑھایا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں روایات خاموش ہیں۔ ممکن ہے کہ فتنوں نے آنجنابؓ کو اس خدمت کا موقع نہ دیا ہو۔

قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ جب حج کے بعد سب حاجی رخصت ہو جاتے تھے تو ۱۰ محرّم کو کعبے پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی عمل ہوتا رہا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے عہد میں یوم عاشوراء پر غلاف چڑھانے کے علاوہ ایک اور غلاف عید الفطر کے موقع پر بھی چڑھانا شروع کر دیا۔ یہ بات بھی روایات سے معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ اسلام میں سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے اپنے عہد میں ریشمی غلاف بنوایا تھا۔ پھر یزید اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تقلید کی، اور عبدالملک بن مروان کے عہد سے یہی

مستقل طریقہ بن گیا جو آج تک جاری ہے۔ اس عمل کی ابتدا جس وقت ہوئی تھی اُس وقت بکثرت صحابہ و تابعین اور جلیل القدر فقہاء موجود تھے۔ کسی نے ریشمی غلاف پر اعتراض نہیں کیا۔ اسی وجہ سے بعد کے علماء بھی اس کے جواز پر متفق رہے۔

زمانۂ اسلام سے پہلے مختلف لوگ کعبے پر چڑھانے کے لئے چادریں لایا کرتے تھے۔ اسلامی دور میں غلاف چڑھانا حکومت کی ذمہ داری قرار پا گیا۔ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا ہم کعبے پر غلاف چڑھائیں؟ انہوں نے فرمایا اب تمہیں اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ حکام نے تمہاری طرف سے اس خدمت کو سنبھال لیا ہے۔ ایک روایت میں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ "کسوۃ البیت علی الامراء" "بیت اللہ کا غلاف حکام کے ذمہ ہے"۔

عباسی خلافت کے زوال تک غلاف کی تیاری مرکزی حکومت کے انتظام میں ہوتی رہی۔ پھر جب کوئی مرکزی حکومت باقی نہ رہی تو مختلف علاقوں کے سلاطین اپنی طرف سے غلاف بنوا کر بھیجتے رہے اور بسا اوقات بیک وقت کئی کئی غلاف بھی چڑھائے گئے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ہندوستان سے بھی (۴۶۶ھ میں) غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا، اور چونکہ اس زمانہ میں اسلامی حکومت اُن علاقوں تک محدود تھی جو اب پاکستان میں شامل ہیں، اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غلاف پاکستان سے بن کر گیا تھا۔

۷۵۰ھ میں مصر کے فرمانروا الملک الصالح اسماعیل بن ناصر نے غلافِ کعبہ تیار کرانا اپنے ذمہ لے لیا اور اس غرض کے لئے تین گاؤں وقف کر دیئے اس وقت سے موجودہ زمانے تک مصر ہی سے غلاف بن کر آتا رہا ہے۔ مصر پر ترکی سلاطین کا قبضہ ہو جانے کے بعد سلطان سلیمان اعظم نے ملک الصالح کے اس وقف میں سات گاؤں کا اور اضافہ کر دیا اور اس عظیم وقف کی آمدنی

سے ہر سال کعبہ کا غلاف، اور ہر پانچویں سال حجرۂ نبوی کے پردے اور منبر نبوی کا غلاف مصر سے بن کر آنے لگا۔ اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کے اندر کے پردے بھی وقتاً فوقتاً اسی وقف سے بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں اس وقف کی آمدنی ۲۶۶۷۳۶ درہم تھی جسے موجودہ زمانہ کے مصری سکے کے لحاظ سے ۵۰ ہزار اور ایک لاکھ درہم مصری پاؤنڈ کے درمیان سمجھنا چاہیئے مگر جب پچھلی صدی کے آغاز میں مصر کے وائسرائے محمد علی پاشا نے ترکی سلطنت سے بغاوت کر کے خود مختاری اختیار کر لی تو اس نے یہ وقف منسوخ کر دیا اور صرف غلافِ کعبہ حکومتِ مصر کے خرچ پر بنوا کر بھیجنا شروع کر دیا کعبے کے اندرونی پردے اور حجرۂ نبوی کے پردے آج تک مصر سے نہیں بھیجے گئے۔

آج جو پردے وہاں پڑے ہوئے ہیں وہ سب سلطان عبدالعزیز (۱۸۳۰ء۔ ۱۸۷۶ء) کے زمانہ کے ہیں اور بہت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ کعبے کا جو غلاف اب مصر سے بن کر آتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار مصری پونڈ کا ہوتا ہے۔

پہلے غلاف مختلف رنگوں کے ہوا کرتے تھے۔ مامون الرشید نے سفید رنگ کا غلاف چڑھایا تھا۔ محمود غزنوی کے غلاف کا رنگ زرد تھا۔ مصر کے فاطمی خلفاء سفید رنگ کے غلاف بھیجتے تھے۔ خلیفہ ناصر عباسی (۵۸۰ھ۔ ۶۲۲ھ) نے ابتداء میں سبز غلاف بنوایا تھا۔ پھر سیاہ ریشم کا بنوا کر بھیجا۔ اس کے بعد سے سیاہ غلاف ہی بنوایا جاتا رہا اور آج تک یہی طریقہ جاری ہے۔

غلافِ کعبہ کے چاروں طرف زری کے کام کی پٹی بنانے اور اس پر کعبہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات لکھوانے کا سلسلہ سب سے پہلے ۷۶۱ھ میں مصر کے سلطان حسن نے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ پٹی لگانے کا طریقہ آج تک چل رہا ہے۔ اس پٹی پر حسبِ ذیل آیات لکھی جاتی ہیں۔

ایک طرف: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً ۔ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (آل عمران: ۹۶-۹۷)

دوسری طرف، جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ وَالْھَدْیَ وَالْقَلَآئِدَ ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ (المائدہ: ۹۷)

تیسری طرف، وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۔ (البقرۃ: ۱۲۷-۱۲۸)

چوتھی جانب اس فرمانروا کا نام لکھا جاتا ہے جس نے غلاف بنوایا ہو۔

موجودہ صدی کے آغاز تک غلافِ کعبہ دنیا کے سیاسی حالات سے غیر متاثر رہا۔ لڑائیاں ہوتی تھیں، سلطنتوں کے تعلقات بنتے اور بگڑتے تھے مگر کعبہ کے لئے غلاف جہاں سے آیا کرتا تھا وہیں سے آتا رہا۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں دنیا کے سیاسی حالات اس پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ جنگِ عظیم اوّل میں جب ترکی سلطنت جرمنی کے ساتھ شریکِ جنگ ہو گئی تو اسے اندیشہ ہوا کہ انگریز مصر سے غلاف کے آنے میں مانع ہوں گے۔ اس لئے اس نے استنبول سے ایک نہایت شاندار غلاف بنوا کر حجاز ریلوے کے ذریعہ سے مدینہ بھیج دیا۔ مگر چونکہ مصر سے عین وقت پر غلاف پہنچ گیا تھا اس لئے وہ ترکی غلاف مدینہ طیبہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں شریف حسین اور حکومتِ مصر کے تعلقات خراب ہو گئے اور مصری حکومت نے عین حج کے موقع پر جدہ پہنچے ہوئے غلاف کو واپس منگوا لیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ مصری غلاف کام آ گیا جو جنگ کے زمانہ میں ترکی حکومت نے مدینہ طیبہ بھیج رکھا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں سلطان ابن سعود اور شریف حسین کی لڑائی

کے زمانے میں مصر سے غلاف نہ آیا۔ اور ابن سعود نے عراق کا بنا ہوا ایک غلاف چڑھادیا جو شریف حسین نے احتیاطاً بنوا کر رکھ چھوڑا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ٹھیک یکم ذی الحجہ کو حکومت مصر نے غلاف بھیجنے سے انکار کر دیا اور ابن سعود کو فوراً مکہ میں ایک غلاف بنوانا پڑا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں بھی مصری غلاف نہ آیا اور امرتسر سے مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل غزنوی کے اہتمام میں غلاف بنوا کر بھیجا گیا۔

ان تجربات کی بناء پر اسی زمانہ میں مکہ معظمہ کے اندر ایک دار الکسوہ قائم کر دیا گیا تھا تاکہ مصر سے آئے دن غلاف نہ آنے کی مصیبت کا مستقل علاج کر دیا جائے۔ اس کارخانے میں مولانا اسماعیل غزنوی مرحوم کی مدد سے ہندوستان کے بہت سے کاریگر فراہم کئے گئے تھے۔ کچھ مدت تک وہیں غلاف تیار کیا جاتا رہا۔ پھر سعودی حکومت اور مصر کے تعلقات درست ہو گئے اور وہاں سے غلاف کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب پچھلے سال وہی قضیہ پھر پیش آیا اور سیاسی تعلقات کی خرابی نے مصری غلاف کی آمد کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد اس سال پاکستان کی سرزمین پر غلاف کا کپڑا تیار ہو رہا ہے۔ پورے غلاف کے لئے ایک ہزار گز کپڑا درکار ہوتا ہے۔ پاکستان سے صرف یہ کپڑا ہی بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ زری کے کام کی پٹی مکہ معظمہ کے دار الکسوہ میں تیار کی جائے گی۔

(ترجمان القرآن مارچ ۱۹۶۳ء)

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدِنِ الَّذِیْ اَرْسَلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ۔

حضرات! قبل اِس کے کہ میں آپ کی خدمت میں عید کے متعلق کچھ عرض کردں، یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رویت ہلال کے معاملے میں کل جو صورت پیش آئی ہے، اُس کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ اس لئے کہ کل عید کے قبول نہ کئے جانے کی ذمہ داری میں مَیں بھی شریک ہوں۔ اس معاملے میں سب سے پہلے دو اصولی باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

رویتِ ہلال کا شرعی ضابطہ

اوّل یہ کہ اگر کوئی واقعہ ایسی حالت میں پیش آئے جب کہ کثیر تعداد

---

[1] یہ وہ تقریر ہے جو یکم شوال ۱۳۸۶ھ کو بروز جمعہ عید الفطر کے موقع پر گلبرگ لاہور کے اجتماع میں کی گئی تھی۔

دیکھنے والوں کی موجود ہو تو ایسی صورت میں دو چار آدمیوں کا یہ کہنا کہ واقعہ اِس شکل میں پیش آیا دراں حالیکہ ہزاروں آدمی جو موجود تھے، اُنھوں نے اس کو نہیں دیکھا، قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر واقعہ کسی بند کمرے میں پیش آیا ہو جہاں دو تین ہی آدمی دیکھنے والے ہوں تو اُس صورت میں اُن کی شہادت قابلِ غور ہو سکتی ہے۔ اِس حالت میں واقعہ کی تحقیق کے لئے اُن کی شہادت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس پر انحصار کیا جا سکے۔ اور اُن کی شہادت کو ردّ یا قبول کرنے کے لئے بس یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ گواہ جھوٹے ہیں یا سچے اور ان کا کوئی خاص مفاد تو واقعہ کو اس شکل میں بیان کرنے سے وابستہ نہیں ہے۔ اور اُن کی شہادتوں میں کوئی خاص تناقض تو نہیں ہے جس کی بناء پر وہ قابلِ قبول نہ ہوں۔

اگر وہ سچے لوگ ہوں اور اُن کا ذاتی مفاد بھی اس معاملے سے متعلق نہ ہو، اور اُن کے بیانات میں تناقض بھی نہ ہو تو ان کے قول کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اب دیکھیے کہ چاند کا آسمان پر نکلنا، اگر مطلع صاف ہو تو اُس کے دیکھنے والے لاکھوں آدمی ہوتے ہیں۔ اِس کا فیصلہ دو چار یا چند آدمیوں کی شہادت پر نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ آسمان پر جو چیز نمایاں ہو، اُسے لاکھوں آدمی تو نہ دیکھ سکیں اور بس دو چار یا دس پانچ آدمی دیکھ لیں۔ البتہ اگر مطلع صاف نہ ہو اور بادل فضا پر چھائے ہوئے ہوں، اِس صورت میں دو چار آدمی اگر یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو اُن کی یہ شہادت قابلِ غور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے بدلی کہیں سے ہٹی ہو اور کسی کو چاند نظر آ گیا ہو، اِس صورت میں صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ یہ لوگ سچے ہیں یا نہیں اور خود روزے نماز کے پابند ہیں یا نہیں کیونکہ جو شخص خود روزے نماز کا پابند نہ ہو اُسے اِس بات کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ لوگوں کے روزے ٹوٹیں یا رہیں۔ لہٰذا اگر ایسے بھروسے کے قابل آدمی شہادت دیں تو اُن کی

شہادت پر رویت ہلال کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔
دوسری اصولی بات جو آپ کے ذہن میں اچھی طرح سے صاف ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ رویت ہلال کے معاملے میں پہلے مرحلے پر شہادت درکار ہوتی ہے، اور دوسرے مرحلے پر صرف خبر کافی ہو جاتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اس امر کی شہادت قائم ہونی چاہیئے کہ چاند ایسے چند آدمیوں نے دیکھا ہے جو بھروسے کے قابل تھے کسی معتبر مجلس یا کسی مفتی یا قاضی نے یہ شہادتیں لی ہوں۔ ان شہادتوں کی بنا پر جب وہ مطمئن ہو کر رویتِ ہلال کا اعلان کر دے تو اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہر ایک آدمی یا تو خود چاند دیکھے یا اس کے سامنے شہادتیں پیش ہوں۔ بلکہ مجلس مجاز یا مفتی یا قاضی کے اعلان کی بنا پر اگر سائرن بجیں یا نقارے بجیں یا شہر میں عام چرچا ہو کہ چاند دیکھا گیا تو عام لوگوں کے لئے یہ خبر کافی ہے۔
ان دو اصولی باتوں کو سمجھ لینے کے بعد اب دیکھیئے کہ گزشتہ بدھ کو یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی ہے۔ اس روز آپ جانتے ہیں کہ لاہور شہر میں مطلع صاف تھا، لاکھوں آدمی چاند دیکھنے والے موجود تھے، مگر پورے شہر میں کسی نے چاند نہیں دیکھا تھا۔ پونے آٹھ بجے خبروں میں یہ اعلان کیا گیا کہ چاند دیکھ لیا گیا ہے، کل عید ہو گی۔ مگر اس میں کوئی صراحت اس امر کی نہیں تھی کہ چاند کہاں دیکھا گیا اور کیا شہادت اس کے دیکھے جانے کی قائم ہوئی۔ یہ خبر سننے کے بعد دلوں میں شبہات پیدا ہوئے اور میں بھی پریشانی میں مبتلا ہو گیا آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ لاہور میں لاکھوں آدمی آسمان پر آنکھیں لگائے ہوئے ہوں، مطلع بھی صاف ہو اور پھر یہاں تو چاند نظر نہ آئے اور دوسری کسی جگہ دیکھ لیا جائے۔
یہ خبر سننے کے بعد میں نے مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں خود بھی ٹیلیفون کئے اور مغربی پاکستان کے مختلف حصوں سے میرے پاس بھی ٹیلیفون مسلسل آنے شروع ہوئے۔ کراچی، نواب شاہ، صادق آباد، رحیم یار خان،

خان پور، ملتان، سرگودھا، حافظ آباد، گجرات، گوجرانوالہ، نارووال، سیالکوٹ لائلپور، راولپنڈی، غرض مختلف مقامات سے یہ خبر ملی کہ ہر جگہ مطلع صاف تھا مگر چاند کہیں نہیں دیکھا گیا۔ اس کے بعد یہ اطلاعات آنی شروع ہوئیں کہ ملتان میں، سرگودھا میں، لائل پور میں، گجرات میں، گوجرانوالہ میں، حافظ آباد میں اور بعض دوسرے مقامات پر علماء حنفیہ یہ رائے قائم کی ہے کہ چاند نکلنے کا کوئی قابل اطمینان ثبوت بہم نہیں پہنچا۔ اس وجہ سے کل عید نہیں ہوگی بلکہ روزہ رکھا جائے گا۔ میرا خود بھی اس معاملے میں پورا اطمینان ہو گیا کہ چاند نکلنے کا ثبوت بہم نہیں پہنچا ہے۔

ریڈیو پر جو اطلاعات بعد میں دی گئیں، وہ یہ تھیں کہ مالاکنڈ، مردان، پشاور اور کوہاٹ میں چاند دیکھا گیا ہے۔ لیکن ان میں بھی اس بات کی صراحت نہیں تھی کہ آیا وہاں مطلع صاف تھا یا نہیں۔ اگر مطلع صاف تھا تو کیا وہاں جم غفیر نے دیکھا ہے؟ اگر مطلع صاف نہیں تھا تو کیا وہاں شرعی طریقے سے شہادت بہم پہنچی ہے اور اس کی بناء پر یہ فیصلہ دیا جا رہا ہے؟ ان امور کی صراحت نہ ہونے کی صورت میں یہ بات باور کرنے کے قابل نہیں تھی کہ کراچی سے لے کر راولپنڈی تک مطلع صاف ہو، لاکھوں آدمی جگہ جگہ آسمان کی طرف نگاہ لگائے ہوئے ہوں اور کہیں ان کو چاند نظر نہ آسکے، مگر مالاکنڈ میں وہ نظر آجائے۔ یا مردان یا پشاور میں لوگ اسے دیکھ لیں۔ مزید شبہ پیدا کرنے والی بات یہ تھی کہ جس علاقے کا حوالہ دیا جا رہا ہے، وہاں برسوں سے پاکستان کے باقی تمام علاقوں سے مختلف ایام میں روزے شروع بھی کئے جاتے رہے ہیں اور عید بھی کی جاتی رہی ہے۔ اب بھی ۱۲ جنوری کے پاکستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مردان اور چارسدہ کے بعض مقامات پر بدھ کے روز عید کی گئی ہے ایسی

صورت میں ہمارے لئے یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہ ہوسکتی تھی کہ جمعرات کو عید کی جائے۔ دینی حیثیت سے یہ معاملہ بڑا نازک ہے۔ اگر رؤیت ہلال ثابت نہ ہو اور ہم روزہ چھوڑ کر عید منالیں تو گناہ عظیم ہے اور اگر رویت ثابت ہو اور ہم عید کرنے کی بجائے روزہ رکھ لیں تو گناہ عظیم ہے۔ اور یہ کسی ایک شخص کا انفرادی معاملہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک پوری قوم کے کروڑوں آدمیوں کا معاملہ ہے۔ اس میں تساہل سے کیسے کام لیا جا سکتا ہے۔ اِس صورت میں ہماری یہ ذمہ داری تھی کہ ہم ملک کے لوگوں کو خبردار کردیں کہ رؤیت ہلال کی کوئی قابل اطمینان شہادت قائم نہیں ہوئی ہے، اس لئے لوگ جمعرات کا روزہ رکھیں اور عید نہ کریں۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ملک کے لوگوں کو خبر کرنے کا نہیں تھا۔ ریڈیو کو ہم استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اخبارات میں عام اعلان بھی نہیں کرا سکتے تھے۔ صرف ایک اخبار نے یہ جرأت کی کہ میرا پورا بیان شائع کر دیا۔ شہر میں مساجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے بھی اعلان کم ہی کیا جا سکا۔ اسی وجہ سے وہ افراتفری رونما ہوئی جو کل دیکھی گئی ہے۔

جمعرات کی شام کو جو چاند دیکھا گیا ہے، اُس نے حقیقت حال کو سارے ملک کے سامنے کھول دیا ہے۔ کوئی شخص بھی اس چاند کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دوسری تاریخ کا چاند تھا۔ اگر ۲۹ کو چاند ہو چکا ہوتا تو لازماً یہ دوسری تاریخ کا چاند ہونا چاہیے تھا۔ کیا دوسری تاریخ کا چاند بھی کسی نے ایسا باریک اور دھندلا دیکھا ہے؟ اب بعض لوگ یہ سوال کر رہے ہیں کہ اگر یہ ۳۰ کا چاند تھا تو زیادہ دیر تک کیسے نظر آتا رہا؟ ان حضرات کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ۲۹ تاریخ کا چاند تھوڑی دیر کے لئے نظر آتا ہے اور جلدی غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ۳۰ کا چاند خاصی دیر تک ٹھیرتا ہے۔ لیکن ۲۹ کا چاند ایسا دھندلا ہوتا ہے کہ آسمان پر اُس کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تلاش کے بغیر وہ نظر نہیں آتا اور دوسری تاریخ کا چاند خود سامنے موجود ہوتا ہے

اُس کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی[1]

یہ ہے اس معاملے میں صحیح صورتِ حال۔ ہمارے لئے یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ایک مسلمان حکومت کا فرض ادا کرنے کی کوشش کی اور رؤیتِ ہلال کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہم تو خود چاہتے تھے کہ وہ ان فرائض کو ادا کرے جو ایک مسلمان حکومت پر عائد ہوتے ہیں، لیکن اس کام کے لئے جو انتظام اس نے کیا ہے، وہ قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ اُس کی وجہ سے پچھلے سال بھی عید میں گڑبڑ ہوئی تھی، جس کا خود حکومت کو اعتراف کرنا پڑا۔ اب اس سال جو صورتِ حال

---

[1] توضیح مزید: اس تقریر میں ــــــــــ رؤیتِ ہلال کے مسئلے پر جو بحث کی گئی ہے اُس کے سلسلے میں دو امور اور بھی ایسے ہیں جنھیں نگاہ میں رہنا چاہیئے۔

۱۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء تک ۱۲ سال کے دوران میں پورے ۹ سال ایسے گزرے ہیں جن میں سابق صوبہ سرحد کے اکثر و بیشتر مقامات کی عید پاکستان کے باقی تمام حصوں سے ایک یا دو دن پہلے ہوئی ہے۔ صرف تین سال (۱۹۵۷ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء) ایسے تھے جن میں پورے ملک کی عید ایک دن ہوئی اور یہ وہ سال تھے جن میں سب جگہ ۲۹ کا چاند دیکھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر اخبارات کے فائل گواہ ہیں۔ اب ۱۹۶۷ء میں پہلی مرتبہ رؤیتِ ہلال کے معاملہ میں صوبہ سرحد کی اطلاعات کو پورے ملک کے لئے حجت قرار دینے پر اصرار کیا گیا ہے، حالانکہ یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ وہاں باقی ملک سے پہلے چاند نظر آنے کی کیا خاص وجہ ہے۔

۲۔ ۲۴ جنوری کی شام کو لاہور میں جو چاند دیکھا گیا وہ یقیناً بدرِ کامل نہ تھا۔ حالانکہ اگر ۱۲ جنوری کو شوال کی پہلی تاریخ ہوئی تو یہ چودھویں کا چاند ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ مکمل بھی نہ تھا اور اتنی بلندی پر تھا، جس پر چودھویں کا چاند کبھی نہیں ہوتا۔ بدرِ کامل کا ظہور یہاں ۲۵ جنوری کو ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوال کی پہلی تاریخ ۱۲ جنوری کو تھی نہ کہ ۱۲ کو۔

اگر سابق صوبہ سرحد میں چاند کی یہ کیفیت نہیں پائی گئی ہے تو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہاں کا مطلع پاکستان کے دوسرے حصوں سے مختلف ہے۔

پیش آئی ہے، اُس نے رُویتِ ہلال کے موجودہ سرکاری انتظام کو اس حد تک ناقابلِ اطمینان ثابت کر دیا ہے کہ آئندہ اُس کے اعلانات پر کوئی اعتماد نہ کیا جا سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اِس طریقہ کو فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ رُویت کے انتظام کی صحیح صُورت یہ ہے کہ ہر ضلع میں رُویتِ ہلال کمیٹیاں بنائی جائیں جن کے اندر ایسے قابلِ اعتماد علماء کو شامل کیا جائے، جن کی دیانت پر لوگوں کو عام طور پر اعتماد ہو۔ اِسی طرح مرکزی رویت ہلال کمیٹی میں بھی ایسے لوگوں کو شامل کیا جائے جو اپنے دین اور اخلاق کے لحاظ سے لوگوں میں عام طور پر قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ یہ تمام کمیٹیاں اس امر کا پُورا اہتمام کریں کہ جس روز عید کا چاند ہونے کا احتمال ہو، اس روز شرعی طریقے سے رُویت ہونے یا نہ ہونے کا پورا ثبوت بہم پہنچا کر مرکزی رُویتِ ہلال کمیٹی کو اس کی اطلاع کریں۔ مرکزی کمیٹی ریڈیو پر تفصیل کے ساتھ یہ بیان نشر کرے کہ کن ذرائع معلومات کی بناء پر وہ چاند ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے۔

اِس رپورٹ کو خود کمیٹی ہی کا کوئی ذمہ دار آدمی ریڈیو پر آکر ملک کے سامنے پیش کرے۔ محض کسی اناؤنسر کے ذریعے سے یہ سُنا دینا کہ چاند دیکھ لیا گیا ہے، ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ یہ طریق کار اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ عید پر ملک میں افراتفری برپا ہو سکے۔

عیدالفطر کی حقیقی اہمیت اور نظامِ دین میں اُس کی اہمیت

اِس سلسلہ میں ایک بات اور توضیح طلب ہے جسے صاف کر دینا ضروری ہے۔ بعض حلقے یہ خیال بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں کہ عید اسلامی اتحاد کا ایک اہم نشان ہے، اس لیے تمام مسلمانوں کی عید لازماً ایک دن ہونی چاہیئے۔ ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ساری دُنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہو اور کچھ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کی عید تو ایک ہی دن

ہونی ضروری ہے۔ لیکن درحقیقت یہ فکر ونظر کی غلطی ہے۔ دین سے ناواقفیت کی بناء پر ایسی باتیں کی جا رہی ہیں اور یہ باتیں زیادہ تر وہ لوگ کر رہے ہیں، جو رمضان کے روزے تو نہیں رکھتے، مگر عید کے معاملے میں اسلامی اتحاد کی انہیں بڑی فکر ہے۔

اِن حضرات کو پہلی غلط فہمی تو یہ لاحق ہوتی ہے کہ عید اُن کے نزدیک کرسمس یا ہولی یا دیوالی کی طرح کوئی تہوار ہے یا پھر یہ کوئی قومی جشن ہے جسے مسلمانوں کے قومی اتحاد کا نشان بنایا گیا ہے۔ حالانکہ دراصل عید کا تعلق ایک عبادت سے ہے جو رمضان کے آغاز سے شروع ہوتی ہے اور رمضان کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر دو رکعت نماز پڑھ کر ختم کی جاتی ہے۔ شریعت کے صریح احکام کی رُو سے اِس عبادت کا آغاز اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک قابلِ اطمینان طریقہ سے یہ معلوم نہ ہو کہ رمضان شروع ہو چکا ہے اور اس کا اختتام بھی اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ایسے ہی قابلِ اطمینان طریقہ سے یہ علم نہ ہو جائے کہ رمضان ختم ہو چکا ہے۔ قرآنِ مجید کا صاف حکم ہے کہ:-

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ .... فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ـ "رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے .... پس تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے (یا اس میں موجود ہو) وہ اس کے روزے رکھے۔"

یہ آیت قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ رمضان کا مہینہ جب سے شروع ہو اور جب تک وہ رہے، ہر مسلمان کو اس کے روزے رکھنے چاہئیں۔ اور اِس مہینے کے روزوں کی تکمیل کئے بغیر کسی عید کا ہرگز کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اِس معاملے میں اصل چیز مسلمانوں کا اتحاد نہیں ہے بلکہ ماہ رمضان کا اختتام ہے، جس کا اطمینان حاصل کرنا عید کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اب یہ خیال رہے کہ رمضان ایک قمری مہینہ ہے، جس کا انحصار رُویتِ ہلال پر ہے اور اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت موجود ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو،

اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو۔ لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس روزوں کی تعداد پوری کرو، اِلّا یہ کہ دو قابلِ اعتماد گواہ یہ شہادت دیں کہ اُنہوں نے چاند دیکھا ہے حضورؐ نے اس ارشاد میں دو باتیں صاف متعین فرمادی ہیں۔ ایک یہ کہ رُویت کی شہادت اُس وقت درکار ہوگی جب کہ مطلع صاف نہ ہو، دُوسرے یہ کہ اِس صُورت میں خبر پر نہیں بلکہ دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت کا فیصلہ کیا جائے گا اور شہادت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ تار یا ٹیلیفون یا ریڈیو پر نہیں ہو سکتی اس کے لئے گواہوں کا سامنے موجود ہونا ضروری ہے۔ آپ کسی عدالت کو ٹیلیفون پر شہادت دے کر دیکھیں آپ کو خود معلوم ہوجائے گا کہ یہ شہادت قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس ٹیلیفونی "شہادت" کو دُنیا کی کوئی عدالت نہیں مان سکتی، آخر ہم سے کیوں چاہا جاتا ہے کہ ہم ایک ایسے اہم شرعی معاملے میں اس پر اعتماد کرلیں جس پر کروڑوں مسلمانوں کے روزے ٹوٹنے یا قائم رہنے کا انحصار ہے؟

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ساری دُنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیئے وہ تو بالکل ہی لغو بات کہتے ہیں، کیونکہ تمام دنیا میں رویتِ ہلال کا لازماً اور ہمیشہ ایک ہی دن ہونا ممکن نہیں ہے۔ رہا کسی ملک یا کسی ایک بڑے علاقے میں سب مسلمانوں کی ایک عید ہونے کا مسئلہ تو شریعت نے اس کو بھی لازم نہیں کیا ہے۔ یہ اگر ہو سکے اور کسی ملک میں شرعی قواعد کے مطابق رُویت کی شہادت اور اس کے اعلان کا انتظام کر دیا جائے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے اور نہ شریعت کی نگاہ میں یہ کوئی برائی ہے کہ مختلف علاقوں کی عید مختلف دنوں میں ہو۔

خدا کا دین تمام اِنسانوں کے لئے ہے اور ہر زمانے کے لئے ہے آج آپ ریڈیو کی موجودگی کی بناء پر یہ باتیں کر رہے ہیں کہ سب کی عید ہونی چاہیئے

مگر آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تک پورے برِ صغیر ہند تو درکنار، اس کے کسی ایک صوبے میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لئے جانے کی اطلاع سب مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ اگر شریعت نے عید کی وحدت کو لازم کر دیا ہوتا تو پچھلی صدیوں میں مسلمان اس حکم پر آخر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ پھر آج بھی اس کو لازم کر کے عید کی یہ وحدت قائم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ مسلمان صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں رہتے۔ دور دراز دیہات میں بھی رہتے ہیں اور بہت سے مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی مقیم ہیں۔ وحدتِ عید کو ایک لازمی شرعی حکم بنانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہونے کے لئے ملک میں صرف ایک ریڈیو اسٹیشن کا ہونا ہی ضروری نہ ہو، بلکہ ہر شخص کے پاس یا ہر گھر کے لوگوں کے پاس یا مسلمانوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بستی میں ایک ریڈیو سیٹ یا ایک ٹرانزسٹر بھی ضرور ہو ورنہ وہ اپنے شرعی فرائض ادا نہ کر سکیں گے۔ کیا یہ آلات بھی ایمان کا ایک لازمی جزو قرار پائیں گے؟ خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کئے ہیں جن سے ہر مسلمان کے لئے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر نہیں کئے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لئے اُس کے دین کا ایک جز بن جائے، بلکہ اُس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالمگیر مناظر کو اوقاتِ نماز کی علامت قرار دیا۔ جنہیں ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔

اسی طرح اُس نے روزے شروع اور ختم کرنے کے لئے بھی رمضان اور شوال کے چاند کی رُؤیت کو علامت قرار دیا ہے جو عالمگیر مشاہدے کی چیز ہے اور ہر مسلمان ہر جگہ چاند دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ اب رمضان شروع ہوا اور اب ختم ہو گیا۔ اگر وہ اس کی بنیاد جنتری کے حساب کو قرار دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہر مسلمان کے لئے یا تو فلکیات اور نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اُس کے دین کا ایک جز بن جاتی جسے پاس رکھے بغیر

وہ فرائضِ دینی ادا نہ کر سکتا۔ اور اگر وہ یہ حکم دیتا کہ ایک جگہ کی رُویت سے ساری دنیا میں یا رُوئے زمین کی ایک ایک اقلیم میں روزے شروع اور ختم کرنا فرض ہے تو خبر رسانی کے موجودہ ذرائع کی ایجاد سے پہلے تو مسلمان اس دین پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے۔ رہا ان کی ایجاد کے بعد کا دور تو اس میں بھی مسلمانوں پر یہ مصیبت نازل ہو جاتی کہ چاہے انہیں روٹی اور کپڑا میسّر ہو یا نہ ہو، مگر وہ مسلمان رہنا چاہیں تو اُن کے پاس ایک ٹرانزسٹر ضرور ہو۔

عید کی مُبارکباد کے حقیقی مُستحق کون ہیں؟

حضرات! اس مسئلے کی ضروری توضیح کے بعد اب مَیں آپ کو اور اپنے تمام مسلمان بھائیوں کو عید کی مبارکباد دیتا ہوں۔ عید کی مبارکباد کے حقیقی مستحق وہ لوگ ہیں جنہوں نے رمضان المبارک میں روزے رکھے۔ قرآن مجید کی ہدایت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی فکر کی، اس کو پڑھا، سمجھا، اُس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور تقویٰ کی اُس تربیت کا فائدہ اٹھایا جو رمضان المبارک ایک مومن کو دیتا ہے۔

قرآن مجید میں رمضان کے روزوں کی دو ہی مصلحتیں بیان کی گئی ہیں ۔ ایک یہ کہ ان سے مسلمانوں میں تقویٰ پیدا ہو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ "تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔"

دُوسری یہ کہ مُسلمان اُس نعمت کا شکر ادا کریں جو اللہ تعالیٰ نے رمضان میں قرآن مجید نازل کر کے ان کو عطا کی ہے۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اُس ہدایت پر جو اُس نے تمہیں دی ہے۔"

دُنیا میں اللہ جلّ شانہٗ کی سب سے بڑی نعمت نوعِ انسانی پر اگر کوئی ہے تو وہ قرآن مجید کو نازل کرنا ہے۔ تمام نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، اس لئے کہ رزق اور اس کے جتنے ذرائع ہیں، مثلاً یہ ہوا اور یہ پانی اور یہ غلے اور اسی طرح معیشت کے جو ذرائع ہیں جن سے انسان اپنے لئے روزی کماتا ہے، مکان بناتا ہے، کپڑے فراہم کرتا ہے۔ یہ ساری چیزیں بھی اگرچہ اللہ تعالےٰ کا فضل اور احسان ہی ہیں لیکن یہ فضل و احسان اور اللہ تعالےٰ کی یہ نعمتیں محض انسان کے جسم کے لئے ہیں۔ قرآن مجید وہ نعمت ہے جو انسان کی روح کے لئے، اُس کے اخلاق کے لئے اور درحقیقت اُس کی اصل انسانیت کے لئے نعمتِ عظمےٰ ہے۔ ایک مسلمان اللہ تعالےٰ کا شکر اسی صورت میں صحیح طور پر بجا لاسکتا ہے جبکہ وہ اس کے دیئے ہوئے رزق پر بھی شکر ادا کرے اور اُس کی دی ہوئی اِس نعمتِ ہدایت کے لئے شکر ادا کرے جو قرآن کی شکل میں اُس کو دی گئی ہے۔ اس کا شکر ادا کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ آپ بس زبان سے شکر ادا کریں اور کہیں کہ اللہ تیرا شکر کہ تو نے قرآن ہمیں دیا، بلکہ اس کے شکر کی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ قرآن کو سرچشمۂ ہدایت سمجھیں، دل سے اس کو رہنمائی کا اصل مرجع مانیں اور عملاً اس کی رہنمائی کا فائدہ اُٹھائیں۔

قرآن مجید آپ کو اپنی ذاتی زندگی کے متعلق ہدایت کرتا ہے کہ آپ کس طرح سے ایک پاکیزہ زندگی بسر کریں۔ وہ آپ کو ان چیزوں سے منع کرتا ہے جو آپ کی شخصیت کے نشوونما کے لئے نقصان دہ ہیں۔ وہ آپ کو وہ چیزیں بتاتا ہے جن پہ آپ عمل کریں تو آپ کی شخصیت صحیح طور پر نشوونما پائے گی اور آپ ایک اچھے انسان بن سکیں گے۔ وہ آپ کی اجتماعی زندگی کے متعلق بھی مفصل ہدایات آپ کو دیتا ہے۔ آپ کی معاشرتی زندگی کیسی ہو۔ آپ کے گھر کی زندگی کیسی ہو آپ کے تمدّن اور آپ کی تہذیب کا نقشہ کیا ہو۔ آپ کی ریاست کن طریقوں پر چلے۔ آپ کا قانون کیا ہو۔ آپ کی معاشرتی زندگی کا نظام کیا ہو۔ کن طریقوں

سے آپ اپنی روزی حاصل کریں۔ کن راہوں میں آپ اپنی کمائی ہوئی دولت کو خرچ کریں اور کن راہوں میں نہ کریں۔ آپ کا تعلق اپنے خدا کے ساتھ کیسا ہو۔ آپ کا تعلق خود اپنے نفس کے ساتھ کیسا ہو۔ آپ کا تعلق خدا کے بندوں کیساتھ کیسا ہو، اپنی بیوی کے ساتھ، اپنی اولاد کے ساتھ، اپنے والدین کے ساتھ، اپنے رشتہ داروں کے ساتھ، اپنے معاشرے کے افراد کے ساتھ اور دُنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ، حتّٰی کہ جمادات اور حیوانات کے ساتھ اور خدا کی دی ہوئی تمام مختلف نعمتوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیسا ہونا چاہیئے۔ زندگی کے ان سارے معاملات کے لئے قرآن مجید آپ کو واضح ہدایات دیتا ہے۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اُس کو اصل سرچشمہ ہدایت مانے۔ رہنمائی کے لئے اُسی کی طرف رجوع کرے۔ اُن احکامات و ہدایات اور اُن اصولوں کو صحیح تسلیم کرے جو وہ دے رہا ہے۔ اور اُن کے خلاف جو چیز بھی ہو، اُس کو رد کر دے خواہ وہ کہیں سے آ رہی ہو۔ اگر کسی شخص نے اس رمضان المبارک کے زمانے میں قرآن کو اس نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے اور کوشش کی ہے کہ اُس کی تعلیم و ہدایت کو زیادہ سے زیادہ اپنی سیرت و کردار میں جذب کرے۔ تو اس نے واقعی اس نعمت پر اللہ کا صحیح شکر ادا کیا ہے۔ وہ حقیقت میں اس پر مبارکباد کا مستحق ہے کہ رمضان المبارک کا ایک حق جو اُس پر تھا، اسے اُس نے ٹھیک ادا کر دیا۔

رمضان المبارک کے روزوں کا دوسرا مقصد جس کے لئے وہ آپ پر فرض کئے گئے ہیں، یہ ہے کہ آپ کے اندر تقوٰی پیدا ہو۔ آپ اگر روزے کی حقیقت پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقوٰی پیدا کرنے کے لئے اس سے زیادہ کارگر ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تقوٰی کیا چیز ؟ تقوٰی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالٰی کی نافرمانی سے بچے اور اُس کی فرمانبرداری اختیار کرے۔ روزہ مسلسل ایک مہینے تک آپ کو اسی چیز کی مشق کرواتا ہے۔ جو چیزیں آپ کی زندگی میں عام طور پر حلال ہیں وہ بھی اللہ کے حکم سے روزے میں حرام ہو جاتی ہیں اور اس وقت تک

حرام رہتی ہیں جب تک اللہ ہی کے حکم سے وہ حلال نہ ہو جائیں۔ پانی جیسی چیز جو ہر حال میں حلال و طیب ہے، روزے میں جب اللہ حکم دیتا ہے کہ یہ اب تمہارے لئے حرام ہے تو آپ اس کا ایک قطرہ تک حلق سے نہیں اتار سکتے خواہ پیاس سے آپ کا حلق چٹخنے ہی کیوں نہ لگے۔ البتہ جب اللہ پینے کی اجازت دے دیتا ہے اس وقت آپ اس کی طرف اس طرح لپکتے ہیں گویا کسی نے آپ کو باندھ رکھا تھا اور آپ ابھی کھولے گئے ہیں۔ ایک مہینے تک روزانہ یہ باندھنے اور کھولنے کا عمل اسی لئے کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پوری پوری بندگی واطاعت کے لئے تیار ہو جائیں۔ جس جس چیز سے وہ آپ کو روکتا ہے اس سے رکنے کی، اور جس جس چیز کا وہ آپ کو حکم دیتا ہے اس کو بجا لانے کی آپ کو عادت ہو جائے۔ آپ اپنے نفس پر اتنا قابو پالیں کہ وہ اپنے بے جا مطالبات اللہ کے قانون کے خلاف آپ سے نہ منوا سکے۔ یہ غرض ہے جس کے لئے روزے آپ پر فرض کئے گئے ہیں۔

اگر کسی شخص نے رمضان کے زمانے میں روزے کی اس کیفیت کو اپنے اندر جذب کیا ہے تو وہ حقیقت میں مبارکباد کا مستحق ہے اور اس سے زیادہ مبارکباد کا مستحق وہ شخص ہے جو مہینہ بھر کی اس تربیت کے بعد عید کی پہلی ساعت ہی میں اسے اپنے اندر سے اگل کر پھینک نہ دے۔ بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات سے فائدہ اٹھاتا رہے۔

آپ غور کیجئے! اگر ایک شخص اچھی سے اچھی غذا کھائے جو انسان کے لئے نہایت قوت بخش ہو، مگر کھانے سے فارغ ہوتے ہی حلق میں انگلی ڈال کر اس کو فوراً اگل دے تو اس غذا کا کوئی فائدہ اسے حاصل نہ ہوگا، کیونکہ اس نے ہضم ہونے اور خون بنانے کا اسے کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص غذا کھا کر اسے ہضم کرے اور اس سے خون بن کر اس کے جسم میں دوڑے، تو یہ کھانے کا اصل فائدہ ہے جو اس نے حاصل کیا۔ کم درجے کی

مقوی غذا کھا کر اُسے جزوِ بدن بنانا اس سے بہتر ہے کہ بہترین غذا کھانے کے بعد استفراغ کر دیا جائے۔ ایسا ہی معاملہ رمضان کے روزوں کا بھی ہے۔ ان کا حقیقی فائدہ آپ اسی طرح اٹھا سکتے ہیں کہ ایک مہینے تک جو اخلاقی تربیت ان روزوں نے آپ کو دی ہے، عید کے بعد آپ اس کو نکال کر اپنے اندر سے پھینک نہ دیں، بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات کو اپنی زندگی میں کام کرنے کا موقع دیں۔ یہ فائدہ اگر کسی شخص نے اس رمضان سے حاصل کر لیا تو وہ واقعی پوری پوری مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت پالی۔

شعائرِ دین کے ساتھ ہمارا معاملہ

ہمارے اندر بدقسمتی سے ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو رمضان کے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ رمضان آتا ہے اور گزر جاتا ہے مگر ان کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہاں کچھ مسلمان بستے ہیں جن کے لئے یہ مہینہ کوئی خاص معنی رکھتا ہے۔ روزہ رکھنا تو درکنار اس کا احترام کرنے کی توفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ رمضان کے زمانے میں وہ اسی طرح اطمینان سے کھاتے اور پیتے رہتے ہیں جیسے کوئی عیسائی یا ہندو یا سکھ کھاتا پیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں ان کی مثال اس بنجر زمین کی سی ہے جس کے اندر بارش کا موسم آنے پر بھی جب کہ ہر طرف سبزہ زار پھیلا ہوتا ہے اور کھیتیاں پھلتی اور پھولتی ہیں، گھاس کا ایک تنکا تک پیدا نہیں ہوتا۔ بارش کا زمانہ جس طرح زمین کے لئے روئیدگی کا موسم ہے، ٹھیک اسی طرح رمضان المبارک رُوحِ اسلام کے لئے بالیدگی کا موسم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے روزے کا حکم اس شکل میں دیا ہوتا کہ مسلمانوں میں سے ہر شخص جب چاہے روزے رکھ کر تیس روزوں کی تعداد پوری کر لیا کرے

تو ہماری دینی زندگی میں یہ موسم کی سی کیفیت کبھی پیدا نہ ہوسکتی تھی لیکن اس حکیم مطلق نے حکم اس شکل میں دیا کہ تمام مسلمان ایک ہی مہینے میں ایک ساتھ روزے رکھیں۔ اس چیز نے موسم کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ موسم جب آتا ہے تو اعلیٰ درجے کی زرخیز زمینوں کو چھوڑیئے، جس زمین میں کچھ بھی روئیدگی کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے اندر سے بھی سبزی کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں کیونکہ موسم کی برکت یہی ہے کہ روئیدگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ صلاحیت رکھنے والی زمین بھی اس کے فیض سے محروم نہیں رہتی۔ اور جو زمین موسم آنے پہ بھی ایک کونپل تک نہ نکالے اس کی یہ کیفیت اس بات کی صریح علامت ہوتی ہے کہ وہ قوتِ نمو سے بالکل خالی ہے۔ اسی طرح رمضان ایک ایسا زمانہ ہے کہ جس مسلمان کے اندر ایمان کی ایک رمق اور اسلام کا کوئی ذرّہ برابر جذبہ بھی موجود ہو، وہ گیارہ مہینے خواہ کیسا ہی بے حس رہا ہو، اس مہینے کے آتے ہی اس کے اندر کا سویا ہوا ایمان کروٹیں لینے لگتا ہے۔

ایک مہینے تک تمام مسلمانوں کا بیک وقت سحری کے لئے اٹھنا، سب کا ایک ساتھ دن بھر روزے رکھنا، ایک ہی وقت میں سب کا افطار کرنا، اور راتوں کو جگہ جگہ تراویح پڑھنا، مسلمانوں کی بستیوں میں ایک زبردست اجتماعی ماحول پیدا کر دیتا ہے جس کی برکت سے مسجدیں بھر جاتی ہیں، ہر طرف تلاوتِ قرآن کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ وہ لوگ بھی نمازیں پڑھنے لگتے ہیں جو دوسرے دنوں میں نماز کے پابند نہیں ہوتے، اور وہ لوگ بھی روزے رکھنے لگتے ہیں، جن کے اندر دوسرے دنوں میں دین سے کوئی خاص لگاؤ نہیں پایا جاتا۔ اس ماحول میں بھی اگر کوئی شخص غیر متاثر رہتا ہے، خدا کی طرف کوئی رجوع اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ نماز، روزے اور تلاوتِ قرآن کے لئے کوئی رغبت اس کے دل میں نہیں ابھرتی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کا دل جذبۂ ایمانی سے قطعاً خالی ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ خدا اور

اُن کے دین کے ساتھ، اور مسلمانوں کی ملت کے ساتھ جتنے روابط ہو سکتے تھے، اُن سب کو اُس نے کاٹ پھینکا ہے۔ اس کے بعد آپ کیا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جو آدمی مسلمانوں کے اندر پیدا ہو کر مسلمانوں کی ملت میں آنکھیں کھول کر مسلمان معاشرے کا ایک جزء ہو کر، اس قوم کے دین اور اس کے نظامِ حیات ہی سے اپنے مقدس ترین تعلقات اور روابط کو اس طرح کاٹ سکتا ہے، وہ کل اِس قوم کے ساتھ کوئی غدّاری اور خیانت نہ کر بیٹھے گا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی ہی میں تو یہ طرزِ عمل اختیار کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اس کی خواہشات اس سے یہ کچھ کرا سکتی ہیں تو کل یہی خواہشات اُس سے اور کیا کچھ نہ کرا سکیں گی؟

حضرات! ہمیں بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ یہ صورتِ حال ہمارے ہاں آخر کیوں پیدا ہوئی ہے۔ اگر چند آدمی ہی اس میں مبتلا ہوتے تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہاں تو ہزاروں لاکھوں آدمی ہمارے اندر ایسے موجود ہیں جو اعلانیہ اور فخریہ رمضان میں کھاتے پیتے رہتے ہیں اور اُلٹا روزہ داروں کو شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ فی الواقع بڑی تشویش کی بات ہے اور ہمیں اس کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صورتِ حال دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے ایک مدت سے اس کی پروا کرنی چھوڑ دی ہے کہ ہمارے اندر جو اصلاحِ عظیم اللہ اور اس کے رسول اور اُس کی کتاب نے کی تھی وہ ہمارے معاشرے میں باقی رہتی ہے یا ضائع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی قوم کی دنیا بنانے کی تو بڑی فکر رہی ہے اور اس کے لئے ہم بڑی تگ و دَو کرتے رہے ہیں، مگر اُس عظیم الشان اخلاقی و روحانی اصلاح اور اُس زبردست دینی نظام کو برقرار رکھنے کی کوئی فکر ہمیں نہیں رہی جس پر ہماری ملت کے معاشرے کو قائم کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر تعلیم و تربیت اور قانون و ضابطہ کا وہ نظام کارفرما رہا ہے جو اس ڈھانچے کو منہدم کرنے والا ہے۔ اسی کا نتیجہ

ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے عظیم ترین مقدسات کے پامال ہونے کی ہمارے باا ثر طبقے اتنی بھی پروا نہیں کرتے جتنی اپنی پتلون کی شکن خراب ہو جانے کی کرتے ہیں۔

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (القرآن)

حضرات! انسان کی اصلاح ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کو بگاڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اصلاح کرنی ہو تو سالہا سال کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے ہوتی ہے۔ بگاڑنا ہو تو اس کے لئے کوئی خاص محنت و کوشش درکار نہیں ہوتی۔ بسا اوقات صرف سعیِ اصلاح سے غفلت ہی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

آپ ایک بچے ہی کی مثال لے لیجئے۔ اس کو آپ ایک اچھا اور پاکیزہ انسان بنانا چاہیں تو آپ کو برسوں اپنی جان کھپانی پڑے گی تب کہیں اس کے ذہن اور عادات اور خصائل کو آپ سنوار سکیں گے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ وہ بگڑے تو اس کے لئے کسی خاص کوشش کی حاجت نہیں ہے۔ صرف باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے۔ معاشرے میں ہر طرح کے لچّوں لفنگوں کے ساتھ چل پھر کر وہ خود بگڑ جائے گا۔ محنت اور کوشش کی ضرورت ترقی کے لئے ہوتی ہے نہ کہ تنزل کے لئے۔ آپ کسی گاڑی کو بلندی پر لے جانا چاہیں تو بڑی طاقت صرف کئے بغیر وہ اوپر نہ چڑھ سکے گی۔ نشیب کی طرف جانا چاہیں تو صرف بریک ڈھیلا چھوڑ دیجئے، گاڑی خود لڑھکے گی اور جہاں تک نشیب لے گا لڑھکتی چلی جائے گی۔ ایسا ہی معاملہ انسانی معاشرے کا ہے۔ کسی معاشرے کو درست کر کے ایک اعلیٰ درجے کے نظام فکر و عمل کا پابند بنانا بڑا محنت طلب کام ہے۔ جس کے لئے صدیوں کی کوششیں درکار ہوتی ہیں مگر ان کوششوں کے ثمرات و نتائج کو ضائع کرنے کے لئے صرف اتنی بات بھی کافی ہو سکتی ہے کہ آپ ان کو قائم و برقرار رکھنے کی کوشش چھوڑ دیں۔ اور جو بگاڑ بھی معاشرے میں پھیلتا نظر آئے اس کی پروا نہ کریں مسلمانوں میں۔

جو خوبیاں پیدا ہوئیں وہ کچھ یونہی اتفاقاً نہیں پیدا ہوگئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ اور ان کے بعد امت کے صلحاء و اتقیا اور علماء و فقہا نے صدیوں کی عرق ریزی و جانفشانی سے کروڑوں انسانوں کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالا اخلاق کی پستیوں سے اٹھایا۔ جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کو مٹایا۔ خدائے واحد کی بندگی کے لئے اُن کو تیار کیا۔ آخرت کی باز پرس کا عقیدہ ان کے دلوں میں بٹھایا۔ اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تربیت دے کر ایک خاص کیرکٹر ان کے اندر پیدا کیا۔ نماز اور روزے اور حج اور زکوٰۃ جیسی پاکیزہ عبادات ان میں رائج کیں اور اسلامی نظامِ تہذیب و تمدن کا ایک مضبوط سانچا تیار کر دیا جس کی بدولت مسلمان اُن خوبیوں سے آراستہ ہوئے جو دوسروں کے لئے قابلِ رشک تھیں۔ یہ جو کچھ صدہا برس کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے بنا ہے اس کو ہم ضائع اور برباد کرنا چاہیں تو آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن اسے پھر تعمیر کرنا چاہیں تو پھر صدیاں ہی اس کے لئے درکار ہوں گی۔

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے اسلاف نے سینکڑوں برس کی محنتوں سے ہمارے اندر جو اصلاح کی تھی اس کو ہم نے پچھلے ایک صدی کے اندر بُری طرح ضائع کیا ہے۔ پہلے انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں وہ بہت کچھ ضائع ہوئی اور اب اُن کی غلامی ختم ہو جانے کے بعد خود اپنے حکمرانوں کے دَور میں ہم اس کو پہلے سے بھی زیادہ ضائع کر رہے ہیں۔ یہ وہی غلطی ہے جس پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ "لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" زمین میں اصلاح ہو جانے کے بعد اُس میں بگاڑ پیدا نہ کرو۔

رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی زندگی میں جتنی بھی اصلاح ہوئی ہے انبیاء علیہم السلام اور نوعِ انسانی کے نیک انسانوں کی ہزارہا برس کی کوششوں سے ہوئی ہے۔ ایک ایک بُرائی کا سدِ باب کرنے اور ایک ایک

بھلائی کو قائم کرنے میں خدا کے صالح بندوں کو صدہا برس محنت کرنی پڑی ہے، تب جا کر دنیا میں کچھ عالمگیر اخلاقی ضوابط پر انسانی تہذیب کی تعمیر ہو سکی ہے۔ اس تعمیر کو برباد تو آسانی سے کیا جا سکتا ہے، مگر پھر سے اس کو تعمیر کر دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ایک معمولی مثال دیکھئے:۔

صرف یہ بات کہ عورت اور مرد کا تعلق نکاح کے سوا کسی اور صورت میں نہ ہو، انسان کو اس کا قائل کرنا اور اس کا خوگر بنانا اور معاشرے میں اس کو ایک مسلّم ضابطے کی حیثیت سے رائج دینا اتنا مشکل کام تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور مصلحین نوعِ انسانی کو اس کے لئے ہزارہا برس تک کوشش کرنی پڑی ہوگی تب کہیں دنیا میں یہ ایک اصلاح نافذ کی جا سکی ہوگی، اس لئے کہ انسان میں جنسی انارکی کی طرف ایسا زبردست میلان موجود ہے کہ اسے ایک اخلاقی ضابطہ کا پابند بنا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس اصلاح کو ضائع کر دینے کے لئے کسی بڑی محنت کی ضرورت نہیں۔ عورتوں اور مردوں میں آزادانہ اختلاط کی راہیں کھول دیجئے اور خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع و وسائل عام لوگوں کی دسترس تک پہنچا دیجئے، جنسی انارکی کا دیو جسے مشکل سے باندھا گیا تھا، ایک دفعہ کھل جانے کے بعد دیکھتے دیکھتے اس ساری اصلاح کو غارت کر دے گا جو ہزارہا برس کی کوششوں سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کے تباہ کن نتائج سامنے آنے کے بعد، جس طرح کہ آج وہ مغربی معاشرے کے سامنے انتہائی بھیانک صورت میں آ رہے ہیں، آپ اگر چاہیں کہ پھر اس دیو کو قید کر دیں تو یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ اس کے لئے پھر صدہا برس ہی کی محنتیں درکار ہوں گی۔ اسی لئے قرآن مجید انسانیت کے غارت گروں کو متنبہ کرتا ہے کہ زمین میں جو اصلاح بڑی مشکلوں سے ہوئی ہے اس کو تم اپنی حماقتوں سے برباد نہ کرو۔

اسی ایک مثال پر آپ قیاس کر لیجئے کہ جس عظیم الشان عمارت کا نام اسلامی تہذیب و تمدن ہے، اس کی تعمیر کس مشکل سے ہوئی ہوگی۔ کتنی جہالتوں اور

گمراہیوں کو مٹا کر اور کتنی برائیوں کا سدِ باب کر کے اس کے لئے زمین صاف کی گئی ہوگی، کتنی جانفشانیوں سے صحیح عقائد اور صحیح خیالات ذہنوں میں بٹھائے گئے ہوں گے۔ کیا کچھ محنتیں اخلاقی حدود اور ضوابط کو معاشرے میں عملاً قائم کرنے پر صرف کی گئی ہوں گی اور پھر اس پوری عمارت کو سہارنے کے لئے اسلامی نظامِ زندگی کے یہ پانچ ستون ——— شہادتِ توحید، نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج۔ مضبوطی کے ساتھ جمائے گئے ہوں گے۔ یہ جو کچھ بنا ہے، ہمارے اسلاف کی بے حد وحساب کوششوں سے بنا ہے اور یہ عظیم سرمایہ ہمیں میراث میں مفت مل گیا ہے۔ اس کو اگر ہم ترقی نہیں دے سکتے تو کم از کم اسے برباد تو نہ کرنا چاہیئے۔ ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت، ہمارا لٹریچر، ہمارا تصورِ ثقافت اور بحیثیت مجموعی ہمارے قوانین اور نظم و نسق اور معیشت و معاشرت کا پورا نظام جس رفتار سے اس سرمائے کی ناقدری کرنے والے اور اس کو برباد کرنے والے لوگ روز بروز زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا کر رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز ہم اس کو بالکل کھو دیں گے اور اگر ایک دفعہ ہم نے اسے کھو دیا تو پھر اسے ازسرِ نو حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے اور خدا کرے کہ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم سنبھل جائیں۔

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۶۷ء)

قرآن سرچشمۂ ہدایت

لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

اِس[1] وقت پوری دنیا میں نوعِ انسانی کے پاس قرآن مجید کے سوا اور کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالےٰ کا خالص کلام ہر آمیزش سے پاک بالکل اپنی صحیح صورت میں موجود ہو۔ ایسی ہدایت کہ جس کے متعلق پورے یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ سوائے قرآن مجید کے دنیا کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے اور اس طرح ایک لحاظ سے دیکھئے تو مسلمان دنیا کی وہ خوش قسمت ترین قوم ہے کہ جس کے پاس یہ کتاب موجود ہے اور دوسرے لحاظ سے دیکھئے تو یہ دُنیا کی وہ بدترین قوم ہے کہ جس کے پاس یہ کتاب موجود ہے لیکن وہ اس سے منہ موڑ کر اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی ہے۔

"قرآن یا تمہارے حق میں حُجّت ہے یا تمہارے خلاف"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اَلْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ" "قرآن یا تمہارے حق میں حجت ہے یا تمہارے خلاف حُجّت ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ایک چھوٹے سے فقرے میں بے نظیر بات ارشاد فرمائی ہے۔ اگر ایک آدمی قرآن مجید کی پیروی کرے تو اللہ تعالےٰ کے سامنے وہ یہ

---

[1] ۔ نومبر ۱۹۲۹ء کو سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر کی تعارفی تقریب میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے خطاب فرمایا

بات پیش کرسکتا ہے کہ مَیں نے آپ ہی کے کلام کے مطابق عمل کیا ہے۔ یہ سب سے بڑی حجت اس کے حق میں ہو سکتی ہے اور اس کی بنا پر اس کی بخشش کا ہونا یقینی ہو سکتا ہے کیونکہ اس نے اللہ کی اپنی کتاب کی پیروی کی۔ لیکن اگر کسی کے پاس کتاب الٰہی موجود ہو اور اس کے بعد وہ اس سے منہ موڑے اور اس کے خلاف عمل کرے تو کتاب الٰہی اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو گی۔ دنیا کا کوئی دوسرا شخص تو یہ عُذر پیش کر سکتا ہے کہ آپ کا کلام ہم تک نہیں پہنچا تھا لیکن ہم مسلمان تو یہ نہیں کہہ سکتے۔ ہم تو دعوٰی کر رہے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ ہمارا یہ بھی دعوٰے ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول تھے اور انہوں نے ہی یہ کتاب ہم تک پہنچائی اس لئے ہمارے سامنے کوئی راہ فرار نہیں رہتی، نہ کوئی حجت رہ جاتی ہے اگر ہم اس کے خلاف عمل کریں تو ہمارے اوپر مقدمہ ثابت ہو جاتا ہے۔ ہم خدا کے سامنے اس بات کی کوئی جواب دہی نہیں کر سکتے کہ ہم قرآن سے منہ موڑ کر کسی کی لال کتاب اور کسی کی کالی کتاب کی طرف کیوں دوڑتے پھرتے تھے۔

سرچشمۂ ہدایت قرآن مجید اور اُسوۂ حسنہ کے سوا کوئی نہیں

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ توریت کا ایک نسخہ لئے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کو پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصّے سے سُرخ ہوتا چلا گیا۔ ایک صحابیؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصہ سے کتنا سُرخ ہو رہا ہے اور تم پڑھے چلے جا رہے ہو۔ حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر رُک گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج اگر موسےٰؑ بھی ہوتے تو میری پیروی کرنے کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ موسےٰ علیہ السلام اپنے زمانے

کے نبی تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد اور قرآن کے آجانے کے بعد کوئی دوسرا سرچشمۂ ہدایت نہیں رہا جس کی طرف انسان رجوع کر سکے۔ ہدایت اگر موجود ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور اللہ تعالیٰ کی اس کتاب پاک میں ہے، اس کے باہر کسی جگہ کوئی ہدایت موجود نہیں ہے۔ جس طرف بھی کوئی جائے گا بجز گمراہی اور ضلالت کے کچھ نہیں پائے گا۔

قرآن کا نظامِ عدل، عدلِ اجتماعی سے پہلے عدلِ انفرادی

یہ کتاب جس مقصد کے لئے آئی ہے اس کو مختصر الفاظ میں قرآن مجید ہی میں بیان کر دیا گیا ہے کہ۔ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ عدل کا قیام اس کتاب کا مقصد ہے۔ مگر لوگ اس زمانے میں غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ عدل محض عدلِ اجتماعی کا نام ہے۔ حالانکہ عدلِ اجتماعی سے پہلے عدلِ انفرادی ضروری ہے۔ اگر ایک آدمی کی ذات میں عدل موجود نہیں ہے، اس کے اپنے اندر عدل موجود نہیں ہے تو باہر وہ دنیا میں کیسے عدل قائم کر سکتا ہے۔ ایک آدمی کے اخلاق میں عدل ہونا چاہیے۔ اس کے افکار، اس کی عادات و خصائل، اس کی خواہشات اور اس کے نظریات میں عدل ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ باہر عدل قائم کرے۔ اگر اس کے بغیر ایک آدمی یہ دعویٰ کرے کہ میں عدلِ اجتماعی قائم کرنے جا رہا ہوں تو وہ سرے سے عدل کے معنی و مفہوم ہی سے ناواقف ہے۔ وہ اس بات کو جانتا ہی نہیں ہے کہ عدل پہلے اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کرنا پہلی چیز ہے۔

اگر آدمی اپنی ذات میں عدل پیدا نہیں کرتا۔ اپنے اخلاق و خصائل اور افکار و نظریات میں عدل پیدا نہیں کرتا تو ظاہر بات ہے کہ باہر جو کچھ بھی وہ کرے گا اس میں افراط و تفریط کا شکار ہو گا۔ یا افراط کرے گا یا تفریط۔

یہ کتاب انسان کو پہلے اس کی اپنی ذات میں عدل کرنا سکھاتی ہے۔ سب سے اوّلین انصاف جو اس کو کرنا ہے وہ اپنے اور اپنے خدا کے ساتھ کرنا چاہیے اگر ایک آدمی اپنے خدا ہی سے بغاوت کر رہا ہے تو اس کے بعد عدل کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ جس خدا نے اس کو پیدا کیا، جو خدا اس کو رزق دیتا ہے جس کے پیدا کرنے سے وہ پیدا ہوا اور جس کے زندہ رکھنے سے وہ زندہ ہے۔ اگر وہ اس کی اطاعت نہیں کر رہا ہے، اسی سے منہ موڑ رہا ہے تو وہ ایک ایسی بے انصافی کر رہا ہے جس سے بڑی کوئی بے انصافی دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ اپنے خالق و پروردگار کی اطاعت ہی نہیں کرتے تو دنیا میں آپ کہاں انصاف قائم کریں گے۔ اوّلین ظلم کا ارتکاب تو خدا کے سامنے خود مختار بن کر آپ کر چکے۔

عدل کے اوّلین تقاضے کو پورا کرنے کے بعد ضروری ہے کہ انسان اُن سے عدل کرے جو اس کے قریب ترین ہیں۔ اگر ایک آدمی اپنی اولاد سے عدل نہیں کرتا، اپنے والدین سے اور اپنے بھائی بہنوں سے عدل نہیں کرتا، ایک شوہر اپنی بیوی سے اور بیوی اپنے شوہر سے عدل نہیں کرتی تو وہ باہر دنیا میں کہاں عدل قائم کریں گے۔ خدا کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اپنے قریب ترین اعزہ اور رشتہ داروں کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔

یہ ہے وہ ترتیب جس کے مطابق قرآن مجید آدمی کو سب سے پہلے عدل کی جڑ سکھاتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ عدل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب آگے چل کر بتاتی ہے کہ آدمی معاشرے میں کس طرح عدل قائم کر سکتا ہے۔ آپ جس سوسائٹی میں رہتے ہیں، جس قوم اور جس ملک میں بستے ہیں، جس دنیا میں رہتے ہیں اور جس نوعِ انسانی کے آپ فرد ہیں اس کے اندر عدل قائم کرنے کے جو اصول قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں اور جتنے وسیع پیمانے پر زندگی کے ہر پہلو کو لے کر عدل کے طریقے سکھائے گئے ہیں

اس وقت دُنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں عدل کا اتنا جامع تصور دیا گیا ہو۔

عدلِ اجتماعی ظلم کی تعلیم دینے والوں کے ذریعے قائم نہیں ہو سکتا

آج جن لوگوں کا نام دنیا کے رہنماؤں کی حیثیت سے لیا جا رہا ہے ذرا ان کی کتابیں اٹھا کر آپ پڑھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ خود اور ان کی تعلیمات افراط و تفریط کا مجموعہ ہیں۔ ان کے اندر اعتدال سرے سے موجود نہیں ہے۔ ان کے ہاں آغاز ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ دُنیا میں لڑائی ہو کشمکش ہو اور نزاع ہو۔ وہ موافقت پیدا کرنے کی بجائے منازعت (باہمی نزاع) پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسے لوگ اور ان کی کتابوں سے اگر انسان ہدایت لینے کے لئے دوڑتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ وہ دنیا میں عدلِ اجتماعی قائم کرنے چلا ہے تو بالکل غلط کہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔ عدلِ اجتماعی اگر قائم ہو سکتا ہے تو صرف قرآنِ مجید کی ہدایت کے مطابق ہو سکتا ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کو لے کر اس کے بارے میں بالکل ناقابلِ ترمیم و تنسیخ اور ناقابل تغیّر اصول رکھ دیئے گئے ہیں اور انسان کے لئے یہ اصول اس نے رکھے ہیں جو انسان کا خالق ہے۔ آپ ان اصولوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ عدل قائم کرنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت موجود نہیں ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ کے دو دَور اور قرآن مجید

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کمزوری صحت کی وجہ سے اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے تقریر نہیں کر سکتا۔ میں مختصر طور پر صرف اتنا بیان کروں گا کہ ہم جب دُنیا میں اُٹھے تھے تو اسی کتاب کو لے کر اُٹھے تھے۔ ہم نے اس کی پیروی کی تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی۔ تمام دُنیا کے

مؤرخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا عظیم الشان انقلاب جیسا کہ اس کتاب کی بدولت رونما ہوا تھا کبھی انسانی تاریخ میں نہیں ہوا۔ ایک ایسی پسماندہ قوم کو جو روم اور ایران اور مصر کے مقابلے میں اپنی کوئی ہستی نہ رکھتی تھی، اس کی کوئی طاقت نہ تھی، وہ ایک صحرا نشین قوم تھی جس کے پاس کوئی ذرائع اور وسائل موجود نہیں تھے۔ وہ اس کتاب کو لے کر اٹھی اور ایک صدی کے اندر اندر سندھ سے لے کر اندلس اور مراکش تک پھیل گئی۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑی بڑی فوجیں اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں۔ قوموں کی قومیں نہ صرف اس کی مطیع فرمان ہو گئیں بلکہ اس کے رنگ میں رنگ گئیں۔ ان کی زبان، ان کی تہذیب، ان کے خیالات ان کی عادات اور ان کے اطوار بدل گئے۔ پھر یہ کوئی استعماری طاقت (COLONIAL POWER) نہیں تھی۔ استعماری طاقتیں دنیا کی دوسری قوموں پر قبضہ کرتی ہیں تو ان قوموں میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن مسلمان قرآن لے کر اٹھے تھے اس لئے جہاں بھی وہ گئے انہوں نے دل جیت لئے۔ مختلف قوموں نے ان کا عدل دیکھا، ان کے اخلاق دیکھے، ان کی پاکیزہ صفات دیکھیں تو تسلیم کر لیا کہ جو چیز یہ لے کر آئے ہیں وہ حق ہے۔

لیکن جس وقت ہم نے اس کتاب سے منہ موڑا تو اس کا نتیجہ ہم نے بھی دیکھ لیا اور دنیا بھی دیکھ رہی ہے۔ آج اس وقت حالت یہ ہے کہ دنیا میں ۷۵ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ تیس بتیس کے قریب ان کی حکومتیں موجود ہیں لیکن جس کا جی چاہتا ہے ان کے سینے پر مونگ دلنے لگتا ہے اور وہ بے بسی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ جس کو اپنا قبلہ اول اور ثالث الحرمین کہتے ہیں اسی میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ دنیا کے مسلمان اس پر تڑپ اٹھتے ہیں مگر کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا وجہ ہے؟ صرف یہ کہ قرآن مجید سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے منہ موڑ کر انہوں نے دنیا کے ہر نام نہاد منبع ہدایت کی طرف رجوع کیا۔ ہر اس سرچشمہ کی طرف دوڑے جس کے متعلق انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہاں سے ہمیں ہدایت

ملے گی۔ چنانچہ اس کا جو بدترین نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ہو رہا ہے۔

پاکستان اور قرآن مجید

ہمارا یہ ملک جس مقصد کے لئے قائم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ہم یہاں قرآن کا قانون نافذ کریں گے۔ پاکستان یہی کہہ کر قائم کیا گیا تھا اور اس دعوے کے ساتھ قائم کیا گیا تھا کہ صدیوں کے بعد ہم یہاں اسلامی نظام حیات کی پہلی تجربہ گاہ قائم کر رہے ہیں تاکہ دنیا اسے دیکھے اور اس سے روشنی حاصل کرے لیکن پچھلے بائیس سال کے دوران میں بجائے اس کے کہ یہاں قرآن کے قانون کو نافذ کیا جاتا، قرآن کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کیا جاتا، کوشش یہ کی گئی ہے کہ لوگوں کے اندر قرآن سے اور زیادہ انحراف پیدا ہو۔ اخلاق میں، عادات میں، نظریات میں، افکار میں، ہر چیز میں معاشرے کو قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے دور کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب کھلم کھلا اس بات کے مدعی کھڑے ہو گئے ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں ایک دوسری آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) باہر سے درآمد کی جائے اور اسے یہاں قائم کیا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی دوسری (IDEOLOGY) ہی یہاں لا کر نافذ کرنے کی ضرورت تھی؟ کیوں لاکھوں مسلمانوں کو مروا دیا گیا۔ کیوں لاکھوں مسلمانوں کی بیٹیوں کی آبروئیں برباد کرائی گئیں؟۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور اسلام کے نام پر جو وعدہ کیا گیا ہے اگر اسے پورا نہ کیا گیا تو یہ اتنا بڑا دھوکا ہو گا کہ اتنا بڑا دھوکا آج تک کسی نے کسی کو نہ دیا ہو گا۔ اس ملک میں آپ کو قرآن و سنت کا قانون نافذ کرنا ہو گا۔ ورنہ یہ ملک اپنے وجود کا جواز کھو بیٹھے گا۔ مسلمان اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال کر وہ سربلندی و سرفرازی کبھی حاصل نہیں کر سکتا جو اس کتاب میں خدا کے مطیع فرمان بندوں کے لئے بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ جو

لوگ قرآن پر واقعی ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے دیئے ہوئے نظام کو نافذ کرنے اس کی تعلیمات کو پھیلانے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں جو شخص جو کچھ بھی کر سکتا ہے، اس کو کرنا چاہیئے۔ اس راہ کی ہر کوشش بڑی مبارک کوشش ہے اور اللہ تعالےٰ کے ہاں اس کا اجر ثابت ہے۔

(ہفت روزہ "آئین" ۸۔ نومبر ۱۹۶۹ء)

اِس دَور میں قرآن کی صحیح خدمت کیا ہے؟

یہ ایک پیغام ہے جو نزولِ قرآن کی چہار صد سالہ تقریب کے موقع پر اسلامی کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو بھیجا گیا تھا۔

میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں گا اگر آپ حاضرین مجلس تک میرا سلام اور یہ پیغام پہنچا دیں کہ جس مبارک مقصد کے لئے آپ جمع ہوئے ہیں، میں اس میں قلب و روح کے ساتھ آپ کا شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے کلام پاک کے صحیح فہم، اور اس نازک دَور میں اس کی صحیح تبلیغ، اور زندگی کے اہم مسائل پر اس کی تعلیمات کی صحیح تطبیق کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنے آخری نبیؐ پر اپنی کتاب اس اعلان کے ساتھ نازل کی ہے کہ اس میں دین کی تکمیل کر دی گئی ہے اور اب دنیا میں نہ کوئی نبی آنے والا ہے نہ کوئی کتاب۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن پوری نوعِ انسانی کے لئے تمام دنیا میں اور تمام زمانوں میں ایک مستقل ہدایت ہے۔ کیونکہ اگر کسی زمانے یا کسی خطۂ زمین یا انسانی معاشرے کی کسی حالت کے لیے بھی اس کی ہدایت ناکافی یا محتاجِ تکمیل ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان غلط ہے حالانکہ اللہ اس سے پاک اور برتر ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ہو۔ لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسائلِ حیات کی ہر بحث میں ہمارا اوّلین نقطۂ آغاز یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے لیے اصل سرچشمہ ہدایت یہ کتاب ہے اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اسی کی طرف ہم رجوع کریں گے۔

یہ "نقطۂ آغاز" کا سوال ہی اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے اہلِ فکر و نظر اور رہنما طبقوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ ہمارا اصل کام دنیا کو

خدائی ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن بدقسمتی سے جدید مادی تہذیب کے
ہمہ گیر غلبہ نے خود ہمارے اپنے اندر یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ ہم جملہ مسائلِ حیات
میں قرآن کو اصل سرچشمۂ ہدایت مانتے بھی ہیں یا نہیں، اور مانتے ہیں تو خلوص اور
سنجیدگی کے ساتھ مانتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے ہم بحیثیت ایک مسلم ملت کے اپنے
عالمگیر منصب کا حق ادا نہیں کر سکتے جب تک خود اپنے اندر اس سوال کو طے نہ کر
لیں، اور ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر نزولِ قرآن کی پندرھویں صدی کا آغاز
اسی سوال کے ایک قطعی اور واضح جواب سے کریں۔

ہمارے رہنما اور کارفرما طبقوں میں کچھ عناصر ہیں جو قرآن کو اس دور میں سرچشمۂ
ہدایت نہیں مانتے یا کم از کم اس میں شک ضرور رکھتے ہیں۔ وہ ایسے اطمینان بخش
دلائل کے محتاج ہیں جن سے ان کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ انسان رہنمائی کے لیے
خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور یہ قرآن واقعی خدا ہی کی طرف سے ایک محفوظ، کامل اور
ابدی ہدایت ہے۔

کچھ دوسرے عناصر ہیں جو دین و دنیا کی تقسیم کا نظریہ اختیار کر چکے ہیں اور ان میں سے
ہر ایک اپنے مخصوص تصورات کے مطابق جس چیز کو "دین" سمجھ بیٹھا ہے صرف اُسی
کے دائرے تک قرآن کی ہدایت کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی
غلط فہمیاں رفع نہیں ہو سکتیں جب تک کہ دین و دنیا کی اس بے معنی تقسیم پر فیصلہ کن
ضرب نہ لگائی جائے اور مضبوط دلائل کے ساتھ یہ ثابت کر دیا جائے کہ انسان اپنی
پوری زندگی کے معاملات میں خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور قرآن زندگی کے
ہر پہلو میں بالکل ٹھیک ہدایت دیتا ہے۔

کچھ اور عناصر ہیں جو قرآن کی ہدایت کو جامع اور ہمہ گیر مانتے ہیں مگر جب اُس سے
استفادے کا سوال سامنے آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کے لیے رہنمائی کا اصل
ماخذ و منبع قرآن سے باہر کسی اور جگہ ہے جہاں سے نظریات و تصورات لا کر وہ قرآن سے
ان کی تصدیق و توثیق کرانے کے لیے زور لگا رہا ہے۔ اور کسی کی کوشش یہ ہے کہ

قرآن کا تعلق نہ صرف سنتِ رسول سے کاٹ کر بلکہ پچھلی چودہ صدیوں میں امت کے علماء و فقہاء اور مفسرین نے معانیٔ قرآن کی تشریح اور تعلیماتِ قرآن سے اخذ و استنباط کا جو کچھ کام کیا ہے اس سب سے بے نیاز ہو کر، اُس کا اپنا ذہن الفاظِ قرآن سے جو مفہوم اخذ کرتا ہے صرف اُس سے ہدایت حاصل کرے۔

یہ دونوں مسلک ایسے ہیں جنہیں کوئی معقول آدمی قرآن کی ہدایت سے استفادے کی صحیح صورت نہیں مان سکتا، اور ان کی بنیاد پر امتِ مُسلمہ کا کوئی ایک نظامِ فکر و عمل بھی نہیں بن سکتا، کیونکہ نہ امت کا اجتماعی ذہن کبھی ان تعبیرات و تفسیرات کو قبول کر سکتا ہے، اور نہ خود ان لوگوں کے درمیان اپنی تعبیرات میں اتفاق ممکن ہے۔ اس لیے ان مسلکوں کے فروغ پانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں مزید تفرقے رونما ہوں، اُن کے ذہنوں میں اپنے دین کے متعلق نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں، اور دنیا کو ہدایتِ الٰہی کی طرف دعوت دینے کے بجائے وہ خود اپنی جگہ ہی اس پریشانی میں مبتلا رہیں کہ وہ ہدایت فی الواقع ہے کیا۔ لیکن اس کا علاج بھی طعن و تشنیع نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ عناصر اس کے محتاج ہیں کہ معقول اور اطمینان بخش دلائل سے ان کو قرآن کی ہدایت سے استفادے کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور جن طریقوں کو وہ اختیار کر رہے ہیں ان کی غلطی واضح کی جائے۔

لغزشِ قدم کے اِن مواقع سے جو لوگ بچ گئے ہیں ان کے معاملہ میں بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ فی الحقیقت قرآن کو اصل سرچشمۂ ہدایت ماننے میں وہ کس حد تک سنجیدہ ہیں۔ اِس معاملہ میں سنجیدگی کے معنی صرف اتنے ہی نہیں ہیں کہ ہم خلوصِ دل کے ساتھ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھیں، اور اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہم اس عقیدے کے صرف اعلان و اظہار پر اکتفا کریں، بلکہ ہمارے سنجیدہ ہونے کا اصل تقاضا یہ ہے ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عملاً سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کریں، اور جو رہنمائی اُس سے ملتی ہے اُس کے مطابق اپنے اخلاق و معاملات اور طرزِ زندگی کو، اپنے تمدّن اور اُس کے قوانین کو، اپنے نظامِ تعلیم اور نظامِ معیشت اور نظامِ

سیاست کو بالفعل ڈھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میرا احساس اور مشاہدہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما اور کارفرما طبقوں میں جہاں صحیح اعتقاد موجود ہے وہاں بھی اِس معیار کی سنجیدگی مفقود ہے، یا اگر مفقود نہیں تو کم از کم معیارِ مطلوب سے بہت فروتر ہے۔ ہمیں اِس سنجیدگی کو پیدا کرنے کی کوشش سب سے پہلے کرنی چاہیے، کیونکہ جب تک یہ پیدا نہ ہو، مسائلِ زندگی پر قرآنی تعلیمات کے انطباق کی علمی بحثیں کاغذی زینت ہی بنی رہیں گی، عمل کی دنیا میں اُن کا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ دنیا صرف اِن کاغذی بحثوں سے اسلام کے برحق ہونے کی قائل نہیں ہو سکتی۔ اُسے قائل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہماری قومی زندگی میں اسلام اُس کو جلوہ گر نظر آئے۔ اِس کے بغیر ہم جتنی بھی اسلام کی تبلیغ کریں گے اُس کے آگے دنیا کو ایک بہت بڑی علامتِ استفہام ہی لگی نظر آئے گی جس میں یہ سوال پوشیدہ ہوگا کہ کیا یہ اُمت، جو اپنی مسجدوں کے باہر زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کے افکار و نظریات، تہذیب، قوانین اور اصولوں کی تقلید کر رہی ہے، فی الواقع اسلام کو خود بھی برحق سمجھتی ہے؟

یہ چند امور ہیں جن کی طرف میں اہلِ علم کے اس گراں قدر اجتماع کو توجہ دلانا چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ان کو التفات کا مستحق سمجھا جائے گا۔

ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۶۸ء

ایک مہلک مرض

ایک مہلک مرض جو مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو گھن کی طرح کھا گیا ہے اور کھائے جا رہا ہے " وراثت" کا مرض ہے۔ سب سے پہلے اس نے ہمارے نظام سیاست کو خراب کیا۔ اس کے بعد یہ گھانس تلے کے پانی کی طرح ہمارے نظم ملت کے ہر شعبے کی جڑوں میں پھیلتا چلا گیا اور ہماری قوت کے جتنے مرکز تھے ان سب کو اس نے فاسد کر دیا۔ اسلام میں تو نبی کا بیٹا بھی وراثت میں نبوت نہیں پاتا مگر یہاں وراثت کا قانون ایسا عالمگیر ہوا ہے کہ عالم کا بیٹا عالم ہے، مرشد کا بیٹا مرشد، قاضی کا بیٹا قاضی، امام کا بیٹا امام اور سپہ سالار کا بیٹا سپہ سالار۔ ہر شخص جس نے اپنے فضل و کمال سے جماعت میں اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کیا۔ اس کی ایک باقاعدہ مسند بن گئی، اور اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں کا اس مسند پر بیٹھنا لازمی ٹھیر گیا خواہ اس میں اہلیت ہو یا نہ ہو۔ وراثت کے اس غلط اور جاہلانہ طریقے نے اتنا زور پکڑا کہ جوہر کمال بے قیمت ہو گیا اور اکثر و بیشتر دینی و اجتماعی خدمات جن کی بجا آوری پر تمام ملت کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے محض نسبی استحقاق کی بناء پر نا قابل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ علماء کا اصل کام علم حق کا پھیلانا تھا۔ مگر جب علم کے خانوادے بن گئے تو علماء حق کے بے علم جانشینوں نے جہالت کی تاریکی پھیلائی اور مسلمانوں کو گمراہ کر دیا۔ مرشدوں کا اصل منصب تزکیہ نفوس اور فضائل اخلاق کی اشاعت اور خلق اللہ کی ہدایت تھا، مگر جب مسند ارشاد وراثۃً منتقل ہونے لگی تو ارشاد غائب ہو گیا اور اس مسند کے وارثوں کا کام صرف یہ رہ گیا کہ دست و پا کو بوسے دلوائیں، مریدوں معتقدوں اور زائروں سے نذرانے وصول کریں، اور استخواں فروشی سے جو مال حاصل ہو

اس کو فسق و فجور کی نذر کر دیں تقضاۃ اس لیے تھے کہ شریعت کی حدود قائم کریں، مگر جب منصب قضا مال و جائیداد کی طرح باپوں سے بیٹے کو ترکے میں ملنا شروع ہوا تو قاضیوں کا کام یہ ہو گیا کہ بزرگوں کی معاشوں سے داد عیش دیں اور اقامت حدود کے لیے سعی کرنا تو درکنار، خود اپنے کرتوں سے شریعت کی ایک ایک حد کو توڑ ڈالیں یہی انجام دوسرے اہم مناصب کا بھی ہوا۔ مساجد کو مسلمانوں کی آبادیوں میں جو مرکزیت حاصل تھی وہ نالائق اماموں اور متولیوں کے ہاتھوں قریب قریب فنا ہو گئی اوقاف اسلامی جو کبھی خیرات وحسنات کے منابع تھے۔ اسی منحوس وراثت کی بدولت تباہ ہو گئے۔ اسلام کا عسکری نظام جس کی ہیبت و جبروت سے روئے زمین کانپ اٹھتا تھا۔ اسی وجہ سے غارت ہوا کہ امارت و قیادت کے اہم مناصب خاندانوں کی میراث بن گئے۔ غرض اسلامی تہذیب و تمدن کو اس چیز سے جتنے شدید نقصانات پہنچے اور پہنچ رہے ہیں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدھر نظر کی جاتی ہے، دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے بڑے بڑے وسائل پر ایسے لوگ قابض پائے جاتے ہیں جو خود فساد کے سرچشمے اور مفاسد کی پشت پناہ بنے ہوتے ہیں ان حالات میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ اس سد راہ کو پوری قوت کے ساتھ اکھاڑ نہ پھینکا جائے۔

آخری دور کے بادشاہوں اور امراء وحکام نے کچھ تساہل، کچھ ناعاقبت اندیشی اور کچھ بیجا فیاضی کی بناء پر یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علماء، مشائخ، قضاۃ، ائمہ اور دوسرے اہل مناصب کے لیے جاگیریں اور معاشیں مقرر کیں اور ان مناصب کو موروثی بنا دیا اُس دور کے عام مسلمان بھی فقدان علم اور عدم تدبر کی وجہ سے اسی غلطی میں مبتلا ہوتے اور اپنی عقیدتوں کو باکمال بزرگوں کے بعد ان کے بے کمال جانشینوں کی طرف منتقل کرتے چلے گئے۔ اس کے بُرے نتائج کو انہوں نے نہ سمجھا، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن آج وہ نتائج بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے ہیں اب اگر کوئی شخص شریعت

یا رسم و رواج کی آڑ لے کر اس غلط قاعدے کی حمایت کرتا ہے تو اس کی عقل پر ہزار افسوس ہے رواج کی آڑ تو مسلمان کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے اصل اور بودی آڑ ہے۔ کوئی فعل محض اس بنا پر برقرار رہنے کی مستحق نہیں ہو سکتی کہ اس کا ارتکاب سو دو سو یا ہزار برس پہلے کیا گیا تھا۔ رہی شریعت تو اس کی نگاہ میں ہر چیز سے زیادہ اسم اور اقدم دین کی مصلحت اور امت کی بہتری ہے۔ اگر شرعی قانون کے مطابق کوئی فعل کیا گیا ہو اور بعد میں ثابت ہو جائے کہ وہ فعل مصلحت دینی کے خلاف اور جماعت کے لیے مضر تھا تو اس فعل کے جاری رکھنے کے لیے یہ کوئی محکم دلیل نہیں ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وہ فعل شرعی قانون کے مطابق کیا گیا تھا۔ خود شرعی قانون ہی اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایسے فعل کو مٹا دیا جائے۔

ترجمان القرآن جلد نمبر ہ ، شمارہ نمبر ۱

احترامِ صحابہؓ کے نام پر

س۔ کچھ علماء کی طرف سے آپ کے خلاف یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ آپ نے اپنی تحریروں میں صحابہ کرام پر نکتہ چینی کی ہے اور ان کے مقام اور مرتبے کو پوری طرح سے ملحوظ نہیں رکھا۔ براہ کرم وضاحت فرمایئے کہ احترامِ صحابہؓ کے بارے میں آپ کا مسلک کیا ہے اور آیا اس سلسلے میں اہلِ سنت کے درمیان میں کوئی اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

ج - چونکہ یہ سوال آ گیا ہے اس لیے اس کے متعلق چند کلمات کہہ دیتا ہوں۔ دراصل میں کبھی ایسے اعتراضات کے جواب نہیں دیا کرتا جن کے متعلق مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراضات میرے خلاف ناراضی کی اصل وجہ نہیں ہیں بلکہ ناراضی کی اصل وجہ کچھ اور ہے اور ادھر اُدھر کے یہ اعتراضات محض اس لیے نکالے جاتے ہیں تاکہ دنیا کو یہ یقین دلایا جائے کہ ہم اس شخص سے اپنے نفس کے لیے نہیں لڑ رہے بلکہ یہ شخص ایسا ظالم ہے کہ اس نے صحابہؓ اور انبیاء سے متعلق یہ اور یہ کہہ دیا ہے بس ہم اس سے اس وجہ سے ناراض ہیں ——— تو جن لوگوں کے متعلق مجھے معلوم ہو جاتا کہ ان کی مخالفت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے بلکہ اس کی اصل وجہ

ہر اتوار کو صبح ساڑھے آٹھ بجے مسجد مبارک (عبدالکریم روڈ لاہور) میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی درس قرآن و حدیث دیتے تھے۔ درس کے بعد حاضرین کے سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے۔ اتوار ۳ اگست ۶۹ء کو ایک سوال صحابہؓ کرام کے احترام سے متعلق تھا یہ سوال اور اس کا جواب ٹیپ ریکارڈ سے حاصل کر کے یہاں شائع کیا جاتا ہے۔

کچھ تنہا ہے اور صحابہؓ اور انبیاء کا محض بہانا بنایا جا رہا ہے تو میں ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اپنی عمر تم اس کام میں کھپاتے رہو،
میں اپنی عاقبت کے لیے جس کام کو صحیح اور ضروری سمجھتا ہوں اس کو کرتا رہوں گا تمہیں جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا البتہ جو اعتراضات کسی نہ کسی حد تک معقولیت یا دلیل کے ساتھ ہوتا ہے اس کا جواب میں پہلے بھی دیتا رہا ہوں اور آئندہ بھی انشاءاللہ دینے کی کوشش کروں گا اور اعتراض معقول ثابت ہو گا تو اس کو مان بھی لوں گا اور اپنی اصلاح بھی کروں گا۔ بارہا میں نے ایسا کیا ہے۔
اب دیکھیے کہ اس معاملے میں ان لوگوں کے اعتراضات کی حقیقت کیا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ کسی آدمی کی کسی ایک عبارت، یا کسی عبارت کے کسی ایک فقرے سے اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا اس بارے میں یہ مسلک ہے درآنحالیکہ وہ اپنی بیسیوں عبارتوں میں اپنا مسلک واضح طور پر بیان کر چکا ہو بجز ایک ضدی آدمی کے اور کسی کا کام نہیں ہو سکتا یعنی اگر ایک آدمی اپنے مسلک کی وضاحت بار بار نہ صرف اپنے قول سے اور اپنی تحریروں سے کر چکا ہو بلکہ اس کا مسلک اس کے مجموعی طرز عمل سے بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہو تو اس کی کسی ایک عبارت یا ایک فقرے سے اس کے بالکل برعکس نتیجہ نکالنا کسی معقول آدمی کا کام نہیں ہو سکتا اور شاید اس قسم کی حرکت کا علمی مقام ہوتا ہے۔
مثال کے طور پر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ میری کتاب تفہیم القرآن موجود ہے اس میں میں نے جہاں کہیں فقہی مسائل یا دینی مسائل کے متعلق بحث کی ہے تو اس کے اندر آپ دیکھیں گے کہ میں نے صحابہ کرامؓ کے اقوال سے استدلال کیا ہے جہاں کہیں صحابہ کرامؓ کا ذکر آیا ہے میں نے بارہا یہ بات لکھی ہے کہ روئے زمین پر آفتاب نے کبھی ایسے انسان نہیں دیکھے تھے جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تھے تمام نوع انسانی کا بہترین گروہ اگر کوئی تھا تو وہ صحابہ کرامؓ تھے۔ پھر میں نے بارہا یہ بات لکھی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا جس چیز پر اجماع ہو وہ دین میں حجت

ہے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی کے مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اجماع کو اسی طرح تسلیم کرے۔ جس طرح سنت کو تسلیم کیا جاتا ہے آپ اسی تفہیم القرآن میں دیکھ سکتے ہیں کہ میں مختلف مسائل میں صحابہ کرام کے اقوال نقل کرتا اور پھر ان کے اقوال میں سے کسی قول کو اختیار کر کے اس کی تائید میں اپنی رائے بیان کرتا ہے۔

کیا یہ سارا کام کسی ایسے فرد کا ہو سکتا ہے جو صحابہؓ کے معاملے میں منفی ذہنیت رکھتا ہو؟

یہ تو ہوئی سوال کے اس حصے کی وضاحت کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں میرا مسلک کیا ہے۔ اب بعض ایسے معاملات کو لیجیے جن کے بارے میں تمام محدثینؒ، مفسرینؒ اور مورخین کا ایک ہی ریکارڈ ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر بعض ایسے واقعات جو احادیث میں آتے ہیں یا جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے یا جو تاریخ سے ثابت ہیں تو محض ان واقعات کو بیان کرنا اگر گناہ بے توامت کے تمام محدثین اور مورخین اور مفسرینؒ سب گناہگار قرار پاتے ہیں کوئی نہیں بچتا۔ خود قرآن مجید میں صحابہ کرامؓ کی بعض غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ جمعہ میں یہ ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ تاجروں کا ایک قافلہ آیا اور صرف بارہ صحابہؓ رہ گئے (بعض روایات میں یہ تعداد ۴۰ آئی ہے) باقی سارے کے سارے خطبہ چھوڑ کر قافلے کی طرف چلے گئے۔ یہ قرآن مجید کا بیان کیا ہوا واقعہ ہے اور حدیث و تفسیر کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں سورہ جمعہ کی تفسیر میں اس واقعہ اور اس کی تفصیلات کو بیان نہ کیا گیا ہو۔ اگر اس چیز کا نام صحابہ کرامؓ پر نکتہ چینی ہے تو اس سے کون بچا ہے؟ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ابتدا کی اور اس کے بعد سارے محدثینؒ اور مفسرینؒ نے یہ کام کیا۔ اگر ان واقعات کو بیان کرنا صحابہؓ کرام کی تنقیص اور نکتہ چینی ہے تو مجھے بتایا جائے کہ قرآن مجید اور اس اُمت کے عظیم دینی، علمی اور تفسیری خزانے کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا

فیصلہ کیا گیا ہے ۔

اب اس مسئلے کے ایک دوسرے پہلو کو لیجئے ۔

سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ خود یہ چاہتا تھا کہ صحابہ کرام پر تنقید کی جائے ؟ اگر نہیں چاہتا تھا تو قرآن مجید میں ان واقعات کا ذکر کیوں کیا گیا کہ لوگ قیامت تک انہیں پڑھتے رہیں ؟ جنگ اُحد کے موقع پر جو پچاس صحابی ایک مقام پر بٹھائے گئے تھے اور وہ وہاں سے ہٹ گئے تھے ان کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے حدیث اور تاریخ کی کون سی کتاب ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے اب اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث میں ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر یہ سمجھانا مقصود ہے کہ صحابہ کرامؓ کے معاملے میں ہم وہی غلطی نہ کر بیٹھیں جو انبیاء بنی اسرائیل کی امتیں کرتی رہیں کہ پہلے اپنے انبیاء کو خدا کی اولاد قرار دیا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو چلڈرن آف گاڈ قرار دے لیا۔ قرآن وحدیث نے ہمیں صحابہ کرامؓ کے احترام کے ساتھ ساتھ انہیں انسان سمجھنے کا شعور بخشا ہے اور اس کی تربیت دی ہے ۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی تو وہ قرآن وحدیث کے خلاف ایک بات کہتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ جب قرآن واحادیث میں مختلف مثالوں کا ذکر کیا گیا ہے تو ایک مسلمان ان کے برعکس موقف کس طرح اختیار کر سکتا ہے اور کس طرح سے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر ان سے غلطی ہوئی تو اس کا بیان کرنا گناہ ہے ؟ غلطی بھی ہوئی اور اُسے بیان بھی کیا گیا حدیثوں اور تفسیروں میں بیان کیا گیا اور ائمہ کرام ، محدثین اور مفسرین نے بیان کیا —— اب اگر ان حقائق کے باوجود کوئی شخص قرآن وحدیث کے اصل منشاء کو نظر انداز کر کے اُسے صحابہ کرامؓ پر نکتہ چینی کرنا کہتا ہے تو اس کے صرف دو سبب ہو سکتے ہیں ۔

ایسی بات کہنے والے یا قرآن پڑھے ہیں اور نہیں جانتے کہ احادیث اور تفاسیر وغیرہ میں کیا چیز موجود ہے ۔

یا یہ لوگ جانتے تو سب کچھ ہیں مگر جان بوجھ کر غلط بات کہتے ہیں مقصد مخالفت ہے اور فرق بنا رہے ہیں اللہ اور اُس کے رسول اور صحابہ کرام کو ——— یعنی دل میں گرہ تو کسی اور چیز کی ہے اور اعتراض کچھ اور تصنیف کیا جا رہا ہے۔

آخری بات میں یہ کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ان حضرات کی ناراضی کی وجہ یہی ہے۔ سوال یہ ہے کیا اس صورت میں دوسروں کو گالیاں دینا جائز ہو جاتا ہے ؟ صحابہ کرام کی خاطر ناراض ہونے والا شخص دوسرے شخص کی گھر کی خواتین پر تو حملے نہیں کر سکتا۔ اگر آدمی فی الواقع کسی شخص سے حق کی خاطر ناراض ہو تو وہ اس پر بہتان تو نہیں باندھ سکتا۔ اس کی عبارتوں میں اُلٹ پھیر تو نہیں کر سکتا، اس کے خلاف جھوٹے الزامات تو تصنیف نہیں کر سکتا ——— اب اگر کوئی شخص یہ سارے کام بھی کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی کی خاطر یہ کام کر رہا ہے تو آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی کی توہین کون کر رہا ہے۔

ہفت روزہ آئین لاہور۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۹ء

دعوتِ دین اور حکمت و موعظۂ حسنہ

حکمت[1] یہ ہے کہ آپ جب کام کرنے اٹھیں تو اپنی تحریک کے نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر دیکھیں کہ آپ کن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ تحریک کے نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کا مطلب اس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ آپ جو کام کرنے اٹھے ہیں اس کا کام کے لحاظ سے اس وقت کونسی چیز اس مقصد کے لئے معاون ہے اور کونسی چیز مانع ہے؟ آپ اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کریں پھر جو چیزیں مانع ہیں ان کا اس پہلو سے جائزہ لیں کہ ان کی وسعت کیا ہے یہ کس پیمانے پر پھیلی ہوئی ہیں، ان کے پیچھے کون سی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ان کا اپنا پس منظر کیا ہے، کہاں سے یہ آ رہی ہیں اور ان کا مقابلہ کس طریقے سے کیا جا سکتا ہے؟

ایک آدمی جو حکیم ہو وہ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ میں کس زمانے میں اور کن حالات میں کام کر رہا ہوں۔ حکمت و دانشمندی کے ساتھ کام کرنے والا دین کی دعوت لے کر اُٹھے گا تو اس چیز کو کبھی نظر انداز نہیں کرے گا کہ کتنا کچھ مصالحہ اس کے گرد و پیش میں موجود ہے۔ جو اس کام کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ یہ دیکھے گا کہ جس سوسائٹی میں وہ کام کرنے چلا ہے وہ اسلام کو ماننے والی ہے یا اس کی مخالف ہے؟ چنانچہ ایک آدمی اسلام کی سخت مخالف اور دشمن سوسائٹی میں ہوگا تو وہ کوئی اور طریقہ کار اختیار کرے گا۔ جبکہ دوسرا آدمی جو اسلام کی منکر سوسائٹی میں ہو مگر وہ سوسائٹی دشمنی میں سرگرم نہ ہو تو وہ وہاں کوئی اور طریقہ کار اختیار کرے گا۔ ——— اسی طرح جب ایک

---

[1] [illegible] مارچ ۱۹۶۸ء کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کے ایک اجتماع میں طلبہ کے سوالات کے جوابات دیئے۔ ان میں سے ایک سوال کا جواب ٹیپ سے نقل کر کے یہاں دیا جا رہا ہے۔ (ہفت روزہ آئین۔ ۷ اپریل ۱۹۶۸ء)

آدمی ایسی سوسائٹی میں ہو جس میں اسلام کو ماننے والوں کی کثیر تعداد پہلے سے موجود ہو تو لازماً وہ وہاں دین کا کام کرنے کے لئے کوئی اور طریقۂ کار اختیار کرے گا، اور ان میں سے ہر طریقِ کار میں دین ہی کا مفاد اور حکمت موجود ہوگی۔ سخت نادان ہوگا وہ آدمی جو ایک ہی نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور ہر سوسائٹی میں اسی کو تقسیم کرنا شروع کر دے۔ حکیم پہلے سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ میں جس سوسائٹی میں کام کر رہا ہوں۔ اس کے اندر کتنا مواد موجود ہے جو اس کی مطلوبہ تعمیر میں کام کر سکتا ہے۔ اب اس کی کوشش یہ ہوگی کہ جتنا موجود ہے وہ ضائع نہ ہونے پائے گویا اس کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ اس سرمائے کی حفاظت کرے۔

حکمت و بصیرت کیوں ضروری ہے

ایسے آدمی کو عاقل و دانا قرار دینا بہت مشکل ہے جو مسلمانوں کے اندر پھیلی ہوئی بد اخلاقیوں کو دیکھ کر یا ان میں تساہل کو محسوس کر کے پہلے تو یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ سوسائٹی اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور پھر اس احساس کے نتیجے میں وہ اس طرح کام کا آغاز کرے جیسے وہ کفار کے درمیان کام کر رہا ہے۔ حالانکہ جو چیز ہمارے پاس واقعی موجود ہے، اور اسلام کے لئے سازگار ہے ہمارا کام یہ ہے کہ اس کو ضائع نہ ہونے دیں اور کوشش کریں کہ یہ اور زیادہ مددگار بنے۔ دور پھینکنے کی بجائے اس کو قریب لانے کی کوشش کریں۔ جو چیزیں اس کو بگاڑنے والی ہیں انکی مزاحمت کریں تاکہ یہ مزید نہ بگڑے۔ ہم ہمیشہ اس بات کو اپنے سامنے رکھیں کہ جیسا کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی لوگوں میں جذبہ موجود ہے۔ وہ اسلام کے حق میں کام آئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک حکیم اپنے کام کا آغاز کیسے کرتا ہے۔ اور اس کام کے لئے بصیرت و حکمت کی ضرورت کیوں ہے۔

اسی طرح دین کا کام کرنے والے کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کون سی قوتیں ہیں جو یہاں اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ ان کے پیچھے محرکات کون سے ہیں۔ ان کے افکار کا ماخذ کیا ہے، ان کا فلسفہ کیا ہے وہ بنیادیں کیا ہیں۔ جن پر یہ قوتیں کام کرنے

اُٹھی ہیں۔ ان ساری چیزوں کا جائزہ لے کر وہ دیکھے گا کہ کیسے ان سے عہدہ برآ ہو سکتا سکتا ہے اور کیوں کر ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے ـــــ مثال کے طور پر ایک شخص جو کسی پہلوان سے کشتی لڑنے جا رہا ہو، وہ پہلے یہ دیکھے گا کہ یہ پہلوان کتنا طاقتور ہے؟ اس کا وزن کیا ہے؟ اس کے معروف داؤ پیچ کون کون سے ہیں، اس کے سابقہ مقابلوں کا کیا نقشہ ہے۔ اس کے مقابلے میں مجھے کتنی تیاری کرنی چاہیئے اور کتنی طاقت فراہم کرنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان سارے پہلوؤں کا جائزہ لے کر مقابلے کے لئے آگے بڑھے گا۔ دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر اکھاڑے میں اُترنے والا آپ سے آپ پچھڑے گا۔

اس کے ساتھ حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ لائن آف ایکشن (LINE OF ACTION) ایسی اختیار کی جائے جس میں زیادہ سے زیادہ موجود مواد استعمال ہو سکے اور جو موجود مواد کو زیادہ سے زیادہ مددگار بنانے کے لئے موزوں ہو۔ مزاحم طاقتوں کا مقابلہ کرنے میں وہ زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کرے اور ایسا لائحہ عمل اختیار کرے کہ مزاحم طاقتوں کا زور زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد ٹوٹ سکے۔

میرے نزدیک مختصراً حکمت کا مفہوم یہی کچھ ہے۔

موعظہ حسنہ اور اقامت دین

دوسری چیز موعظت حسنہ ہے یوں تو اس کے کئی پہلو ہیں لیکن دو چیزیں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ نصیحت اور دعوت و تبلیغ میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو دوسرے شخص کے اندر ضد پیدا نہ کرے، اس میں کد اور غصہ پیدا نہ کرے۔ آپ لوگوں سے ہمیشہ اس طرح اپیل کریں کہ اگر ان کی فطرت میں ذرا برابر بھی بھلائی موجود ہو تو وہ متاثر ہوں اور اگر ان کے اندر کوئی کجی اور ٹیڑھ ہو تو اس کو اور زیادہ کام کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس معاملہ میں ایک مرتبہ امام ابوحنیفہؒ نے ایک بڑی دلچسپ

مثال بیان فرمائی کہ ہم جب مناظرے کرتے تھے تو یہ سمجھتے ہوئے کرتے تھے کہ جیسے ایک آدمی کے کندھے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور اسے اس حد تک احتیاط سے کام لینا ہے کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو یہ پرندہ اڑ جائے ہمیں تو اس پرندہ کو پکڑنا تھا۔ اس لئے ہم اتنی احتیاط کے ساتھ مناظرے کرتے تھے۔

اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ جتنا کچھ ایمان ایک آدمی میں موجود ہو۔ مناظرے کا مقصود اس کو بڑھانا ہو نہ کہ جتنا کچھ موجود ہو وہ بھی ختم ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ تم لوگ ایسی بے دردی سے مناظرے کرتے ہو کہ جتنا کچھ ایک آدمی دین سے دُور ہے تمہارے مناظرے کی بدولت اس سے بھی زیادہ دُور چلا جاتا ہے۔

تو موعظہ حسنہ یہ ہے کہ آپ دعوت و تبلیغ کا ایسا طریقہ اختیار کریں جو دوسروں کو زیادہ سے زیادہ اپیل کرے۔ ان کے اندر ضد پیدا نہ کرے اور ان کو حق سے اور زیادہ دور نہ پھینک دے۔ زبان اور طرز بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ آپ کو لوگوں سے قریب کرے اور ان کو آپ سے مانوس کر دے نہ کہ ان کے دلوں میں آپ کے خلاف نفرت اور غصہ کے جذبات پیدا کر دے۔

دوسری ضروری چیز مواعظ حسنہ کے لئے یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو نصیحت کرنے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرنے سے پہلے یہ جانیں کہ اس کی گمراہی کی پشت پر کیا چیز ہے۔ اس کی گمراہی کے اسباب کیا ہیں۔ پھر اس کو اس کے مطابق سمجھائیں اگر وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہے تو آپ اس کی ذہنی الجھنیں رفع کرنے کی کوشش کریں اور معقول دلائل کے ساتھ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ اگر کوئی شخص کسی جذباتی بگاڑ میں مبتلا ہے تو اسے سمجھانے میں ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے اس کے جذبات میں اگر دین سے انحراف کی کوئی چیز ہو تو وہ پلٹ کر ... کی طرف مائل کرنے والی بن جائے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور بھی نگاہ میں رکھیئے۔

جو آدمی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے اٹھتا ہے۔ اس کو دنیا میں طرح طرح کے

آدمیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس کو موافقین ہی نہیں ملتے مخالفین بھی ملتے ہیں۔ مخالفین میں بعض لوگ نہایت بد زبان اور بد مزاج ہوتے ہیں۔ بعض لوگ آپ کو شکست دینے کے لئے ایسے TACTICS استعمال کرتے ہیں کہ اگر آپ جوابی کارروائی پر اتر آئیں تو اپنے مقصد اور مدعا سے دور ہٹتے چلے جائیں گے۔ جس آدمی کو بھی دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہو اس کے اندر بے انتہا صبر و تحمل ہونا چاہیئے ــــ اور یہ چیز کہیں جا کر بھی ختم نہیں ہونی چاہیئے۔ سخت سے سخت باتوں کو بھی آپ برداشت کریں اور ٹال دیں جو شخص آپ کو الجھانے کی کوشش کرے اس کو ایک مرتبہ آپ معقول طریقے سے سمجھائیں۔ لیکن جب آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ شخص محض الجھانا چاہتا ہے تو اس کو سلام کرکے علیٰحدہ ہو جائیں۔ اپنا وقت ایسے افراد پر بالکل ضائع نہ کریں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی راستے سے گذر رہے ہیں اور دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہیں اور ہر جھاڑی آپ کے دامن سے الجھ رہی ہے۔ اب اگر آپ نے ایک ایک جھاڑی سے خود ہی الجھنا شروع کر دیا تو راستہ طے نہیں کر سکیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے دامن کو کسی کانٹے سے بچانے کی فکر کیجئے لیکن جب دیکھیں کہ نہیں چھوڑتا تو دامن پھاڑ کر کانٹے کے حوالے کیجئے کر تو اس سے دل بہلا میں آگے چلا۔
کام کرنا ہے تو یہ راستہ آپ کو اختیار کرنا پڑے گا

قانون اور معاشرہ[1]

کوئی سوسائٹی اس وقت تک مہذب قرار نہیں دی جاسکتی جب تک اس میں قانون کی پابندی کرنے اور اس کا احترام ملحوظ رکھنے کا داعیہ نہ پایا جاتا ہو۔ قانون اور احترامِ قانون کے بغیر نہ تو خود کسی معاشرے کا وجود و بقا ممکن ہے اور نہ اس کے مہذب ہونے کا کوئی تصور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لاقانونیت وحشت ہے، اور قانون تہذیب ہے لیکن یہ مقامِ حیرت ہے کہ آج کی دنیا میں قانون کی اس حیثیت اور اہمیت کے مسلّم ہونے کے باوجود دنیا بھر میں لاقانونیت کی عام بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں جگہ جگہ یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک میں بھی یہی صورتِ حال کارفرما ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے ؟

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، قانون کے بارے میں چار چیزیں سامنے آتی ہیں اور یہ گویا وہ چار شرائط ہیں جن کے بغیر احترام قانون کا پیدا ہونا محال ہے۔

احترامِ قانون کی شرائط :

۱۔ پہلی چیز یہ ہے کہ قانون ایسا ہونا چاہئیے کہ جس کی صداقت اور معقولیت پر لوگ ایمان لا سکیں۔ اگر قانون کے بارے میں تاثر یہ ہو کہ اس کی بنیاد

---

[1] : ۱۴ ار نومبر ۱۹۶۷ء ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن جہلم کے ایک اجلاس سے خطاب

حق و صداقت اور عدل و انصاف پر نہیں ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام اور پابندی کرنے کا جذبہ کسی طرح ممکن نہیں۔

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ تعلیم و تربیت اور دوسرے وسائل و ذرائع کے ساتھ معاشرے کی تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ لوگ قانون کی پابندیوں کو قبول کرنے کے عادی بن جائیں۔ اگر معاشرہ ایسا ہو کہ وہ لوگوں کے اندر قانون کے تقاضوں کے برعکس عادات پروان چڑھانے والا ہو اور ناروا سرگرمیوں کے ذریعے لوگوں کے اندر خود غرضی، مفاد پرستی اور نفس پرستی پیدا کر رہا ہو جو قانون کی پابندی کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو تو ظاہر بات ہے کہ قانون خواہ بہتر سے بہتر بھی موجود ہو، عملاً ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

۳۔ تیسری چیز جو میرے خیال میں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے اندر اس قانون کو منطبق کرنے والی عدالتیں ایسی ہونی چاہئیں جو لازمی طور پر اس قانون کی صحت و صداقت پر ایمان رکھنے والی ہوں۔ وہ محض قانون کو جاننے والی ہی نہ ہوں، بلکہ دل کی گہرائی سے اس کو ماننے والی بھی ہوں۔ قانون کی صحیح تطبیق و تعبیر کے لئے یہی کافی نہیں کہ محض الفاظ کی حد تک اس کی عالم اور ماہر ہوں بلکہ ضروری ہے کہ وہ اس قانون کی حقیقی غرض و غایت اور اس کی اسپرٹ کو بھی پوری طرح جانتی ہوں۔ اگر ان عدالتوں کے اندر اس قانون کے برحق ہونے کا ایمان نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اس کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلیں گی اور اسے توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ بنا دیں گی۔

۴۔ چوتھی چیز جو قانون کے معاملے میں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی ایڈمنسٹریشن، یعنی وہ ہاتھ جو اس قانون کو نافذ کرنے اور معاشرے سے اس کی پابندی کروانے کے ذمہ دار ہیں۔ احترام قانون کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کی ایڈمنسٹریشن بھی ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو قانون کے برحق

ہونے پر پوری طرح ایمان رکھتے ہوں اور پھر انصاف کے ساتھ اس قانون کو معاشرے میں نافذ بھی کریں۔ اگر صورت حال یہ ہو کہ خود ایڈمنسٹریشن قانون کے تقدس کو ملحوظ نہ رکھے اور اس سے فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے تو اس بات کی توقع عبث ہے کہ عام لوگ قانون کی پابندی کریں گے۔ ایسی ایڈمنسٹریشن تو خود قانون شکنی کرنے والوں کی پشت پناہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یہ ہیں چار چیزیں جو میرے خیال میں لوگوں کے اندر پابندئ قانون اور احترام قانون پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں یہ چیزیں موجود نہیں ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ معاشرہ وحشت کی طرف جا رہا ہے۔ اور تہذیب اس کے درمیان سے رخصت ہو رہی ہے۔

قانون کا احترام کیوں ختم ہو رہا ہے؟

اب میں چاہتا ہوں کہ انہی چیزوں کو کچھ تشریح کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کروں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ آج دنیا میں لاقانونیت کے پھیلنے اور قانون کے احترام کے اٹھ جانے کے کیا اسباب ہیں۔

موجودہ زمانے میں قانون سازی کا جو نظام پایا جاتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ لوگوں میں قانون کا احترام پیدا کرے ——— قانون کا یہ احترام اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ قانون دہندہ (LAWGIVER) کے متعلق لوگوں کو یہ علم ہو کہ وہ عادل و منصف ہے اور اس قانون سازی کے پیچھے اس کے اپنے کچھ مخصوص اغراض و مقاصد کام نہیں کر رہے ہیں۔ اسی طرح یہ قانون ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں اعتدال و توازن اور معقولیت پائی جاتی ہو اور وہ انصاف کے مسلمہ تصورات سے ٹکراتا نہ ہو۔ بلکہ اس کو دیکھ کر انسان کی عقل گواہی دے کہ یہ ایک معقول اور عادلانہ قانون ہے۔ ایسے قانون کا احترام کبھی نہیں ہو سکتا ہے جس کے بارے میں لوگ یہ جانتے ہوں کہ کوئی خاص جماعت یا طبقہ

اس قانون کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنے مخصوص مفادات کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی قانون ایسا ہو کہ عقل سلیم بادی النظر ہی میں اسے قبول کرنے سے انکار کر دے اور وہ عقل و انصاف کے تقاضوں کی ضد ہو تو ایسا تو ہو سکتا ہے کہ اس کو زبردستی لوگوں پر مسلط کر دیا جائے لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بھی پیدا ہو۔ لوگ اگر قوت کے خوف اور سزا کے ڈر سے اس کو مان بھی لیں گے تو ان کے دل اسے کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ اس سے بچ نکلنے کے لئے فرار کی صورتیں سوچیں گے اور چور دروازے ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس طرح قانون دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

موجودہ زمانے میں قانون سازی کے جو طریقے رائج ہیں، ان میں قانون ساز اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کا طریقہ سب سے اہم ہے لیکن قانون سازی کے اس طریقے کے اندر بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں بھی، کہ جہاں انتخابات منصفانہ ہوتے ہیں، یہ حالت ہے کہ ان قانون ساز اسمبلیوں میں منتخب ہو کر جانے والے لوگوں پر یہ یقین کسی کو نہیں ہوتا کہ وہ مخلص اور بے غرض لوگ ہیں۔ انتخابات میں وہ جس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے کامیابی حاصل کرتے ہیں، ان کی کامیابی میں ذاتی رسوخ اور سرمایہ اور لالچ جس طرح کام کرتے ہیں، پھر کسی شخص کی ذاتی صلاحیت و اہلیت سے قطع نظر پارٹی کی اغراض جس جس طرح کار فرما ہوتی ہیں، یہ سب چیزیں قانون سازی کے مقام و منصب کے لئے ان کی نااہلی کا ثبوت ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود منتخب کرنے والوں کے دلوں میں ایسے لوگوں کی قانون سازی کے متعلق بے غرضی کا یقین نہیں ہوتا ——— یہ تو ان ممالک کی بات ہے جہاں انتخاب منصفانہ ہوتے ہیں اور اسمبلیوں کے ارکان جمہوری طریقوں سے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ ممالک ہیں جہاں انتخاب منصفانہ نہیں ہوتے اور لوگ یہ جانتے ہوتے ہیں کہ ہمارے یہ نمائندے کن راستوں سے منتخب ہو کر آئے ہیں، کون سی قوتیں ان کی پشت پر تھیں اور انتخاب جیتنے کے لئے کیا کیا

دھاندلیاں انہوں نے کی ہیں۔ ایسے قانون سازوں کے متعلق لوگ یہ کبھی نہیں مان سکتے کہ جو قانون سازی وہ کریں گے وہ خلوص اور بے غرضی پر مبنی ہوگی۔ اسی لئے ایسے قانون کا کوئی احترام ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

موجودہ دور میں قانون سازی کا ایک طریقہ اور بھی ہے جسے مختلف ممالک میں جابر حکمرانوں نے اپنے لئے اختیار کیا ہے۔ یعنی آرڈیننس کا طریقہ۔ دوسرے لفظوں میں وہ شخص جس کے ہاتھ میں حکومت واقتدار ہے وہ ملک کی اسمبلیوں سے اپنی مرضی کی قانون سازی کا کام لینے کے ساتھ ساتھ کسی خاص ضرورت سے ایک قانون بناتا ہے اور بذریعہ آرڈیننس اسے نافذ کرتا ہے۔ قانون ساز اداروں سے بالا بالا بناتے ہوئے اس قانون کو کوئی شخص بھی بے غرضی اور اخلاص پر مبنی قرار نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اس کا احترام بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونا محال ہے

پھر یہ قانون اب تک جس صورت میں سامنے آیا ہے وہ بھی سراسر ناانصافی پر مبنی ہے ——— مثلاً انسانی عقل اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ کسی شخص کو یونہی پکڑ کر قید میں ڈال دیا جائے، بغیر اس کے کہ اس کو اپنی صفائی کا حق دیا جائے یا کسی عدالتِ انصاف میں اس بات کی شہادت قائم کی جائے کہ اس شخص نے کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا یا کم از کم واقعی وہ کوئی جرم کرنے والا تھا۔ ان سب شرائط کو بالائے طاق رکھ کر اگر کوئی حاکم مقتدر محض اس بنا پر کسی کی گرفتاری کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر اس فیصلے سے "مطمئن" ہے تو اس کا یہ "اطمینان" دنیا کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اس کا مفاد ہی ہے جو اس سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اگر ایک شخص کے ارتکاب جرم یا کم از کم اندیشۂ ارتکاب جرم کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے، تب بھی وہ اس کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا سے قانون کا احترام اٹھ جانے کی ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ قانون ایسے ذرائع سے آ رہا ہے جن کے منصفانہ ہونے کا اطمینان

لوگوں میں نہیں ہے۔ ایسا قانون زبردستی نافذ تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے احترام کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، احترام قانون کے لئے ناگزیر شرط یہ ہے کہ لوگوں میں اس امر کا اطمینان ہو کہ قانون دہندہ (LAW GIVER) عدل وانصاف کی بنا پر قانون بنا رہا ہے اور کوئی ذاتی غرض اس کے پیچھے کارفرما نہیں ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ احترام قانون کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کو دیکھ کر ہر عقل انسانی یہ تسلیم کر لے کہ یہ ایک معقول قانون ہے۔

"چنانچہ میرا یہ دعویٰ ہے اور اگر آپ بھی غور کریں گے تو اسے درست تسلیم کریں گے کہ خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون یہ شرائط پوری نہیں کرتا۔"

اسلامی قانون ـــــ ایک مثالی قانون :

دنیا کے قانون سازاداروں یا افراد کے بنائے ہوئے قوانین کے برعکس یہ قانون ایسا ہے کہ لوگ اس پر ایمان لا سکتے ہیں، اس کے برحق ہونے کا یقین کر سکتے ہیں۔ پھر وہ اس امر کا بھی اطمینان کر سکتے ہیں کہ جس ہستیؐ کے ذریعے خدا کا یہ قانون انسان کو ملا ہے، اس ہستیؐ کی کوئی ذاتی غرض اس سے وابستہ نہیں ہے۔ اس پر یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قانون اس نے خود گھڑ لیا ہو۔ بلکہ اس کا دعویٰ بھی یہی ہے اور اس کی زندگی بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اس کا تعلق براہ راست خدا ہی سے ہے اور یہ قانون اسے اسی کی طرف سے ملا ہے۔ پھر یہ قانون ایسا ہے کہ اس کے معقول ہونے کے متعلق خود انسان کا دل گواہی دیتا ہے۔ اس کے اندر یہ صفت بھی ہے کہ یہ کسی مخصوص مفادات کی حفاظت کے لئے نہیں بنایا گیا بلکہ خود انسان کا مفاد اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ یہ کسی کی ذاتی اغراض پر مبنی نہیں ہے، اس لئے خود اس کے ساتھ بھی

اغراض کے کھیل نہیں کھیلے جا سکتے۔ اس کے برعکس اس کو مان لینے اور ہر حال میں اس کا احترام کرنے کے گہرے جذبات انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

قانون کے سلسلے میں دوسری ضروری چیز جو میں نے عرض کی تھی وہ یہ ہے کہ اس کی پشت پر ایک ایسا معاشرہ موجود ہونا چاہیئے جس کی مسلسل تعلیم و تربیت اس انداز میں ہوتی ہو کہ وہ قانون کی پابندی اور احترام کا خوگر ہو جائے۔

اسلام قانون کا احترام کیسے پیدا کرتا ہے :

قانون کے احترام کے معنی کسی دباؤ یا خوف کی وجہ سے اس کی پابندی کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خارجی دباؤ کے بغیر آدمی کا دل اس کا احترام اور پابندی کرنے پر آمادہ ہو۔ قانون کے تقدس کا تصوّر اس قدر ذہنوں میں راسخ ہو کہ لوگ اس کی پابندی اس وقت بھی کریں جب اگر وہ اسے توڑنا چاہیں تو کوئی انہیں دیکھنے والا نہ ہو، وہ اس جگہ بھی اس کا احترام اپنے دل کے جذبے سے کریں۔ جہاں کوئی پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی دیکھنے اور پکڑنے والی موجود نہ ہو ——— یہ چیزیں جہاں تک میں نے دیکھا ہے صرف اسلام کے تجویز کردہ نظام میں پائی جاتی ہیں اور اس سے بہتر کوئی ذریعہ سوسائیٹی کی اصلاح کے لئے ممکن نہیں ہے۔

اسلام نے اپنی عبادات کے ذریعے خدا خوفی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس کو دلوں میں زندہ و بیدار رکھنے کا ایک بے نظیر نظام قائم کیا ہے۔ مثلاً رمضان المبارک میں ایک ایک شخص کو مہینے بھر مسلسل اور پیہم تربیت اس بات کی دی جاتی ہے کہ جس قانون پر وہ ایمان لایا ہے اسے وہ دل کی رغبت سے مانے وہ اس کی خلاف ورزی کا موقع پاتے، لیکن اس سے باز رہے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر روزہ توڑ سکتا ہے لیکن اللہ کے بارے میں اس کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے ہر فعل کو جانتا ہے۔ دنیا کو چاہے معلوم نہ ہو لیکن وہ اس کی نگاہ سے چھپ کر کچھ نہیں کر سکتا ——— یہی تربیت ہر مسلمان کو نماز کے ذریعے دی

جاتی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی جاتی ہے کہ اس کا معاملہ اس خدا سے ہے جو عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ہے۔ جو لوگوں کے لئے غیب ہے وہ بھی اس کے لئے شہادت ہے اور جو لوگوں کے لئے شہادت ہے وہ بھی اس کے لئے شہادت ہے۔ وہ تمہارے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور تمہارے باطن سے بھی باخبر ہے۔ تم اس خدا کی رعیت ہو جس کی گرفت سے نہ تم دنیا میں چھوٹ سکتے ہو اور نہ کبھی آزاد ہو سکتے ہو۔

یہ تربیت اگر کسی معاشرے کو دی جائے اور پھر لوگ اس قانون پر ایمان بھی رکھتے ہوں تو لامحالہ وہ دل کے جذبے سے اس کا احترام اور پابندی ملحوظ رکھیں گے اور اس کی خلاف ورزی سے گریز کریں گے۔

احترامِ قانون کے سلسلے میں تیسری ضروری چیز جو میں عرض کر چکا ہوں وہ یہ ہے کہ اس قانون کی تعبیر و تطبیق کے لئے ایسی عدالتیں موجود ہوں جو اس کے برحق ہونے کا ایمان رکھتی ہوں۔ وہ صرف اس کے الفاظ کی عالم اور ماہر نہ ہوں بلکہ اس کی حقیقی روح کو بھی سمجھتی ہوں اور نہایت ذمہ داری کے ساتھ اس کے اطلاق و نفاذ کے لئے کوشاں بھی ہوں ——— یہ شرط بھی صرف خدا کے قانون میں پوری ہوتی ہے۔ دنیا کے کسی بہتر سے بہتر قانون کے متعلق بھی یہ دعوٰی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے مطابق فیصلے دینے والے ہزار ججوں میں سے ایک بھی اس کے برحق ہونے پر کامل ایمان رکھتا ہے۔ وہ اس کا بہت بڑا عالم اور بہترین شارح ہو سکتا ہے لیکن اس کے برحق ہونے پر ایمان نہیں رکھ سکتا۔

یہی معاملہ ایڈمنسٹریشن کا ہے۔ اگر کسی قانون کو نافذ کرنے والے یہ جانتے ہوں کہ اس قانون کے پیچھے کیا خاص اغراض کارفرما ہیں اور بنانے والے نے اسے کن مخصوص مقاصد کے لئے بنایا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کے برحق ہونے پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔ وہ حکومت کے کارندے ہونے کی وجہ سے محض تنخواہ پانے کے لئے اس کا نفاذ کرتے ہیں، لیکن درحقیقت دل سے وہ اسے کبھی احترام

کے قابل نہیں سمجھتے، جب خود ان کے دلوں میں اس قانون کے برحق ہونے کا ایمان ویقین موجود نہ ہو تو وہ لوگوں سے اس کی پابندی اور احترام کیسے کرا سکتے ہیں؟ خود ان کے ذاتی مفادات اور اغراض قدم قدم پر اس کے نفاذ کی راہ میں حائل ہوں گی ——— یہ شرط بھی صرف خدا کا قانون پوری کرتا ہے اور اس کے نافذ کرنے والے خود اس قانون کا احترام اور پابندی اسی طرح کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جس طرح معاشرے کا کوئی عام فرد۔

قانون دانوں کے لئے دعوتِ فکر:

ان معروضات کے پیش نظر میں اپنے ملک کے قانون دان طبقے کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا اسلام کے سوا کوئی اور قانون ہے جو تہذیب کی حفاظت کر سکے اور معاشرے کو وحشت کی طرف جانے سے بچا سکے؟

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مغربی ممالک میں جو لاقانونیت پائی جاتی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کو اپنے قانون سازوں کے بے غرض اور مخلص ہونے کا یقین نہیں ہے۔ اور نہ قانون دان ہی قانون کے برحق ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اسلام کے قانون میں یہ دونوں عیب نہیں پائے جاتے۔ اس لئے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ملک کو وحشت اور بربریت کی طرف جانے سے صرف اسلام کا قانون روک سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ فیصلہ محض کاغذی نہ ہو۔ بلکہ پورے معاشرے کا نظام تعلیم و تربیت ایسا ہو کہ وہ اسے قانون کے نفاذ کے لئے عملاً کارساز کرے۔ اسی طرح اس ملک کی عدالتیں، پولیس اور ایڈمنسٹریشن بھی اس کے برحق ہونے پر ایمان لا کر اسے نہایت اخلاص اور دیانتداری کے ساتھ نافذ کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔

وکلاء کے سوالات

س۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام کا قانون موجودہ ترقی یافتہ زمانے کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ آپ کے نزدیک اس کا جواب کیا ہے؟

ج۔ اس اعتراض کے جواب میں، مَیں دو چیزوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ یہ "ترقی یافتہ" اور "ضروریات" کے الفاظ ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ترقی کا مفہوم کیا ہے۔ لفظ ترقی کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ کوئی خاص غایت (G O A L) ہمارے پیش نظر ہو، جس تک ہم پہنچنا چاہتے ہوں، تو اس گول کی طرف بڑھنے کا نام ترقی ہے اور اس سے مخالف سمت کو جانا رجعت اور ترقی سے محرومی ہے ——

اب اگر ہم اپنے لئے کوئی ایسا گول مقرر کر لیں جو باطل ہو تو اس کی طرف پیشقدمی کرنا ترقی نہیں ہے۔

سوال یہ ہے، موجودہ زمانے میں انسان کا جو گول مقرر کیا گیا ہے، کیا انسانی زندگی کا حقیقی مقصد اور غایت اولیٰ وہی ہے جو جدید تہذیب نے قرار دی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ خود مغرب میں اس وقت کثیر تعداد ایسے مفکرین کی موجود ہے جنہیں اب اس بات کا یقین نہیں ہے کہ اس تہذیب نے انسان کا جو گول مقرر کیا تھا، وہ صحیح ہے اب وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ اس غلط گول کی طرف پیش قدمی ہی اس دور کے سب مصائب اور مسائل کی اصل جڑ ہے —— اس کے برعکس اسلام نے جو گول (G O A L) انسان کے لئے مقرر کیا ہے ہم اسی کو برحق سمجھتے ہیں اور اسی کی طرف بڑھنا ہمارے نزدیک ترقی ہے اور اس ترقی کے لئے اسلامی قانون ہی برحق اور ضروریات کے مطابق ہے۔ اس دور میں جو "ترقی"

ہوتی ہے۔ میں اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں۔ مثلاً انسان کو شیر پر قیاس کیجئے اور دیکھئے کہ شیر پہلے اپنے پنجوں سے شکار مارتا تھا۔ پھر اس نے بندوق بنانا سیکھ لی، تو وہ بندوق سے شکار کرنے لگا۔ اس کے بعد اسے توپ کا استعمال آ گیا۔ اور آج اس نے ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار بنا لئے ہیں اور اسے بیک وقت ہزاروں لاکھوں جانوں کو ختم کرنے کی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے انسانیت کی کیا ترقی ہوئی؟

اب اس اعتراض کے دوسرے پہلو کی طرف آیئے۔ جب ہمارے نزدیک موجودہ زمانے کی ترقی کا گول ہی غلط ہے تو پھر اس کی ضروریات بھی اسی طرح غلط ہیں۔ اس صورت میں ہم اس زمانے کی ضروریات کو حقیقی ضروریات کیوں کر سمجھ سکتے ہیں اس زمانے کی ضرورت تو مثال کے طور پر بدکاری بھی ہے۔ اور بدکاری بھی ایسی کہ عورت گناہ تو کرے لیکن اسے حمل کا خطرہ نہ ہو۔ ظاہر ہے اسلام اس ضرورت کو ضرورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ——— چنانچہ پہلے آپ اس دور کی وہ حقیقی یعنی (GENUINE) ضروریات بتایئے، جو واقعی ضروریات ہیں تو پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام ان کے لئے کیا قانون دیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت موجودہ تہذیب کی بدولت دنیا کی تباہی اور خرابی کا واحد سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے بہت سی ایسی چیزوں کو ضروریات ٹھہرا لیا ہے جو حقیقت میں اس کی ضروریات ہیں نہیں اور یہ نتیجہ ہے انسان کے لئے ایک غلط گول مقرر کرنے اور ترقی کے نام پر اسے ہلاکت دنیا ہی کے جہنم کی طرف دھکیلنے کا۔

س: آپ نے فرمایا ہے کہ جن معاملات میں خدا کے قانون میں ہدایت موجود نہیں ہے، ان میں قانون سازی کے اختیارات عام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا لوگوں کے دلوں میں ایسے قوانین کے لئے بھی دوسرے الٰہی قوانین کی طرح احترام پیدا ہونا ممکن ہے؟

ج- یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جن امور میں ہمیں آزاد چھوڑا گیا ہے، ان

میں آزاد ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان امور میں قانون سازی کرتے وقت اسلام کے اصول عامہ سے انحراف کیا جائے اور اس کے تصور انصاف کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے امور میں قانون سازی کرنے کے مجاز اور اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جن کا ذہنی، اعتقادی اور فکری پس منظر پوری طرح اسلامی ہو۔ کوئی شخص جو مروجہ قانون کی بڑی سے بڑی سند بھی رکھتا ہو، لیکن جب تک وہ کتاب و سنت سے واقف نہیں ہے اور اسلام کے اصولِ عامہ اور تصورِ عدالت و انصاف سے آگاہ نہیں ہے، وہ اسلامی قانون سازی کا اہل نہیں ہے۔ لیکن اگر ایک شخص موجودہ دور کے قوانین کا بھی ماہر ہو اور اسلام پر بھی صحیح اعتقاد رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ قانون سازی کرتے وقت نہ تو اسلام کے اصول عامہ سے انحراف کرے گا اور نہ اسلام کی حقیقی روح کو نظر انداز کرے گا۔

فقہائے امت نے جو قانون سازی کی ہے وہ یہی شان رکھتی ہے اور یہ قانون سازی ایک بڑی ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں احکام کی تفصیلات نہیں ہیں۔ بلکہ اصولی اور اجمالی ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کی تفصیلات نہیں ہیں۔ یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کس چوری پر ہاتھ کاٹا جائے؟ کون سا ہاتھ اور کہاں سے کاٹا جائے؟۔ اس نصِ قرآنی کی کچھ تشریح احادیث میں بیان ہوئی ہے اور اس کے بعد ساری تفصیلات فقہاء نے متعین کی ہیں۔ اگر ایک حکم قرآن مجید میں صرف ایک سطر میں بیان ہوا ہے اور پھر احادیث میں اس کی تشریحات ایک صفحے میں آتی ہیں تو ان کی روشنی میں فقہاء کی بیان کردہ تفصیلات کم از کم پچیس تیس صفحات میں پھیلی ہوتی ہیں۔ ان فقہاء میں جزئیات اور تفصیلات کے درمیان اختلاف بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن اپنی ساری اختلافی بحثوں کے باوجود انہوں نے اسلام کے اصولِ عامہ سے کہیں کوئی سرِ مو تغیر نہیں کیا اور نہ اسلام کے بنیادی

مسلمات سے باہر جا کر کوئی تشریح کی ہے۔ ان کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کی حیثیت ویسے ہی معقول اختلافات کی ہے جو مختلف اہلِ فکر کے درمیان فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں لیکن اس سے کسی پر بدنیتی اور عدمِ اخلاص کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اب رہا ایسے قوانین کے احترام کا معاملہ! اگر قانون کی تشریح کرنے والے ایسے لوگ ہوں جن کے ایمان اور اخلاص اور کردار پر لوگوں کو یقین نہ ہو تو قانون کا احترام کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس کے برعکس قانون بنانے والوں یا شارحین قانون پر لوگوں کو کامل اعتماد ہو تو ان کے وضع کردہ قوانین کو بھی وہی احترام و اعتماد حاصل ہوگا۔ مثلاً فقہائے اسلام سب کے سب ایک مثالی سیرت و کردار کے مالک لوگ تھے، اُن میں سے کسی ایک پر بھی کسی بد دیانتی، خود غرضی یا نفس پرستی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، بلکہ اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ جس درجے کے بے غرض، مخلص اور بے لوث تھے اور بے داغ سیرت و کردار کے مالک تھے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے تجویز کردہ قوانین کو لوگ صدیوں سے مانتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی کروڑوں لوگ مانتے ہیں۔ یہ غیر معمولی اعزاز جو ان کو حاصل ہوا اور آج بھی حاصل ہے تو یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ ان کی زندگیاں نہایت پاکیزہ اور قابلِ اعتماد تھیں۔

پھر ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ احترام قانون کے لئے خود معاشرے کے لوگوں کا ایماندار اور قانون کے بارے میں مخلص ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر احترام قانون کے تقاضوں کا پورا ہونا محض ایک خام خیالی ہے۔

س: موجودہ آئین میں بنیادی حقوق کے ترمیمی قانون کے ذریعے اضافہ شدہ پرنسپلز آف پالیسیز کے تحت جہاں یہ درج ہے کہ ملک کے قوانین اسلام کے خلاف نہیں ہوں گے وہاں یہ لکھا گیا ہے کہ اسلام کی تعبیر و تشریح ہر فرقہ اپنے عقائد

کے مطابق خود کرے گا۔ کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں؟

ج۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے علماء کا جو اجتماع اسلامی ریاست کے بنیادی اصول متعین کرنے کے لئے ہوا تھا، اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ پرسنل لاء کی حد تک تو ہر فرقہ اپنے قانون پر کاربند رہے گا۔ لیکن قانون ملکی (LAW OF THE LAND) وہ ہوگا جسے ملک کے عوام اساس مانتے ہیں ـــــــ اسی چیز کو ۱۹۵۶ء کے آئین میں اختیار کیا گیا تھا اور اسی چیز کی نقل موجودہ آئین میں بھی ہے۔ لیکن اگر اس میں پرسنل لاء اور لاء آف دی لینڈ میں فرق نہیں کیا گیا تو یہ غلط ہے۔ صدیوں سے جمہوری ملکوں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ملک کا عام قانون تو وہی ہوگا جسے ملک کی اکثریت مانتی ہے۔ لیکن کم تعداد والے گروہوں کے لئے ان کا پرسنل لاء موجود رہتا ہے۔ یہی اصول ہمیں اپنے ہاں بھی ملحوظ رکھنا ہوگا ـــــــ البتہ یہ بات واضح رہے کہ ملک کے قانون فوجداری میں ہر فرقے کے الگ الگ پرسنل پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہاں تو لاء آف دی لینڈ کی عملداری ہوگی جو ملک کی اکثریت کا قانون ہوگا۔ البتہ شادی بیاہ اور ایسے ہی دوسرے تمام معاملات میں ہر گروہ کو اپنے عقائد کے مطابق فیصلے کرنے اور معاملات چلانے کا اختیار ہوگا۔

س۔ کیا ہمارے ملک میں قانون سازی کے لئے اور پھر عدالتوں کے ذریعے ان قوانین کے نفاذ اور تعبیر و تشریح کے لئے ہر فقہ کے اپنے اپنے علماء کو اختیارات دیئے جائیں گے؟

ج: ہر فقہ کو نافذ کرنے کے لئے اسی فقہ کے علماء صحیح ہوں گے اور سرِ دست اس کے سوا چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی پیچیدگی ہے جو کئی صدیوں سے چلی آ رہی ہے اور اب اس کو ختم کرنے کے لئے بھی ایک طویل مدت درکار ہے۔ البتہ آغاز کار میں لاء آف دی لینڈ اور پرسنل لاء میں فرق کرنا کافی ہوگا۔ لاء آف دی لینڈ تو لازماً ملک کی اکثریت کے ایمان کے مطابق ہوگا لیکن دوسرے

مسلک کے لوگوں کو اپنے پرسنل لا کا تحفظ حاصل ہوگا۔ تاہم اس صورت میں یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر جج کا اپنا عقیدہ لا آف دی لینڈ سے مختلف ہو تو وہ فیصلہ کس قانون کے مطابق دے گا۔ اسی طرح پرسنل لا میں فیصلہ دیتے وقت اگر جج خود اس عقیدے اور مسلک سے تعلق نہیں رکھتا تو فیصلے کی صورت کیا ہوگی اور اس پیچیدگی کا کیا علاج ہے؟۔

یہ مشکلات فی الواقع اپنی جگہ موجود ہیں اور صدیوں کے انحطاط کی بنا پر فرقہ بندیاں نہایت مضبوط ہو گئی ہیں۔ لیکن ان مشکلات کا سامنا تو بہرحال کرنا پڑے گا۔ اور ان سے بتدریج اور حکمت کے ساتھ ہی عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے ـــــ اگر نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا اہتمام صحیح اسلامی خطوط کے مطابق کر دیا جائے تو دوسری نسل تک پہنچتے پہنچتے گروہی تعصبات کی شدت ختم ہو جائے گی۔

اس وقت دنیا بھر میں عام طور پر چار فقہی مسلک پائے جاتے ہیں اور تمام مسلمان اس پر متفق ہیں کہ چاروں فقہ برحق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جہالت اور تعصب کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات ایک فقہ کو ماننے والے دوسری فقہ کے لوگوں کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کو اپنی مسجدوں تک میں داخل نہیں ہونے دیتے ـــــ یہ تشدد، تعصب اور تنگ نظری جو ایک طویل دورِ انحطاط کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، ایک دن میں تو ختم نہیں ہو سکتی ـــــ جو مشکلات اور پیچیدگیاں صدیوں کے اندر پیدا ہوئی ہیں، ان کے خاتمے کے لئے پچاس برس سے کم کیا درکار ہوں گے۔

(ہفت روزہ "آئین" لاہور ۲۷ نومبر ۱۹۶۷ء)

معاشرہ، قانون اور وکلاء

ایک مہذب سوسائٹی اور ایک وحشی سوسائٹی کے درمیان فرق کرنیوالی چیز "قانون" ہے ایک وحشی سوسائٹی میں لاقانونیت ہوتی ہے اور ایک مہذب سوسائٹی میں قانون اور اسکی پابندی ہوتی ہے ایک صحیح قسم کی مہذب سوسائٹی کے لیے قانون کے سلسلہ میں چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے -

(۱) منصفانہ اور معقول قانون

ایک یہ کہ قانون بجائے خود معقول اور منصفانہ ہو، معروف ہو اور جس کے بارے میں ہر شخص یہ محسوس کرے کہ یہ عقل و انصاف کے مطابق ہے - اس کے خلاف طبیعتیں بغاوت پر آمادہ نہ ہوں اس کے احکام کے متعلق لوگ یہ نہ سمجھیں کہ بے جا احکام ہیں - اس قابل نہیں کہ ان کی پیروی کی جائے الا یہ کہ ان قوانین کو ان کے اوپر زبردستی ٹھونس دیا جائے - مہذب سوسائٹی کی اولین ضرورت یہ ہے کہ قانون منصفانہ اور معقول ہو لوگ اپنے دل سے یہ جانیں کہ یہی قانون ہے اور یہی قانون ہونا چاہیے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے اوپر عمل کریں -

(۲) نافذ کرنیوالی طاقت

دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ اس قانون پر عملدرآمد کرنے والی ایک طاقت ایسی ہو جو ایماندار ہو قانون کو نافذ کرنیوالی طاقت پر لوگ یہ بھروسہ کریں کہ یہ انصاف کے ساتھ اس قانون

پر عملدرآمد کرائے گی۔

(۳) قابلِ اعتماد عدلیہ

تیسری چیز جو ضروری ہے وہ یہ کہ ایک ایسی عدلیہ موجود ہو کہ اگر قانون کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہوں یعنی ان کی تعبیر کے بارے میں، یا لوگوں کے درمیان کوئی جھگڑے اور خصومتیں ایسی پیدا ہوں جن کے بارے میں یہ طے کرنا ہو کہ قانون کے مطابق کیا ہے اور کیا نہیں خواہ وہ حکومت اور اشخاص کے درمیان ہوں یا اشخاص اور اشخاص کے درمیان ہوں تو ایک عدلیہ ایسی ہونی چاہیے جس کے اوپر یہ بھروسہ کیا جا سکے کہ وہ ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق قانون کا انطباق کرے گی۔

(۴) محافظِ قانون اکثریت

اور چوتھی چیز جو ایک لحاظ سے بہت ضروری ہے یہ ہے کہ پبلک میں کثرت سے ایسے لوگ موجود ہوں جو قانون کو جانتے بھی ہوں اور جن کے اندر یہ عزم بھی موجود ہو کہ قانون کے راستے سے سوسائٹی کو نہیں ہٹنے دیں گے۔

ہمارے ملک میں بدقسمتی سے اس مہذب سوسائٹی کی دو شرائط بڑی حد تک ساقط ہو چکی ہیں۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے یہاں کھلم کھلا ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کی دفعات کو دیکھ کر طبیعت میں ابتلا پیدا ہوتا ہے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ آج زبردستی جابرانہ اور ظالمانہ قوانین بنائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف جس انتظامیہ کا کام قانون کو نافذ کرنا ہے خود ان پر عملدرآمد کرنا اور پبلک سے کرانا ہے اس کا طرزِ عمل ایسا ہے کہ لوگوں کا اعتماد اس کے اوپر سے اٹھ چکا ہے۔ جان بوجھ کر قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہے جو قانون موجود ہے، جس کو وہ خود مانتے ہیں کہ یہ

قانون ہے اسکی بھی جان بوجھ کر خلاف ورزی کیجاتی ہے اور اس بھروسہ پر کی جاتی ہے کہ ہماری عدالتوں کا جو طریق کار ہے جو ضابطہ کار ہے وہ کافی مہلت دیتا ہے اس بات کی کہ آپ ایک زیادتی آج کر بیٹھیں تو دس مہینے سال دو سال تک تو کام بہرحال چل جاتے گا بعد میں چاہے عدالت سے فیصلہ خلاف ہی کیوں نہ ہو جاتے ۔ جان بوجھ کر قانون کی خلاف ورزی کرنے والی انتظامیہ اگر موجود ہو تو قانون کے ذریعے جتنا ظلم کیا جاتا ہے ۔ اس سے زیادہ لاقانونی ذریعہ سے کیا جاتا ہے ۔

اب ہمارے معاشرے میں صرف دو ہی عنصر ایسے باقی رہ گئے ہیں جن کے بل پر ہم مہذب معاشرے کی حیثیت سے چل رہے ہیں ۔ ایک عدلیہ جس کے بارے میں ابھی بروہی صاحب نے بھی خراج تحسین ادا کیا ہے ۔ اللہ کے فضل سے اس کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو خدا سے ڈر کر انصاف کرنے والے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ غلط قوانین سے ان کے ہاتھ ہی باندھ دیئے جائیں ۔ لیکن قانون کے اندر جتنی کچھ انصاف کی گنجائش ہے اسمیں وہ اپنی طرف سے کمی نہیں کرتے یہ میں بڑی صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں انتظامی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ عدالتوں پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش سے نہیں چوکتے لیکن اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے جج موجود ہیں جو کسی دباؤ کو قبول کرنے والے نہیں ہیں ۔ کسی لالچ اور کسی دباؤ سے اثر لیے بغیر وہ انصاف کرنے والے ہیں اور اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس ملک میں ابھی ایسے لوگ بھی موجود ہیں ۔

آخری چیز جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا وہ یہ ہے کہ معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے موجود ہوں جن کے اندر قانون کا علم بھی موجود ہو اور یہ مضبوط ارادہ بھی موجود ہو کہ سوسائٹی کو ہم قانون کے راستے سے نہیں ہٹنے دیں گے ۔ یہ ذمہ داری ہمارے وکلا پر پڑتی ہے چونکہ ہمارے ہاں کا لیگل سسٹم پیشہ ور وکیلوں کو چاہتا ہے ۔ عام قانون دان اگر اپنی جگہ یہ سمجھتا بھی رہے کہ قانون کیا ہے اور اس کا انطباق کس طرح ہونا چاہیے تو اس کی رائے کا اثر کچھ نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ اخبارات میں مضمون لکھے جس کا راستہ پریس آرڈی ننس کی موجودگی میں خاصا بند ہو چکا ہے یا پھر پلیٹ فارم کا رخ کرے لیکن یہاں

لاؤڈ سپیکر آرڈی ننس اور دفعہ ۱۴۴ کی پابندی اُس کے راستے میں حائل ہے۔ اب صرف پروفیشنل وکلاء کے بس میں ہی یہ ہے کہ وہ قانون کو جیسا کہ وہ جانتے ہیں جاکر عدالتوں کے ذریعہ سے منوائیں۔ ان کی کوشش ہونی چاہیے کہ قانون کے راستے سے ہمارا معاشرہ نہ ہٹنے پائے اور جس جگہ بھی ظلم ہو رہا ہو وہاں انصاف حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ چند سال پہلے تک میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے ملک کے وکلاء اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس نہیں کر رہے ہیں لیکن پچھلے ایک دو سال میں میں اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ اللہ کے فضل سے ہمارے ملک میں دو چار ہی نہیں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے وکلاء موجود ہیں جو اپنے اس فرض کو محسوس کرتے ہیں اور ان کے اندر شعور، بیداری اور احساس فرض موجود ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کو اب تک یہ دولت نصیب ہے۔

جہاں تک سیاسی پہلو کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک ہی بات آپ سے عرض کروں گا۔ برسر اقتدار گروہ اگر اقتدار ہاتھ سے چھوڑ دے تو وہ سرے سے کوئی اپوزیشن بنانے کے قابل ہی نہیں اس لیے کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ سے چلا جائے تو ان کی پارٹی میں ایک بندہ خدا بھی باقی نہیں رہ جائے گا۔ سیاسی پارٹیاں ایک مدت دراز تک کام کرتی ہیں اس کے بعد وہ کسی مرحلے پر پہنچ کر اس قابل ہوتی ہیں کہ اقتدار ہاتھ سے چھن جانے کے بعد بھی وہ پارٹیاں باقی رہتی ہیں اور اپوزیشن کی حیثیت سے کام کر سکتی ہیں۔

جماعت اسلامی کراچی نے ملک کے ممتاز ماہر قانون جناب اے کے بروہی صاحب اور دیگر وکلاء ۔ (اراکین کمیٹی برائے امداد قانونی) ایک دعوت استقبالیہ ۲۹ دسمبر ۱۹۶۲ء کو سنٹرل ہوٹل میں دی تھی چوہدری غلام محمد امیر جماعت اسلامی کراچی کے خطبہ استقبالیہ کی جوابی تقریر کے بعد بروہی صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ امیر جماعت اسلامی پاکستان سے جو اس وقت وہاں موجود تھے، درخواست کی کہ موصوف بھی اس موقع پر کچھ ضرور کہیں بروہی صاحب کے اصرار پر مولانا مودودیؒ نے ایک مختصر سی تقریر کی۔

معاشرے کے ہر بگاڑ کو صرف اسلامی نظام ہی ختم کر سکتا ہے۔

عزیز گرامی قدر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۱ رمئی ملا۔ جس کے ساتھ "مشرق" کا وہ تراشہ بھی منسلک تھا جس میں آپ نے مجھ سے کچھ سوالات کئے ہیں اور ان کا جواب مانگا ہے معذرت خواہ ہوں کہ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے جلدی جواب نہ دے سکا۔

آپ ایک صاحب قلم آدمی ہیں اور آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں سے انسان یہ توقع رکھتا ہے کہ کسی مصنف سے اس کے خیالات کے متعلق استفسار کرنے سے پہلے وہ اس کی ان کتابوں کا مطالعہ کریں گے جن میں وہ اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہو۔ آپ نے جو سوالات مجھ سے کئے ہیں۔ وہ صرف میرے اس انٹرویو پر مبنی ہیں، جو چٹان میں شائع ہوا ہے۔ اگر میں نے ان مسائل پر پہلی مرتبہ صرف چٹان کے اس انٹرویو ہی میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہوتے اور اس سے پہلے ان پر کبھی تفصیلی بحث نہ کی ہوتی تو بلاشبہ آپ یہ توضیحات مجھ سے طلب کرنے میں حق بجانب ہوتے لیکن آپ خود جانتے ہیں کہ میں ان موضوعات پر اپنی متعدد تحریروں میں تفصیل سے کلام کر چکا ہوں اور چٹان کے انٹرویو میں ان کا صرف ایک مختصر سا خلاصہ بیان کیا گیا۔ اس صورت میں آپ کے لیے مناسب یہ تھا کہ اگر آپ کو فی الواقع میرے خیالات کی تفصیل درکار تھی تو میری ان تحریروں کو پڑھ لیتے۔ پھر کوئی مزید وضاحت درکار ہوتی تو اپنے ان سوالات کو انہی کی حد تک محدود

رکھتے۔

بہرحال چونکہ آپ نے یہ سوالات ایک اخبار کے ذریعہ سے کئے ہیں اور ان کو پڑھ کر بہت سے ذہنوں میں الجھنیں پیدا ہو چکی ہوں گی اس لیے میں مختصراً ان کا جواب عرض کئے دیتا ہوں۔ اگرچہ میرے نزدیک ایک مصنف کے ساتھ یہ زیادتی ہے کہ اس کی کتابیں پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی جائے اور اُسے بار بار اپنی لکھی ہوئی باتوں کو دہرانے پر مجبور کیا جائے۔

— ۱ —

عادل حکومت اور ظالم حکومت کا فرق میں نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنی دو کتابوں "اسلامی ریاست" اور خلافت و ملوکیت میں بیان کر دیا ہے۔ جاگیریں دینے کے متعلق اسلامی قانون کی وضاحت بھی میں اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں کر چکا ہوں اور اس میں میں نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس معاملہ میں حد اعتدال سے کیا مراد ہے یہ کتابیں شائع شدہ موجود ہیں بازار میں بھی ملتی ہیں اور بہت سے کتب خانوں میں بھی مل سکتی ہیں۔

— ۲ —

ایک عادل حکومت نے اگر کوئی زمین کسی معاشرے کی کچھ جائز خدمات انجام دینے کے لیے عطا کی ہو تو یہ عطیہ اُس وقت تک باقی رہے گا جب تک اِن کی خدمت کی ضرورت ہو اور وہ اس کو ٹھیک طرح انجام دے رہا ہو۔ اس عطیہ کا اس کی اولاد کی طرف منتقل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اِن خدمات کی ضرورت بھی باقی ہو اور اسکی اولاد اِن خدمات کو انجام دے سکتی ہو۔ بخلاف اِس کے جو زمین آبادکاری کے لیے دی گئی ہو

یا معاشرے کی کچھ ایسی قابلِ قدر خدمات کے صلے میں عطا کی ہو جو اُس شخص نے انجام دی ہوں تو بجز اس کے کہ یہ عطیہ دیتے وقت حینِ حیات کی شرط لگا دی گئی ہو۔ باقی تمام صورتوں میں وہ اس کی اولاد کی طرف میراث میں منتقل ہوگی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جس زمین کو کسی شخص نے اپنی محنت سے ترقی دی ہو یا جس شخص نے کوئی زمین اپنی خدمات کے صلے میں پائی ہو وہ اسکی اولاد کو وراثت میں نہ ملے۔

—۳—

آپ اعتراض فرماتے ہیں کہ: "یہ جاگیر اس کے مرنے کے بعد ورثا کو کس بنا پر ملے گی؟ جب اللہ کے حضور میں ہر شخص کے صرف اپنے اعمال کام آئیں گے باپ بیٹے کی مدد نہیں کر سکے گا اور نہ شوہر بیوی کی استقامت (شاید اعانت مراد ہے) کے قابل ہو گا تو اللہ کی زمین پر باپ کی خدمات کا معاوضہ بیٹے کو دیئے جانے کے لیے کون سی وجہ جواز موجود ہے۔"

آپ کا یہ اعتراض راہِ راست اسلام کے قانونِ وراثت پر ہے۔ جسے اُسی خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے جس کی کتاب سے آپ نے یہ بات اخذ کی ہے کہ اُس کے حضور ہر شخص کے صرف اپنے اعمال کام آئیں گے اور باپ بیٹے کی یا شوہر بیوی کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ براہ کرم ایک مرتبہ پھر غور کر کے فیصلہ کیجیے کہ آیا آپ قرآن کے بیان کردہ قانونِ وراثت پر اعتراض کرنا چاہتے ہیں؟ اس کا فیصلہ جب آپ کریں گے اور اپنا اعتراض صاف صاف پیش فرمائیں گے تو انشاء اللہ مجھے جواب دینے سے قاصر نہ پائیں گے۔ یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ جو ترکہ بھی کوئی شخص چھوڑتا ہے وہ اسکی اپنی محنتوں کا نتیجہ ہوتا ہے یا کم از کم اُس میں اُس کی محنتوں کے نتائج شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کے استدلال کی رُو سے کسی مرنے والے کی وراثت بھی اس کے پس ماندوں کو نہیں ملنی چاہیے۔ بیوی یا جوان اولاد کے بارے میں تو پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرنے والے کے متروکہ مال میں ان کی محنتوں کے ثمرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو تو آپ کی دلیل کے مطابق وراثت میں حصہ ملنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔

—— ۲ ——

آپ نے پوچھا ہے کہ "ظالمانہ حکومتوں نے جو ناجائز جاگیریں دی تھیں وہ اگر ضبط بھی کر لی جائیں" تو سوال یہ ہے کہ ان ناجائز جاگیروں سے آمدنی حاصل کر کے جو مزید اراضی خریدی گئی ہوں کیا وہ بھی ناجائز ہیں یا جائز؟ اگر جائز ہوں تو کس بناء پر؟

مجھے تعجب ہے کہ آپ نے یہ سوال ان جاگیروں کی ناجائز آمدنیوں سے خریدی ہوئی صرف زمینوں تک محدود کیوں رکھا؟ اس آمدنی سے کپڑے بھی بنائے گئے ہوں گے۔ برتن اور فرنیچر وغیرہ بھی تو خریدے گئے ہوں گے۔ بیویوں کے مہر ادا کر کے ان کو نکاح میں بھی لایا گیا ہوگا، اور نہ معلوم کیا کیا معاملات ان آمدنیوں سے کئے جا چکے ہوں گے جو جاگیرداروں کی موجودہ نسل نے نہیں بلکہ ان کے باپ دادا نے جاگیریں پانے کے بعد ایک طویل مدت کے دور میں کئے ہوں گے پھر یہ سوال صرف جاگیروں تک ہی محدود کیوں رکھا جائے صدیوں سے ہمارے ہاں ہر قسم کے مالی اور معاشی معاملات بڑی حد تک بالکل خلاف شریعت طریقوں پر چلتے رہے ہیں۔ آج مشکل ہی سے کچھ گنے چنے آدمی ایسے ہوں گے جن کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہا جا سکتا ہو کہ ان کی اور ان کے باپ دادا کی ساری آمدنیاں بالکل جائز نوعیت کی تھیں اور آج ان کے گھر ان کے اثاث البیت ان کے پہننے کے کپڑے، اور کھانے کے برتن اور جو کچھ بھی مال جائداد یا سامان ان کے پاس ہے سب جائز آمدنیوں کا ثمرہ ہے۔ اگر اس حقیقت سے آپ کو انکار نہیں ہے تو دو باتوں میں سے ایک کا فیصلہ کیجئے یا تو پاکستان کے کروڑوں باشندوں میں سے ایک ایک کی جانچ پڑتال کر کے یہ تعین کیا جائے کہ ان میں سے کیا چیزیں ان کے پاس جائز ذرائع سے آئی ہیں اور کیا ناجائز ذرائع سے۔ یا سب کو مشتبہ قرار دے کر اس کی ضبطی کا حکم دے دیا جائے اور ہر شخص کی ہر چیز چھین کر اسے ٹھیک اس حالت میں چھوڑ دیا جائے جس طرح وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا پھر میں پوچھتا ہوں کہ انہیں چھینے گا کون؟ جس حکومت یا سیاسی ادارے کو یہ خدمت انجام دینے کے لیے مقرر کیا جائے گا، سب سے پہلے تو انہیں خود یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ان کے پاس ان کا اپنا اور ان کے باپ

باپ دادا کے وقتوں کی آمدنیوں کا جو کچھ بھی ثمرہ ہے وہ سب جائز نوعیت کا ہے اور اگر وہ یہ ثابت نہ کر سکیں تو ان کو تن کے کپڑے اتار دینے کے بعد یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس پاکیزہ فریضہ کو انجام دیں۔

آپ کے سوال کے ان منطقی نتائج کی طرف میں آپ کو اس لیے توجہ دلا رہا ہوں کہ جس نوعیت کی کھوج کرید آپ کرنا چاہتے ہیں وہ کسی حد پر جا کر رک نہیں سکتی اور اس کا انجام آخرکار یہ ہوگا کہ ہمارا پورا معاشرہ تلپٹ ہو کر رہ جائے گا خیریت اسی میں ہے کہ جہاں تک پچھلے زمانے کی چھوڑی ہوئی خرابیوں کا تعلق ہے ان میں ظلم اور ناہمواریوں کی جو نمایاں شکلیں سامنے موجود ہیں۔ ان کی تلافی پر اکتفا کیا جائے اور آئندہ کے لیے ایک صحیح اسلامی نظام یہاں قائم کر دیا جائے جو بتدریج تمام خرابیوں کی اصلاح بھی کرے اور خرابیوں کی پیدائش بھی روک دے گا۔

۵

میں نے اختصار کے ساتھ اپنے انٹرویو میں ٹیکس عائد کرنے کے متعلق اسلام کی جس پالیسی کا ذکر کیا تھا اس پر آپ نے کتنے سوالات کر ڈالے ہیں۔ حالانکہ وہ سوالات پیدا ہی نہ ہوتے اگر آپ نے میرے وہ مضامین پڑھ لیے ہوتے جو میں نے "قرآن کی معاشی تعلیمات" "اسلام اور عدل اجتماعی" "اسلامی نظم معیشت کے اصول و مقاصد" "اسلام کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے لکھے ہیں اور پمفلٹوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان کو آپ بغور مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام سارے معاشی مسائل کو صرف قانون اور سیاسی طاقت کے زور سے حل نہیں کرتا بلکہ تعلیم اخلاقی تربیت، معاشرتی اصلاح اور دوسرے بہت سے ذرائع سے کام لے کر انسان کو بحیثیت فرد اور انسانی معاشرے کو بحیثیت مجموعی درست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور قانون کی طاقت صرف اس جگہ استعمال کرتا ہے جہاں تمام تدابیر اصلاح کے باوجود خرابی کی کوئی صورت باقی رہ جائے آپ پہلے تو یہ فرض کرتے ہیں کہ معاشرے کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے گا جو اس وقت بگاڑ کے ہمہ گیر سیلاب سے

پیدا ہو چکی ہے اور پھر پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ صرف اسلام کے معاشی قانون کو لیکر اس بگاڑ کی اصلاح کیسے کی جائے گی یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں اس لیے ان کی بنیاد پر جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

— ۶ —

آپ پوچھتے ہیں عفو (زائد از ضرورت دولت) سے کیا مراد ہے سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ کوئی بڑا پیچیدہ و مسئلہ ہے؟ آج بھی انکم ٹیکس عائد کرنے سے پہلے ایک خاص حد تک آمدنی کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے اور اس کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس قدر آمدنی ایک کنبے کی اوسط ضروریات پوری کرنے کے لیے ناگزیر ہے یہ حد ظاہر ہے کہ کسی نص قطعی سے مقرر نہیں کی گئی ہے اس زمانہ کی قیمتوں اور اوسط درجے کی ضروریات کا لحاظ کر کے طے کی جاتی ہے۔ اس پر ہر وقت نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور کوئی دوسری حد انصاف کے ساتھ تجویز کی جا سکتی ہے بشرطیکہ آپ پھر پلٹ کر "انصاف" کا مطلب نہ پوچھ لیں۔

— ۷ —

اس کے بعد آپ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ زائد از ضرورت دولت جو آدمی کے پاس ہے اس کا مصرف کیا ہے؟ یہ ساری دولت ہی کیوں نہ لے لی جائے؟ وہ شخص مزید کیوں دولت کماتا رہے اور پھر اس زائد دولت پر آپ قرآن حکیم کی یہ آیت چسپاں کرتے ہیں کہ جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی بشارت دے دو۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں گا کہ یہ سوالات اٹھاتے وقت آپ نے اسلام کے معاشی اصولوں کو سرے سے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام دولت کمانے اور خرچ کرنے اور کاروبار میں لگانے کے چند طریقوں کو قطعی حرام کر دیتا ہے۔ ان احکام کی پیروی کرتے ہوئے جو شخص خالص حلال طریقوں سے اتنی دولت کما لے جو جائز مصرف میں صرف ہونے کے بعد بھی بچ رہے، اس کے معاملے میں وہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر سکتا ہے ایک یہ کہ وہ اسے اللہ کی خوشنودی

کے لیے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں دل کھول کر خرچ کر دے۔ اس پر اُس کے لیے بڑا اجر و ثواب ہے دوسرے یہ کہ وہ اُسے جمع کر کے رکھے۔ اس پر اس سے لازماً زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل صریح الفاظ میں فرمایا ہے کہ جس جمع شدہ مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ وہ اُس خزانے کی تعریف میں نہیں آتا جس پر عذاب الیم کی خبر دی گئی ہے مزید براں جو دولت اس طرح جمع رہ جائے گی اُسے آخر کار اسلام کا قانون وراثت تقسیم کر دے گا تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اُسے کسی حلال کاروبار میں لگا کر مزید دولت کمائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ دولت گردش میں آئے گی لوگوں کو اس سے روزگار ملے گا اور جس حلال کام میں وہ روپیہ لگائے گا وہ معاشرے کی معاشی ترقی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی زائد از ضرورت دولت کے متعلق میں نے یہ کہا ہے کہ اس پر ملکی ضروریات کے لیے ٹیکس دو قاعدوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لگانے چاہئیں اوّل یہ ہے کہ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہو اُس پر اتنا ہی زیادہ ٹیکس لگایا جائے۔ دوسرا یہ کہ ٹیکس اتنا لگانا چاہیے کہ کمائی کا محرک باقی رہے۔ آپ کو اس دوسرے قاعدے پر اعتراض ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ ساری زائد از ضرورت دولت اس سے لی جائے۔ سوال یہ ہے کہ کس حق کی بناء پر آپ ہر شخص کی ضروریات کی ایک حد مقرر کر کے اس سے زائد وہ ساری دولت لے لیں گے جو اُس نے اپنی حلال محنت سے کمائی ہے؟ اور آپ ایسا کریں گے تو کون اتنا بیوقوف ہوگا کہ پھر آپ کی مقرر کی ہوئی حد سے زیادہ کمانے کے لیے وقت محنت اور ذہانت صرف کرے؟ اور اگر ہر شخص صرف اس حد کے اندر رہ کر کمائے تو آپ ملک کا نظام چلانے کے لیے ٹیکس لوگوں کی کتنی آمدنی پر لگائیں گے؟ اس صورت میں تو آپ کو ملک کا سارا نظام حکومت لپیٹ کر رکھ دینا ہوگا۔ کیونکہ لوگوں کی بقدر ضرورت آمدنی پر خواہ آپ بلاواسطہ ٹیکس لگائیں یا بالواسطہ ہر صورت وہ ظلم ہوگا۔

—— ۸ ——

آپ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ کسب حرام کے تمام دروازے بند کر دینے اور

اور صرف کسب حلال تک سارے معاشی کاروبار کو محدود کر دینے اور زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا باقاعدہ انتظام شروع ہو جانے کے بعد بھی ایک اسلامی نظام میں ایسی حالت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کے پاس زائد از ضرورت ایک کروڑ روپیہ موجود ہو تو اس کے گرد و پیش ہزاروں آدمی بھوک کے مر رہے ہوں۔ باتیں کرتے ہوئے شاید آپ نے اپنے وقت کا اتنا قلیل حصہ بھی جو یہ سوالات لکھنے میں صرف ہوا ہے اس امر پر غور کرنے میں صرف نہیں کیا کہ بھوک سے مرنے والوں کے درمیان ایک کروڑ پتی کی موجودگی حرام خوریوں سے موجود ہوتی ہے یا کسب حلال کی پابندیوں کے ساتھ ایسا ہوتا ممکن ہے؟ اور اگر اسلامی قانون کے مطابق ملک کی تمام جمع شدہ دولت پر۔ تمام تجارتوں اور صنعتوں پر، تمام زرعی پیداوار پر اور تمام مویشیوں کے ریوڑوں پر زکوٰۃ عائد کر کے اسے وصول اور تقسیم کرنے کا انتظام کر دیا جاتے تو کیا کبھی ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک کروڑ پتی کے گرد و پیش ہزاروں آدمی بھوکے مر رہے ہوں؟ ذرا حساب لگا کر دیکھئے تو سہی کہ اس قانون کے مطابق زکوٰۃ کتنی مقدار میں جمع ہوگی اور اس کی تقسیم کے باوجود کتنے آدمی بھوک سے تڑپتے رہ جائیں گے۔ تاہم اگر کوئی غیر معمولی آفت ایسی آ جاتے جس کے مقابلے میں لوگوں کے مصائب کا مداوا کرنے کے لیے زکوٰۃ کافی نہ ہو تو اسلامی حکومت حکماً بھی لوگوں سے زکوٰۃ کے علاوہ روپیہ اور ذخائر حاصل کر سکتی ہے لیکن آپ یقین رکھیے کہ جس معاشرے میں صرف اسلامی قانون معیشت ہی نافذ نہ ہو بلکہ اسلامی تعلیم اور اخلاقی تربیت قانون معیشت ہی نافذ نہ ہو بلکہ اسلامی تعلیم اور اخلاقی تربیت اور معاشرتی اصلاح کا پروگرام بھی نافذ ہو، اور ملک کا نظم و نسق بھی خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں ہو، وہاں جبر کی ضرورت کم ہی پیش آئے گی خدا کے نام پر ایک اپیل اس کے لیے کافی ہوگی کہ لوگ اپنی ضرورت سے زائد مال ہی نہیں اپنا پیٹ کاٹ کر ضرورت سے کم مال کا بھی اچھا خاصا حصہ مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کے لیے خود لا کر ڈال دیں گے۔ یہ بات میں محض ایک مفروضے کی بناء پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یہ قطعی تجربہ ہو چکا ہے کہ اخلاقی لحاظ سے انتہائی متزلزل

کی حالت میں بھی، جب کہ شب و روز مسلمانوں کو خدا سے دور اور اسلام سے منحرف کرنے کے لیے مدتوں سے سر توڑ کوششیں کی جاتی ہیں، مسلم معاشرے کے اندر اسلامی تعلیمات کا کتنا اثر باقی ہے اور وہ کیا کرامتیں دکھا سکتا ہے۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں یہ کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ جو لوگ فی الواقع اشتراکی نظام کے قائل ہیں اُن کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہیرا پھیری سے اسلامی نظام کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات پر ڈھالنے کی بجائے صاف صاف یہ کہیں کہ ہم اسلامی نظام نہیں چاہتے بلکہ ہمارے نزدیک اشتراکی نظام ہی برحق ہے آخر تخلقوا باخلاق کی باتیں کرنے کا کیا حاصل ہے جب کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول ہی کو جی نہ چاہتا ہو۔ [1] ہفت روزہ آئین: ۲۴ مئی ۱۹۶۹ء

---

[1] روزنامہ "مشرق" کے کالم نگار ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنے کالم "افکار و حوادث" میں ۱۱ مئی ۱۹۶۹ء کے پرچے "مشرق" میں شائع ہوا تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے چند سوالات پوچھے تھے۔ مولانا نے ڈاکٹر صاحب کے نام ایک خط میں ان سوالات کا جواب دیا تھا۔

- سیرت کا پیغام
- رحمۃ للعالمینؐ
- انک لعلیٰ خلق عظیم

اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز اور کہاں نظر آئے گا!

انسانی تاریخ کے منظر میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند و بالا شخصیت اتنی ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر Heroes میں شمار کرتی ہے جب آپ کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں۔ تو آپ کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عملی قوت نہیں رکھتا کوئی عمل کا پتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہو گئے ہیں۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض تاریخ میں یک رخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا آنحضور ہی کی شخصیت ایک ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدبر بھی ہے فوجی لیڈر بھی ہے، واضع قانون بھی ہے، معلم اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب

اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے، اپنے نظریات کے مطابق ایک مستقل تہذیب Civilization وجود میں لاکر دکھا دیتا ہے، اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن Equilibrium قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا کوئی دوسرا شخص اس جامعیت کا پیش کیا جا سکتا ہے؟

دُنیا کی بڑی سے بڑی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو، مگر اس نبی کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عرب کا ماحول اس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا، اور ممالک کو فتح کر کے معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا —— یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر جو اس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا۔ ظلم، بے رحمی، خون ریزی اور مکر و دغا غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوشحال بناتا اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پسماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اس کے سوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا ثابت نہیں کیا جا سکتا ہیگل کے فلسفہ تاریخ اور مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے نقطہ نظر سے حد سے حد یہی حکم لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس ماحول میں ایک قوم اور ایک سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے یا ظاہر ہو سکتا ہے۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعہ کی توجیہ کیوں کر کرے گا کہ اسوقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا، جو بہترین اخلاق سکھانے والا، انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنیوالا اور جاہلیت کے اوہام اور تعصبات کو مٹانے والا تھا جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت پر پھیل گئی۔ جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالم انسانیت کے لیے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بنیاد ڈالی۔ جس نے معاشی معاملات اور سیاستِ مدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا اور روحانیت و مادیت کی ایسی معتدل و متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہکار

ہے جیسا اس وقت تھا کیا ایسے شخص کو عرب ماحول کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔

یہی نہیں کہ آنحضورؐ اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتے۔ بلکہ جب ہم آپ کے کارناموں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہیں۔ آپ کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاروں Millennium کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے آپ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں اسکی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتے ہیں جو ہر حال میں یکساں مناسبت کیساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کو تاریخ نے پرانا کر دیا ہے۔ جنکی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اچھے راہنما تھے سب سے الگ اور سب سے ممتاز آنحضورؐ انسانیت کیلئے راہنما ہیں جو تاریخ کیساتھ حرکت کرتے ہیں اور ہر دور میں ایسے جدید نظر آتے ہیں جیسے اس سے پہلے دور کیلئے تھے ——— ہم جن لوگوں کو فیاضی کیساتھ تاریخ بنانیوالے Makers of History کا لقب دیتے ہیں وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے ہیں Creatures of History ہیں۔ دراصل تاریخ بنانیوالا پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک ہی شخص ہے۔ دُنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کئے ہیں انکے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈال جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایسے مواقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے اور وہ اسباب خود ہی اس انقلاب کا رُخ اور راستہ بھی متعین کر رہے تھے جس کے برپا ہونیکے وہ متقضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوت سے فعل میں لانے کیلئے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے متعین ہوں۔ مگر تاریخ بنانیوالوں یا انقلاب برپا کرنیوالوں کی پوری جماعت میں ہمارے حضورؐ کیلئے ایسے ہیں کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے وہاں آپ نے خود اسباب کو پیدا کیا۔ جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا وہاں آپنے خود مواد تیار کیا جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی وہاں آپ نے خود اپنے مطلب کے آدمی تیار کئے۔ اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزارہا انسانوں کے قالب میں اتار دیا اور انکو ویسا بنایا جیسا آپ بنانا چاہتے تھے آپکی طاقت اور قوت ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا خود ہی اسکی صورت اور نوعیت متعین کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستے پر چلایا جس پر آپ اُسے چلانا چاہتے تھے۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز اور کہاں نظر آئے گا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

سیرت کا پیغام[1]

مجھے دعوت دی گئی ہے کہ میں آپ کے اس اجتماع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پیغام پر کچھ عرض کروں۔ اس مضمون پر اگر منطقی ترتیب کے ساتھ کلام کیا جائے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایک نبی کی سیرت ہی کا پیغام کیوں؟ کسی اور کا پیغام کیوں نہیں؟ اور انبیاء میں سے بھی صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت کا پیغام کیوں؟ دوسرے انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب کی سیرتوں کا پیغام کیوں نہیں؟ اس سوال پر آغاز ہی میں بحث کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا ذہن اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ درحقیقت ہم قدیم اور جدید زمانوں کے کسی راہنما کی سیرت میں نہیں بلکہ ایک نبی کی سیرت ہی میں ہدایت پا سکتے ہیں، اور کسی دوسرے نبی یا پیشوائے مذہب کی زندگی میں نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ہم کو وہ صحیح اور مکمل ہدایت مل سکتی ہے جس کے ہم فی الواقع محتاج ہیں۔

خدائی ہدایت کی ضرورت

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہے اور اس میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اُس کے سوا کائنات کی حقیقتوں کا اور خود انسانی فطرت اور اس کی حقیقت کا علم اور کس کو ہو سکتا ہے؟ خالق ہی تو اپنی مخلوق کو جان سکتا ہے۔ مخلوق اگر کچھ جانے گا تو خالق کے بتانے ہی سے جانے گا۔ اُس کے پاس خود اپنا کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ حقیقت کو جان سکے۔

---

[1] ایک تقریر جو ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو پنجاب یونیورسٹی یونین کی دعوت پر یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں کی گئی تھی

اس معاملے میں دو قسم کی چیزوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے تاکہ خلطِ مبحث نہ ہونے پائے۔

ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جنہیں آپ اپنے حواس سے محسوس کرسکتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو فکر واستدلال اور مشاہدات وتجربات کی مدد سے مرتب کرکے نئے نئے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی چیزوں کے بارے میں عالمِ بالا سے کوئی تعلیم آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کی اپنی تلاش وجستجو، غور وفکر اور تحقیق اکتشاف کا دائرہ ہے۔ اسے آپ پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے گردوپیش کی دنیا میں پائی جانے والی اشیاء کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، ان میں کام کرنے والی قوتوں کو معلوم کریں، ان کے اندر کارفرما قوانین کو سمجھیں، اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں بھی آپ کے خالق نے آپ کا ساتھ چھوڑ نہیں دیا ہے۔ وہ تاریخ کے دوران میں بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک تدریج کے ساتھ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا سے آپ کا تعارف کراتا رہا ہے، واقفیت کے نئے نئے دروازے آپ پر کھولتا رہا ہے اور وقتاً فوقتاً ایک الہامی طریقے سے کسی نہ کسی انسان کو ایسی بات سجھاتا رہا ہے جس سے وہ کوئی نئی چیز ایجاد، یا کوئی نیا قانون دریافت کرسکا۔ لیکن بہرحال یہ ہے انسانی علم ہی کا دائرہ جس کے لئے کسی نبی اور کسی کتاب کی حاجت نہیں ہے، اور اس دائرے میں جو معلومات مطلوب ہیں انہیں حاصل کرنے کے ذرائع انسان کو دے دیئے گئے ہیں۔

دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں جو ہمارے حواس کی پہنچ سے بالاتر ہیں جن کا ادراک ہم کسی طرح نہیں کرسکتے۔ جنہیں نہ ہم تول سکتے ہیں، نہ ناپ سکتے ہیں، نہ اپنے علم کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ استعمال کرکے اُن کو معلوم کرسکتے ہیں۔ فلسفی اور سائنسدان ان کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو وہ محض قیاس پر مبنی ہوتی ہے جسے علم نہیں کہا جاسکتا یہ آخری حقیقتیں (ultimate realities) ہیں جن کے بارے میں استدلالی نظریات کو خود وہ لوگ بھی یقینی قرار نہیں دے سکتے جنہوں نے اُن نظریات کو پیش کیا ہے اور اگر وہ اپنے علم کے حدود کو جانتے ہوں تو ان پر نہ خود ایمان لا سکتے ہیں

نہ کسی کو ایمان لانے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

انبیاءؑ کی پیروی کی ضرورت۔

اس دائرے میں علم اگر پہنچتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے پہنچتا ہے کیونکہ وہی حقائق کا جاننے والا ہے۔ اور جس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ علم دیتا ہے وہ وحی ہے جو صرف انبیاءؑ پر نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آج تک کبھی یہ نہیں کیا کہ ایک کتاب چھاپ کر ہر انسان کے ہاتھ میں تھما دی ہو اور اس سے کہا ہو کہ اسے پڑھ کر خود معلوم کر لے کہ تیری اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کے لحاظ سے دنیا میں تیرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اس علم کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے اس نے ہمیشہ انبیاء ہی کو ذریعہ بنایا ہے تاکہ وہ صرف اس علم کی تعلیم ہی دے کر نہ رہ جائیں بلکہ اسے سمجھائیں بھی۔ اس کے مطابق عمل بھی کر کے دکھائیں۔ اس کے خلاف چلنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کریں اور اسے قبول کرنے والوں کو ایک ایسے معاشرے کی شکل میں منظم بھی کر دیں جس کی زندگی کا ہر شعبہ اس علم کا عملی مظہر ہو۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم رہنمائی کے لئے صرف ایک نبی کی سیرت ہی کے محتاج ہیں۔ کوئی غیر نبی اگر نبی کا پیرو نہ ہو تو خواہ وہ کیسا ہی متبحر عالم اور دانا و فرزانہ ہو ہمارا رہنما نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے پاس حقیقت کا علم نہیں ہے اور جسے حقیقت کا علم نہ ہو وہ ہمیں کوئی صحیح و برحق نظامِ حیات نہیں دے سکتا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرے انبیاء سے ہدایت نہ ملنے کی وجہ:

اب اس سوال کو لیجئے کہ جن بزرگوں کو ہم انبیاء کی حیثیت سے جانتے ہیں اور جن پیشوایانِ مذاہب کے بارے میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہوں، ان میں سے ہم صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت سے کیوں پیغام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا یہ کسی قسم کے تعصب کی وجہ سے ہے یا اس کی کوئی معقول وجہ ہے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ جن انبیاءؑ کا ذکر قرآن

میں کیا گیا ہے ان کو اگرچہ ہم یقینی طور پر نبی مانتے اور جانتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تعلیم اور سیرت بھی ہم تک کسی قابل اعتماد اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچی ہے کہ ہم اُس کی پیروی کر سکیں۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسےٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بلاشبہ نبی تھے، اور ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ان پر نازل ہونے والی کوئی کتاب آج محفوظ شکل میں موجود نہیں ہے کہ اس سے ہم ہدایت حاصل کر سکیں اور ان میں سے کسی کی زندگی کے حالات بھی ایسے محفوظ اور معتبر طریقے سے ہم تک نہیں پہنچے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کو اپنا رہنما بنا سکیں۔ اگر ان سارے انبیاء کی تعلیمات اور سیرت پر کوئی شخص کچھ لکھنا چاہے تو چند صفحات سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور وہ بھی صرف قرآن کی مدد سے۔ کیونکہ قرآن مجید کے سوا اُنکے بارے میں کوئی مُستند مواد موجود نہیں ہے۔

دینِ یہود کی کتابوں اور انبیاءؑ کا حال :

حضرت موسےٰ علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاءؑ کے حالات اور ان کی تعلیمات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بائیبل کے عہدِ عتیق (Old Testament) میں ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے ذرا بائبل کا جائزہ لے کر دیکھئے۔ اصل تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، چھٹی صدی قبل مسیح میں بیت المقدس کی تباہی کے وقت ضائع ہو چکی تھی اور اسی کے ساتھ دُوسرے اُن انبیاء کے صحیفے بھی ضائع ہو گئے تھے جو اُس زمانے سے پہلے ہو گزرے تھے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں جب بنی اسرائیل بابل کی اسیری سے رہا ہو کر فلسطین پہنچے تو حضرت عُزیر (Ezra) نے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت اور بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب کی اور اسی میں تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دیں جو اُنہیں اور اُن کے مددگاروں کو دستیاب ہو سکیں اس کے بعد چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر دوسری صدی قبل مسیح تک مختلف لوگوں نے (جو نہ معلوم کون تھے) اُن انبیاء کے صحیفے (نہ معلوم کن ذرائع سے) تصنیف کر لئے جو اُن سے کئی صدی قبل گزر چکے تھے۔ مثلاً ۳۰۰ قبل مسیح میں حضرت یونسؑ کے نام سے ایک کتاب

کسی شخص نے لکھ کر بائبل میں درج کر دی، حالانکہ وہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے نبی تھے۔ زبور (Psalms) حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے پانچ سو برس بعد لکھی گئی اور اُس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے علاوہ تقریباً ایک سو دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی شامل کر دی گئیں جو معلوم نہیں کن ذرائع سے زبور مرتب کرنے والوں کو پہنچی تھیں حضرت سلیمانؑ کی وفات ۹۳۳ قبل مسیح میں ہوئی اور امثالِ سلیمان (Proverbs) ۲۵۰ قبل مسیح میں لکھی گئی اور اس میں دوسرے بہت سے حکماء کے اقوال بھی شامل کر دیئے گئے۔

غرض بائبل کی کسی کتاب کی سند بھی اُن انبیاء تک نہیں پہنچتی جن کی طرف وہ منسوب ہے۔ اس پر مزید یہ کہ عبرانی بائبل کی یہ کتابیں بھی ۷۰ء میں بیت المقدس کی دوسری تباہی کے وقت ضائع ہو گئیں اور ان کا صرف یونانی ترجمہ باقی رہ گیا جو ۲۵۸ قبل مسیح سے پہلی صدی قبلِ مسیح تک کیا گیا تھا۔ عبرانی بائبل کو دوسری صدی عیسوی میں یہودی علماء نے اُن مسودات کی مدد سے مرتب کیا جو بچے رہ گئے تھے۔ اُس کا قدیم ترین نسخہ جو اب پایا جاتا ہے ۹۱۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی عبرانی نسخہ اب موجود نہیں ہے۔ بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے قریب غارِ قمران میں جو عبرانی خریطے (Scrolls) ملے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بائبل کے صرف چند منتشر اجزاء ہی پائے جاتے ہیں۔ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا جو مجموعہ سامریوں (Samaritans) کے ہاں رائج ہے۔ اس کا قدیم ترین نسخہ گیارھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ یونانی ترجمہ جو تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں کیا گیا تھا وہ بےشمار غلطیوں سے لبریز تھا اور اُس ترجمے سے لاطینی زبان کا ترجمہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں ہوا۔ حضرت موسیٰ اور بعد کے انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل کے حالات اور تعلیمات کے بارے میں اس مواد کو آخر کس معیار کے لحاظ سے مستند (AUTHENTIC) کہا جا سکتا ہے؟

اس کے علاوہ یہودیوں میں کچھ سینہ بسینہ روایات بھی پائی جاتی تھیں، جنہیں زبانی قانون (ORAL LAW) کہا جاتا تھا۔ یہ تیرہ چودہ سو برس تک غیر مکتوب رہیں۔ دوسری

صدی عیسوی کے آخر اور تیسری صدی کے آغاز میں ربّی یہودا ابن شمعون نے ان کو مشناہ (Mishnah) کے نام سے تحریری شکل دی۔ فلسطینی علمائے یہود نے اس کی شرح میں حلقہ (Halakah) کے نام سے اور بابلی علماء نے (Haggadah) کے نام سے تیسری اور پانچویں صدی میں لکھیں اور انہی تین کتابوں کا مجموعہ تلمود کہلاتا ہے۔ ان کی کسی روایت کی کوئی سند نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ کن لوگوں سے کن لوگوں تک پہنچیں۔

حضرت عیسٰیؑ اور دین نصارٰی کی کتابوں کا حال :

کچھ ایسا ہی حال حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی سیرت اور تعلیمات کا ہے۔ اصل انجیل جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ اُن پر نازل ہوئی تھی اُسے اُنہوں نے زبانی ہی لوگوں کو سُنایا اور اُن کے شاگردوں نے بھی زبانی ہی اِسے دوسروں تک اس طرح پہنچایا کہ آنجنابؑ کے حالات اور انجیل کی آیات سب کو خلط ملط کر دیا۔ اُن میں سے کوئی چیز بھی مسیحؑ کے زمانے میں یا اُن کے بعد لکھی نہیں گئی۔ لکھنے کا کام اُن عیسائیوں نے کیا جن کی زبان یونانی تھی، حالانکہ حضرت عیسٰیؑ کی زبان سریانی (Syriac) یا آرامی (Aramaic) تھی اور ان کے شاگرد بھی یہی زبان بولتے تھے۔ یونانی زبان بولنے والے بہت سے مصنفین نے ان روایات کو آرامی زبان میں سُنا اور یونانی میں لکھا۔ ان مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے کوئی بھی ۷۰ء سے پہلے کی نہیں ہے اور ان میں سے کسی نے بھی کسی واقعہ یا حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے کسی قول کی سند نہیں بیان کی جس سے معلوم ہوتا کہ انہوں نے کون سی بات کس سے سُنی تھی۔ پھر اُن کی لکھی ہوئی کتابیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ بائبل کے نئے عہد نامے (New Testament) کے ہزاروں یونانی نسخے جمع کئے گئے مگر ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر گیارھویں سے چودھویں صدی تک کے ہیں۔ مصر میں پاپیرس پر لکھے ہوئے جو منتشر اجزاء ملے ہیں ان میں سے بھی کوئی تیسری صدی سے قدیم تر نہیں ہے۔ یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کس نے، کب اور کہاں کیا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ چوتھی صدی میں پوپ کے حکم سے اس

پر نظرثانی کا کام کیا گیا اور پھر سولہویں صدی میں اسے چھوڑ کر یونانی سے لاطینی میں ایک نیا ترجمہ کر دیا گیا۔ یونانی سے سریانی زبان میں چاروں انجیلوں کا ترجمہ غالباً ۲۰۰ء میں ہوا تھا۔ مگر اس کا بھی قدیم ترین نسخہ جو اب پایا جاتا ہے چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے اور پانچویں صدی کا جو قلمی نسخہ ملا ہے وہ اُس سے کافی مختلف ہے۔ سریانی سے جو عربی ترجمے کئے گئے ان میں سے بھی کوئی ترجمہ آٹھویں صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ستر کے قریب انجیلیں لکھی گئی تھیں مگر ان میں سے صرف چار کو پیشوایانِ دینِ مسیح نے قبول کیا اور باقی سب کو رد کر دیا۔ کچھ نہیں معلوم کہ قبول کیا تو کیوں اور رد کیا تو کیوں؟ اِس مواد کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو کسی درجے میں بھی مُستند مانا جا سکتا ہے؟

زَرَدُشتی مذہب کا حال :

دوسرے پیشوایانِ مذاہب کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ۔مثلاً زَرَدُشت (Zoroaster) کو لیجئے جس کا صحیح زمانۂ پیدائش بھی اب ٹھیک معلوم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سکندر کی فتحِ ایران سے ڈھائی سو سال پہلے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی مسیح سے ساڑھے پانچ سو سال قبل۔ اس کی کتاب "اَوَستا" اپنی اصل زبان میں اب ناپَید ہے اور وہ زبان بھی مُردہ ہو چکی ہے جس میں وہ لکھی یا زبانی بیان کی گئی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ ۹ جلدوں میں تشریح کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مگر اس کی دو پہلی جلدیں ضائع ہو گئیں اور اب اس کا جو قدیم ترین نسخہ پایا جاتا ہے وہ تیرھویں صدی کے وسط کا لکھا ہوا ہے۔ یہ تو ہے زَرَدُشت کی پیش کردہ کتاب کا حال۔ رہا خود اس کی سیرت کا معاملہ تو اس کے متعلق ہماری معلومات اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ ۴۰ سال کی عمر میں اس نے تبلیغ شروع کی۔ دو سال بعد بادشاہ "گُشتاسپ" نے اس کی پیروی اختیار کر لی اور اس کا مذہب سرکاری مذہب بن گیا۔ ۷۷ سال وہ زندہ رہا اور اس کی موت پر جتنا زمانہ گزرتا گیا، اس کی زندگی عجیب وغریب افسانوں کا مجموعہ بنتی چلی گئی جن میں سے کسی کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

بُدھ مذہب کا حال :

دنیا کی مشہور ترین مذہبی شخصیتوں میں سے ایک بودھ تھا۔ زردشت کی طرح اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہو مگر اس نے سرے سے کوئی کتاب پیش ہی نہیں کی۔ نہ اُس کے پیروؤں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ کوئی کتاب لایا تھا۔ اس کی وفات کے سو سال بعد اس کے اقوال اور حالات کو جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور صدیوں تک چلتا رہا۔ مگر اس طرح کی جتنی کتابیں بدھ مذہب کی اصل کتابیں سمجھی جاتی ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی کوئی سند درج نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ کس ذریعہ سے ان احوال و اقوال اور تعلیمات کے درج کرنے والوں کو بدھ کے حالات اور اس کے اقوال پہنچے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم دوسرے انبیاء اور مذہبی پیشواؤں کی طرف رجوع کریں بھی تو اُن کے بارے میں کوئی مُستند ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم ان کی تعلیمات اور ان کی زندگیوں سے اطمینان اور یقین کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی ایسے نبی کی طرف رجوع کریں جس نے کوئی قابلِ اعتماد اور تحریف و آمیزش سے پاک کتاب چھوڑی ہو اور جس کے مفصل حالات و اقوال اور اعمال معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچے ہوں تاکہ ہم ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ ایسی شخصیت پوری دنیا کی تاریخ میں صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے۔

قرآن کا پایۂ استناد :

انہوں نے ایک کتاب (قرآن مجید) اس صریح دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اس کتاب کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی قول بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے اقوال کو اس سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ بائبل کی طرح آپ کی زندگی کے حالات اور عربوں کی تاریخ اور زمانۂ نزول قرآن میں پیش آنے والے واقعات کو اُس میں کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط نہیں کر دیا

گیا ہے۔ یہ خالص کلام اللہ (Word of God) ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔ اس کے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جوں کا توں یہ ہمارے زمانے تک منتقل ہوا ہے۔

یہ کتاب جس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونی شروع ہوئی تھی، اسی وقت سے آپؐ نے اسے لکھوانا شروع کر دیا تھا۔ جب کوئی وحی آتی اسی وقت آپؐ اپنے کسی کاتب کو بلاتے اور اسے لکھوا دیتے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ آپؐ کو سنایا جاتا تھا اور جب آپؐ اطمینان کر لیتے تھے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے تب آپ اسے ایک محفوظ جگہ رکھ دیتے تھے۔ ہر نازل شدہ وحی کے متعلق آپؐ کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سورۃ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپؐ قرآن مجید کو ترتیب بھی دیتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

پھر نماز کے متعلق آغاز اسلام ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اس میں قرآن مجید لازماً پڑھا جائے۔ اس لئے صحابہ کرام اس کے نزول کے ساتھ ساتھ اس کو یاد کرتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے پورا یاد کر لیا اور ان سے بہت زیادہ بڑی تعداد ایسے اصحاب کی تھی جنھوں نے کم و بیش اس کے مختلف حصے اپنے حافظے میں محفوظ کر لئے تھے۔ ان کے علاوہ وہ متعدد صحابہ جو پڑھے لکھے تھے قرآن مجید کے مختلف حصوں کو بطور خود لکھ بھی رہے تھے۔ اس طرح قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں چار طریقوں سے محفوظ ہو چکا تھا۔

۱۔ آپؐ نے خود کاتبینِ وحی سے اس کو اوّل تا آخر لکھوا لیا۔

۲۔ بہت سے صحابہؓ نے پورا کا پورا قرآن لفظ بلفظ یاد کر لیا۔

۳۔ صحابۂ کرام میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے قرآن مجید کا کوئی نہ کوئی حصہ، تھوڑا یا بہت یاد نہ کر لیا ہو۔ کیونکہ اسے نماز میں پڑھنا ضروری تھا اور صحابہ کی تعداد کا اندازہ

اس سے کر لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخری حج میں ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ شریک تھے

۴۔ پڑھے لکھے صحابہ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اپنے طور پر قرآن مجید کو لکھ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کر اس کی صحت کا اطمینان بھی کر لیا تھا۔

پس یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے یہ لفظ بلفظ وہی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد آپ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام حافظوں اور تحریری نوشتوں کو جمع کر کے اس کا ایک مکمل نسخہ کتابی صورت میں لکھوا لیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسی کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات کو بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نقلیں آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ ایک استنبول میں اور دوسری تاشقند میں۔ جس کا جی چاہے قرآن مجید کا کوئی مطبوعہ نسخہ لے جا کر اُن سے ملالے۔ کوئی فرق وہ نہ پائے گا۔ اور فرق ہو کیسے سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک ہر پشت (Generation) میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدلے تو یہ حفاظ اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔ پچھلی صدی کے آخر میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ہر زمانے کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ ۴۲ ہزار نسخے جمع کئے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ ان نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے حالانکہ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی تک کے نسخے تھے اور دنیا کے ہر حصے سے فراہم کئے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی پر بمباری کی گئی تو وہ انسٹی ٹیوٹ تباہ ہو گیا لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج دنیا سے ناپید نہیں ہوئے۔

ایک اور بات قرآن مجید کے متعلق یہ بھی نگاہ میں رکھیے کہ جس زبان میں یہ نازل ہوا تھا وہ ایک زندہ زبان ہے عراق سے مراکو تک تقریباً ۱۲ کروڑ انسان آج بھی اسے

مادری زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں اور غیر عرب دنیا میں بھی لاکھوں آدمی اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ عربی زبان کی گرامر، اُس کی لغت اسکے الفاظ کے تلفظ اور اس کے محاورے ۱۴سو برس سے جوں کے توں رائج ہیں۔ آج ہر عربی دان اسے پڑھ کر اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح ۱۴سو برس پہلے کے عرب سمجھتے تھے۔

یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت جو ان کے سوا کسی نبی اور کسی پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالٰے کی طرف سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے جو کتاب اُن پر نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصل زبان میں اپنے اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیّر و تبدّل موجود ہے۔

سیرت و سُنّتِ رسولؐ کا پایۂ استناد:

اب دوسری خصوصیت کو دیکھیے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب میں یکتا ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپ کی سیرت بھی محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آخری سانس تک جتنے لوگوں نے آپ کو دیکھا، آپ کے حالاتِ زندگی دیکھے، آپ کے اقوال سُنے، آپ کی تقریریں سنیں، آپ کو کسی چیز کا حکم دیتے سُنا یا کسی چیز سے منع کرتے سنا، ان کی ایک عظیم تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسل تک اُسے پہنچایا۔

بعض محققین کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جنہوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سُنے ہوئے واقعات بعد کی نسل تک منتقل کئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیئے یا بھیجے تھے جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہ میں سے کم از کم چھ اصحاب ایسے تھے جنہوں نے آپ کی احادیث لکھ کر آپ کو سُنادی تھیں تاکہ اُن میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یہ تحریریں بھی بعد آنے والوں کو ملیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد کم از کم پچاس صحابہ نے آپ کے حالات، واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کئے اور یہ ذخیرۂ علم بھی ان لوگوں تک پہنچا جنہوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔ پھر جن صحابہؓ نے سیرت

کی معلومات زبانی روایت کیں ان کی تعداد جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں بعض محققین کے نزدیک ایک لاکھ تک پہنچتی ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ آخری حج جو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمایا جسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، اس میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی موجود تھے۔ اتنے آدمیوں نے آپ کو حج کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ سے حج کا طریقہ سیکھا۔ وہ تقریریں سنیں جو حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے کیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنے لوگ جب ایسے موقع پر آپ کے ساتھ حج میں شریک ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہنچے ہوں گے تو وہاں ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہموطنوں نے ان سے اس سفر کے حالات نہ پوچھے ہوں اور حج کے احکام دریافت نہ کئے ہوں اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت کے اس دنیا سے گزر جانے کے بعد لوگ کس اشتیاق کے ساتھ آپ کے احوال و اقوال اور احکام و ہدایات ان لوگوں سے پوچھتے ہوں گے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا اور آپ کے ارشادات سنے تھے

صحابہ کرام سے جو روایات بعد کی نسلوں تک پہنچی تھیں ان کے بارے میں ابتداء ہی سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہتا اس کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ بات کس سے سنی ہے اور راوی سلسلہ بہ سلسلہ کون کس سے یہ بات سنتا اور آگے بیان کرتا رہا ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت کی پوری کڑیاں دیکھی جاتی تھیں تاکہ یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صحیح طور پر حضور ؐ سے منقول ہوئی ہے۔ اگر روایت کی پوری کڑیاں نہ ملتی تھیں تو اس کی صحت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ اگر کڑیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتیں لیکن بیچ میں کوئی راوی ناقابل اعتماد ہوتا تو ایسی روایت بھی قبول نہ کی جاتی تھی۔ آپ ذرا غور کریں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ دنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات اس طرح سے مرتب نہیں ہوئے ہیں، یہ خصوصیت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تسلیم نہیں کی گئی اور سند میں بھی صرف یہی نہیں دیکھا گیا کہ ایک حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس سلسلے کے تمام راوی بھروسے

کے قابل ہیں یا نہیں۔ اس غرض کے لئے راویوں کے حالات کی بھی جانچ پڑتال کی گئی اور اس پر مفصل کتابیں لکھ دی گئیں جن سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون قابل اعتماد تھا اور کون نہ تھا کس کی سیرت و کردار کا کیا حال تھا کس کا حافظہ ٹھیک تھا اور کس کا ٹھیک نہ تھا۔ کون اس شخص سے ملا تھا جس سے اس نے روایت نقل کی ہے اور کون اُس سے ملاقات کے بغیر ہی اُس کا نام لے کر روایت بیان کر رہا ہے۔ اس طرح اتنے بڑے پیمانے پر راویوں کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں کہ آج بھی ہم ایک ایک حدیث کے متعلق یہ جانچ سکتے ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے آئی ہے یا ناقابلِ اعتماد ذرائع سے۔ کیا انسانی تاریخ میں کوئی دوسرا شخص ایسا پایا جاتا ہے جس کے حالات زندگی اس قدر مستند طریقے سے منقول ہوئے ہوں۔؟ اور کیا اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک شخص کے حالات کی تحقیق کے لئے اُن ہزارہا آدمیوں کے حالات پر کتابیں لکھ دی گئی ہوں جنہوں نے اس ایک شخصیت کے متعلق کوئی روایت بیان کی ہو؟ موجودہ دَور کے عیسائی اور یہودی علماء احادیث کی صحت مشتبہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کر رہے ہیں اُس کی اصل وجہ یہ حسد ہے کہ ان کے دین کی کتابوں اور ان کے پیشوایانِ دین کے حالات کی سرے سے کوئی سند ہی نہیں ہے۔ اسی جلن کے باعث انہوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کے معاملہ میں علمی دیانت (Intellectual Honesty) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو معلوم و معروف ہے:

سیرتِ رسولِ اکرمؐ کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں ہے کہ وہ ہمیں نہایت مستند ذرائع سے پہنچی ہے بلکہ اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ اُس میں آپ کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملتی ہیں جو تاریخ کے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملتیں۔ آپ کا خاندان کیسا تھا۔ آپ کی نبوت سے پہلے کی زندگی کیسی تھی۔ آپ کو نبوت کس طرح ملی۔ آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی تھی۔ آپ نے اسلام کی دعوت کس طریقے سے پھیلائی۔ مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کس طرح کیا۔ اپنے ساتھیوں کی تربیت کیسے کی۔ اپنے گھر میں آپ کس طرح رہتے تھے۔ اپنی بیویوں اور بچوں سے آپ کا برتاؤ کیا تھا۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں سے

آپ کا معاملہ کیسا تھا۔ کس اخلاق کی تعلیم آپ دیتے تھے اور آپ کا اپنا اخلاق کیسا تھا۔ کس چیز کا آپ نے حکم دیا۔ کس کام سے آپ نے منع کیا۔ کس کام کو آپ نے ہوتے دیکھا اور منع نہ کیا اور کس چیز کو آپ نے ہوتے دیکھا اور منع فرمایا۔ یہ سب کچھ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آپ ایک فوجی جنرل بھی تھے اور آپ کی قیادت میں جتنی لڑائیاں ہوئیں ان سب کا مفصل حال ہمیں ملتا ہے۔ آپ ایک حاکم بھی تھے اور آپ کی حکومت کے تمام حالات ہمیں ملتے ہیں۔ آپ ایک جج بھی تھے اور آپ کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات کی پوری پوری روداد یں ہمیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس مقدمے میں آپ نے کیا فیصلہ فرمایا۔ آپ بازاروں میں بھی نکلتے تھے اور دیکھتے تھے کہ لوگ خرید و فروخت کے معاملات کس طرح کرتے ہیں۔ جس کام کو غلط ہوتے ہوئے دیکھتے اس سے منع فرماتے تھے اور جو کام صحیح ہوتے دیکھتے اس کی توثیق فرماتے تھے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپ نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بے جا تعصب کے بغیر پورے علم و یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیاء اور پیشوایان مذاہب میں سے صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہستی ہیں جن کی طرف نوع انسانی ہدایت و رہنمائی کے لئے رجوع کر سکتی ہے، کیونکہ آپ کی پیش کی ہوئی کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہے اور آپ کی سیرت اُن تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ جو ہدایت کے لئے درکار ہیں نہایت مستند و معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آپ کی سیرت پاک ہمیں کیا پیغام اور کیا ہدایات دیتی ہے۔

حضورؐ کا پیغام تمام انسانوں کے لئے ہے:

اوّلین چیز جو ہمیں آپ کی دعوت میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ رنگ و نسل اور زبان و وطن کے سارے امتیازات کو نظر انداز کر کے انسان کو بحیثیت انسان مخاطب کرتے ہیں اور چند اصول پیش کرتے ہیں جو تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے ہیں۔ ان اصولوں کو جو بھی مان لے وہ مسلمان ہے اور ایک عالمگیر امت مسلمہ کا فرد ہے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، عربی ہو یا عجمی۔ جہاں بھی کوئی انسان ہے، جس ملک یا قوم یا نسل میں بھی وہ پیدا ہوا

ہے، جو زبان بھی وہ بولتا ہے اور جو رنگ بھی اُس کی کھال کا ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مخاطب ہے اور اگر وہ آپ کے پیش کردہ اصولوں کو مان لیتا ہے تو بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اُمتِ مسلمہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ کوئی چھوت چھات، کوئی اونچ نیچ، کوئی نسلی یا طبقاتی امتیاز، کوئی لسانی یا قومی یا جغرافی افتراق، جو عقیدے کی وحدت قائم ہو جانے کے بعد ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرتا ہو امتِ مسلمہ میں نہیں ہے۔

رنگ و نسل کے تعصبات کا بہترین علاج :

آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت انسانیت کو میسر آئی ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر جس چیز نے تباہ کیا وہ یہی امتیازات ہیں جو انسان اور انسان کے درمیان قائم کیے گئے ہیں۔ کہیں اُس کو نجس قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا کہ یہ اچھوت ہے۔ اِس کے وہ حقوق نہیں ہیں جو برہمن کے حقوق ہیں۔ کہیں اُس کو فنا کر دینے کے قابل قرار دیا گیا کیونکہ وہ آسٹریلیا اور امریکہ میں اُس وقت پیدا ہو گیا تھا جب باہر سے آنے والوں کو اُس سے زمین خالی کرانے کی ضرورت تھی۔ کہیں اُس کو پکڑ کر غلام بنایا گیا اور اس سے جانوروں کی طرح خدمت لی گئی کیونکہ وہ افریقہ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اُس کا رنگ کالا تھا۔ غرض نوعِ انسانی کے لئے قوم، وطن، نسل، رنگ اور زبان کے یہ امتیازات قدیم ترین زمانے سے لے کر اِس زمانے تک بہت بڑی مصیبت کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ اسی بنیاد پر لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس بنیاد پر ایک ملک دوسرے ملک پر چڑھ دوڑا ہے۔ ایک قوم نے دوسری قوم کو لوٹا ہے اور پوری پوری نسلیں تباہ و برباد کر دی گئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کا ایسا علاج فرمایا کہ دشمنانِ اسلام بھی مان گئے ہیں کہ رنگ، نسل اور وطن کے امتیازات کو جس کامیابی سے اسلام نے حل کیا ہے ایسی کامیابی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

امریکہ کے افریقی النسل باشندوں کا مشہور لیڈر میلکم اکس، جو ایک زمانے میں گوری نسل کے خلاف کالی نسل کے شدید ترین تعصب کا علمبردار تھا، اسلام قبول کر کے جب حج کیلئے گیا اور اس نے دیکھا کہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ہر طرف سے ہر نسل کے لوگ، ہر رنگ کے لوگ، ہر وطن کے لوگ، ہر زبان بولنے والے لوگ چلے آ رہے ہیں، سب نے ایک جیسا احرام

کا لباس پہن رکھا ہے، سب ایک ہی زبان میں "لبیک لبیک" کے نعرے لگا رہے ہیں، ایک ساتھ طواف کر رہے ہیں اور ایک ہی جماعت میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، تو وہ پکار اٹھا کہ رنگ و نسل کے مسئلے کا صحیح حل یہی ہے، نہ کہ وہ جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ اُس مرحوم کو تو ظالموں نے قتل کر دیا، مگر اس کی خود نوشت سوانح عمری شائع شدہ موجود ہے۔ اُس میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حج سے کیا گہرا اثر اُس نے قبول کیا تھا۔

یہ حج تو اسلام کی عبادات میں سے صرف ایک عبادت ہے۔ اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اسلام کی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی دیکھے تو کسی جگہ انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیز کسی خاص قوم یا کسی قبیلے یا کسی نسل یا طبقے کے مفاد کے لیے ہے۔ یہ تو پورا کا پورا دین ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے اور اس کی نگاہ میں وہ سب انسان یکساں ہیں جو اس کے اصول قبول کر کے اس کی بنائی ہوئی عالمگیر برادری میں شامل ہو جائیں۔ بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کرتا جو گوروں نے کالوں کے ساتھ کیا، جو سامراجی قوتوں نے اپنی محکوم قوموں کے ساتھ کیا، جو کمیونسٹ حکومتوں نے اپنے دائرہ اقتدار میں رہنے والے غیر کمیونسٹوں کے ساتھ، حتیٰ کہ خود اپنی پارٹی کے غیر مرغوب ارکان کے ساتھ کیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کی فلاح کے لیے وہ کیا اصول ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائے ہیں اور ان میں کیا بات ایسی ہے جو نہ صرف فلاح انسانیت کی ضامن ہے بلکہ تمام انسانوں کو ایک وحدت کی لڑی میں پرو کر ایک اُمت بھی بنا سکتی ہے۔

اللہ کی واحدانیت کا وسیع ترین تصور:

ان میں سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا ہے، صرف اس معنی میں نہیں کہ اللہ ہے، اور محض اس معنی میں بھی نہیں کہ اللہ بس ایک ہے بلکہ اس معنی میں کہ اس کائنات کا واحد خالق، مالک، مدبّر اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کوئی دوسری ہستی پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جس کے پاس حاکمیت کا اقتدار ہو، جس کو حکم دینے اور منع کرنے کا حق ہو، جس کے حرام کرنے سے کوئی چیز حرام اور جس کے حلال کرنے سے کوئی چیز حلال ہو سکتی ہو۔ یہ اختیارات اُس کے سوا کوئی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ خالق اور مالک ہے۔ اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے بندوں

کو اپنی پیدا کردہ دنیا میں جس چیز کی چاہے اجازت دے اور جس سے چاہے منع کر دے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اللہ کو اس حیثیت سے مانو۔ اُس کو اس حیثیت سے مانو کہ ہم اس کے سوا کسی کے بندے نہیں ہیں اور اُس کے قانون کے خلاف کسی کو ہم پر حکم چلانے کا حق نہیں ہے۔ اس حیثیت سے مانو کہ ہمارا سر اُس کے سوا کسی کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ اس حیثیت سے مانو کہ ہماری تقدیر بنانے اور بگاڑنے والا صرف وہی ہے۔ اس حیثیت سے مانو کہ ہمارا جینا اور مرنا بالکل اُس کے اختیار میں ہے۔ جس وقت چاہے ہمیں موت دے سکتا ہے اور جس وقت تک چاہے زندہ رکھ سکتا ہے۔ اس کی طرف سے موت آئے تو دنیا کی کوئی طاقت بچا لینے والی نہیں اور وہ زندگی عطا کرے تو دنیا کی کوئی طاقت ہلاک کر دینے والی نہیں یہ ہے اسلام کا تصورِ خدا۔

اِسی تصور کے مطابق زمین سے لے کر آسمانوں تک ساری کائنات خدا کی تابع فرمان ہے اور انسان جو اِس کائنات میں رہتا ہے، اُس کا بھی یہی کام ہے کہ خدا ہی کا تابع فرمان بن کر رہے۔ اگر وہ خود مختار بنے یا خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت اختیار کرے تو اُس کی زندگی کا نظام پورے نظامِ کائنات کے خلاف ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ ساری کائنات خدا کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ اب اگر ہم خدا کے سوا کسی اور کے حکم کے تحت چل رہے ہوں، یا اپنی مرضی کے مختار بن کر جدھر جی چاہے چل رہے ہوں، تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری زندگی کی گاڑی پوری کائنات کی گاڑی کے خلاف سمت میں چل رہی ہے۔ ایک مستقل تصادم ہے جو ہمارے اور نظامِ کائنات کے درمیان ہو رہا ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے، اس تصور کے مطابق انسان کے لئے صحیح طریقِ حیات (Way of Life) صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے، کیونکہ وہ مخلوق ہے اور اللہ اس کا خالق ہے۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس کا خود مختار بن جانا بھی غلط ہے اور اپنے خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا بھی غلط۔ اِن دونوں راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کرے گا وہ حقیقت سے متصادم ہوگا اور حقیقت سے ٹکرانے کا نقصان خود

ٹکرانے والے ہی کو پہنچتا ہے۔ حقیقت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔

بندگیٔ رب کی دعوت :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت یہ ہے کہ اِس تصادم کو ختم کرو۔ تمہاری زندگی کا قانون اور ضابطہ بھی وہی ہونا چاہیے جو پوری کائنات کا ہے۔ تمہارا حاکم بھی وہی ہونا چاہیے جو ساری کائنات کا ہے۔ تم نہ خود قانون ساز ہو اور نہ کسی دوسرے کا یہ حق تسلیم کرو کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے بندوں پر اپنا قانون چلائے۔ قانونِ برحق صرف خداوندِ عالم کا قانون ہے۔ باقی سب قوانین باطل ہیں۔

اطاعتِ رسولؐ کی دعوت :

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا دوسرا نکتہ آتا ہے اور وہ آپ کا یہ دو ٹوک بیان ہے کہ میں اللہ تعالٰی کا نبی ہوں، اور نوعِ انسانی کے لئے اُس نے اپنا قانون میرے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ میں خود بھی اس قانون کا پابند ہوں۔ خود مجھے بھی اس میں تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اِتباع کرنے پر مامور ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی نئی چیز اِختراع کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ یہ قرآن مجید وہ قانون ہے جو مجھ پر خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اور میری سُنّت وہ قانون ہے جو خدا کے حکم وارشاد کی بنا پر میں جاری کرتا ہوں۔ اِس قانون کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والا سب سے پہلے میں ہوں۔ (اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ) اِس کے بعد تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ ہر دوسرے قانون کی پیروی چھوڑ کر اِس قانون کی پیروی کریں۔

اللہ کے بعد اطاعت کا مستحق اللہ کا رسُول ہے :

کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی سنت کی اطاعت و پیروی کیسے کر سکتے تھے جبکہ وہ آپ کا اپنا ہی قول یا فعل ہوتا تھا۔ اِس معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی طرف سے تھا اُسی طرح رسول ہونے کی حیثیت سے جو حکم آپ دیتے یا جس کام سے آپ منع فرماتے، یا جس طریقے کو آپ مقرر کرتے تھے۔ وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اُسی کا نام سُنّتِ رسول ہے اور اس کی پیروی آپؐ خود بھی اُسی طرح کرتے تھے،

جس طرح سب اہل ایمان کے لئے اُس کی پیروی لازم تھی۔ یہ بات ایسے مواقع پر پوری طرح واضح ہو جاتی تھی۔ جب صحابہ کرام کسی معاملے میں آپؐ سے پوچھتے تھے کہ یا رسولؐ اللہ! کیا آپ یہ اللہ کے حکم سے فرما رہے ہیں یا یہ آپ کی اپنی رائے ہے؟ اور آپ جواب دیتے تھے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے بلکہ میری رائے ہے۔ ایسے مواقع پر صحابہؓ حضورؐ کی رائے سے اختلاف کر کے اپنی تجویز پیش کرتے تھے اور آپ اپنی رائے چھوڑ کر اُن کی تجویز قبول فرما لیتے تھے۔ اسی طرح یہ بات اُن مواقع پر بھی کھل جاتی تھی جب آپ کسی معاملے میں صحابہ سے مشورہ طلب فرماتے تھے۔ یہ مشاورت خود اس امر کی دلیل ہوتی تھی کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا ہے، کیونکہ خدا کا حکم ہوتا تو اس میں مشاورت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ ایسے مواقع رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں بارہا پیش آئے جن کی تفصیلات احادیث میں ہم کو ملتی ہیں۔ بلکہ صحابہ کرام کا تو یہ بیان ہے کہ ہم نے حضورؐ سے زیادہ مشاورت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اس پر آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ بھی حضورؐ کی سنت ہی تھی کہ جس معاملہ میں اللہ کا حکم نہ ہو اس میں مشورہ کیا جائے اور کوئی دوسرا حاکم تو درکنار، اللہ کا رسول تک اپنی ذاتی رائے کو لوگوں کے لئے فرمانِ واجب الاذعان نہ قرار دے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو شوریٰ کے طریقے سے کام کرنے کی تربیت دی اور لوگوں کو یہ سکھایا کہ جس معاملہ میں حکم الٰہی ہو اُس میں بے چون و چرا اطاعت کرو اور جہاں حکم الٰہی نہ ہو وہاں آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق بے خوف و خطر استعمال کرو۔

آزادی کا حقیقی چارٹر:

یہ نوعِ انسانی کے لئے آزادی کا وہ چارٹر ہے جو دینِ حق کے سوا دنیا میں کسی نے اُس کو نہیں دیا۔ اللہ کے بندے صرف اللہ ہی کے بندے ہوں اور کسی کے بندے نہ ہوں۔ حتیٰ کہ اللہ کے رسول کے بندے بھی نہ ہوں۔ اِس نے انسان کو ایک خدا کے سوا ہر دوسرے کی بندگی سے آزاد کر دیا اور انسان پر سے انسان کی خدائی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی۔ اِس کے ساتھ ایک عظیم ترین نعمت جو اس پیغام نے انسان کو عطا کی وہ ایک ایسے قانون کی بالاتری ہے جسے توڑنے مروڑنے اور ردّ و بدل کا تختۂ مشق بنانے کا اختیار کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا جمہوری مجلسِ

قانون ساز یا اسلام قبول کرنے والی کسی قوم کو حاصل نہیں ہے ۔ یہ قانون خیر و شر کی مستقل قدریں (Permanent Values) انسان کو دیتا ہے جنہیں بدل کر کبھی کوئی خیر کو شر اور شر کو خیر نہیں بنا سکتا۔

آخرت کا عقیدہ :

تیسری بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگانِ خدا کو بتائی وہ یہ ہے کہ تم خدا کے سامنے جواب دہ ہو۔ تم اِس دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو کہ اپنی مرضی سے جو چاہو کرتے رہو، جس کھیت میں چاہو چرتے پھرو اور کوئی تمہیں پوچھنے والا نہ ہو بلکہ تم اپنے ایک ایک فعل، ایک ایک قول، اور اپنی پوری اختیاری زندگی کے اعمال کا حساب اپنے خالق و معبود کو دینے والے ہو۔ مرنے کے بعد تمہیں اُٹھنا پڑے گا اور اپنے رب کے سامنے بازپرس کے لئے پیش ہونا پڑے گا۔

یہ ایک ایسی زبردست اخلاقی طاقت ہے جو اگر انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہو جائے تو اُس کا حال ایسا ہو گا جیسے اُس کے ساتھ ہر وقت ایک چوکیدار لگا ہوا ہے جو بُرائی کے ہر ارادے پر اُسے ٹوکتا اور ہر اقدام پہ اُسے روکتا ہے ۔ باہر کوئی گرفت کرنے والی پولیس اور سزا دینے والی حکومت موجود ہو یا نہ ہو، اس کے اندر ایک محتسب ایسا بیٹھا رہے گا جس کی پکڑ کے خوف سے وہ کبھی خلوت میں، یا جنگل میں، یا اندھیرے میں، یا کسی سُنسان جگہ میں بھی خدا کی نافرمانی نہ کر سکے گا۔ اِس سے بڑھ کر انسان کی اخلاقی اصلاح اور اس کے اندر ایک مستحکم کردار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دوسرے جتنے ذرائع سے بھی آپ اخلاق سنوارنے کی کوشش کریں گے، اس سے آگے نہ بڑھ سکیں گے کہ بھلائی دنیا میں فائدہ مند اور بُرائی نقصان دِہ ہے اور یہ کہ ایمانداری ایک اچھی پالیسی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ پالیسی کے اعتبار سے اگر بُرائی اور بے ایمانی مفید ہو اور اُس سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو اسے بلا تکلف کر ڈالا جائے۔ اِسی نقطۂ نظر کا تو یہ نتیجہ ہے کہ جو لوگ اپنی انفرادی زندگی میں اچھا رویہ رکھتے ہیں، وہی اپنے قومی کردار میں انتہا درجے کے بے ایمان، دغاباز، لٹیرے اور ظالم و جابر بن جاتے ہیں۔ بلکہ انفرادی زندگی میں بھی وہ اگر بعض معاملات میں اچھے ہوتے ہیں تو بعض

دوسرے معاملات میں بہت بُرے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف وہ کاروبار میں کھرے اور برتاؤ میں خوش اخلاق ہیں تو دوسری طرف شرابی، زانی، جواری اور سخت بدکار و سیاہ کار ہیں۔ ان کا مقولہ یہ ہے کہ آدمی کی پبلک زندگی اور چیز ہے اور پرائیویٹ زندگی اور۔ نجی زندگی کے کسی عیب پر کوئی ٹوکے تو ان کا گھڑا گھڑایا جواب یہ ہوتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ (Mind Your Business!) اس کے بالکل برعکس آخرت کا عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ بُرائی ہر حال میں بُرائی ہے خواہ دنیا میں وہ مفید ہو یا نقصان دہ۔ جو شخص خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتا ہو اُس کی زندگی میں پبلک اور پرائیویٹ کے دو شعبے الگ الگ نہیں ہو سکتے وہ ایمانداری اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اچھی پالیسی ہے، بلکہ اُس کے عین وجود میں ایمانداری شامل ہوتی ہے اور وہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اُس کا کام کبھی بے ایمانی بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کا عقیدہ اُسے یہ سکھاتا ہے کہ تم اگر بے ایمانی کرو گے تو جانوروں کی سطح سے بھی نیچے جا پڑو گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ .... ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اسے اوندھا کر سب نیچوں سے نیچ کر دیا۔"

اِسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے انسان کو صرف ایک مستقل اخلاقی اقدار رکھنے والا ناقابلِ تبدیل قانون ہی نہیں ملا، بلکہ انفرادی اور قومی اخلاق و کردار کے لئے ایک ایسی بنیاد بھی مل گئی جو کبھی متزلزل ہونے والی نہیں ہے۔ جو اِس بات کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی حکومت موجود ہو، کوئی پولیس موجود ہو، کوئی عدالت موجود ہو تو آپ سیدھے راستے پر چلیں ورنہ مجرم بن کر رہیں۔

رہبانیت کے بجائے دنیاداری میں اخلاق کا استعمال :

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایک اور اہم سبق ہمیں دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق راہبوں کے گوشہ عزلت کے لئے نہیں ہے، درویشوں کی خانقاہوں کے لئے نہیں ہے بلکہ دنیا کی زندگی کے ہر شعبے میں برتنے کے لئے ہے۔ جس روحانی اور اخلاقی بلندی کو دنیا فقیروں اور درویشوں میں تلاش کرتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکومت کی مسند پر اور عدالت

کی کرسی پر اٹھا لائے۔ آپ نے تجارت کے کاروبار میں خدا ترسی اور دیانت سے کام لینا سکھایا
آپ نے پولیس اور فوج کے سپاہیوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا سبق دیا۔ آپ نے انسان کی
اِس غلط فہمی کو دُور کیا کہ خدا کا ولی وہ ہوتا ہے جو تارک الدنیا ہو کر بس اللہ اللہ کرتا رہے۔ آپ
نے بتایا کہ ولایت اس کا نام نہیں، بلکہ اصل ولایت یہ ہے کہ آدمی ایک حاکم، ایک قاضی، ایک
سپہ سالار، ایک تھانیدار، ایک تاجر و صنعت کار اور دوسری تمام ممکن حیثیتوں سے ایک
پورا دنیا دار بن کر بھی ہر اُس موقع پر اپنا خدا ترس اور دیانت دار ہونا ثابت کر دے جہاں
اُس کے ایمان کو آزمائش سے سابقہ پیش آئے۔ اِس طرح آپ اخلاق و روحانیت کو رہبانیت
کے گوشوں سے نکال کر معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ کے میدانوں
میں لے آئے اور یہاں پاکیزہ اخلاق کی حکمرانی قائم کی۔

حضورؐ کی ہدایت کا فیض :

یہ اسی رہنمائی کا فیض تھا کہ اپنی نبوت کے آغاز میں جن لوگوں کو آپ نے ڈاکو پایا تھا
ان کو اِس حالت میں چھوڑا کہ وہ امانت دار اور خلقِ خدا کی جان و مال اور آبرو کے محافظ
بن چکے تھے۔ جن لوگوں کو حق مارنے والا پایا تھا، انہیں حق ادا کرنے والا، حقوق کی حفاظت
کرنے والا اور حقوق دلوانے والا بنا کر چھوڑا۔ آپ سے پہلے دنیا اُن حاکموں سے واقف
تھی جو ظلم و جور سے رعیت کو دبا کر رکھتے تھے اور اُونچے اونچے محلوں میں رہ کر اپنی خدائی
کا سکہ جماتے تھے۔ آپ نے اُسی دنیا کو ایسے حاکموں سے روشناس کرایا جو بازاروں میں
عام انسانوں کی طرح چلتے تھے اور عدل و انصاف سے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آپ سے پہلے
دُنیا اُن فوجوں سے واقف تھی جو کسی ملک میں گھستی تھیں تو ہر طرف قتلِ عام برپا کرتی۔ بستیوں
کو آگ لگاتی اور مفتوح قوم کی عورتوں کو بے آبرو کرتی پھرتی تھیں۔ آپ نے اُسی دنیا کو
ایسی فوجوں سے متعارف کرایا جو کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتیں تو دشمن کی فوج کے سوا کسی
پر دست درازی نہ کرتی تھیں۔ اور فتح کیے ہوئے شہر سے اگر پسپا ہوتیں تو اہلِ شہر سے
وصول کیے ہوئے ٹیکس تک انہیں واپس کر دیتی تھیں۔ انسانی تاریخ ملکوں اور شہروں کی فتح
کے قصوں سے بھری پڑی ہے، مگر فتحِ مکہ کی کوئی نظیر آپ کو تاریخ میں نہ ملے گی جس شہر کے

لوگوں نے تیرہ برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم ڈھایا تھا اُسی شہر میں آپ کا فاتحانہ داخلہ اِس شان سے ہوا تھا کہ آپ کا سر خدا کے آگے جھکا جا رہا تھا، آپ کی پیشانی اونٹ کے کجاوے سے لگی جا رہی تھی، اور آپ کے طرزِ عمل میں غرور و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہی لوگ جو ۱۲ برس تک آپ پر ظلم و ستم کرتے رہے تھے، جنہوں نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا اور جو ہجرت کے بعد بھی آٹھ برس تک آپ سے برسرِ جنگ رہے تھے، جب مغلوب ہو کر آپ کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے آپ سے رحم و کرم کی التجا کی اور آپ نے انتقام لینے کے بجائے فرمایا کہ "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم چھوڑ دیئے گئے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نمونے کا جو اثر آپ کی اُمت پر پڑا ہے اس کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو تاریخ میں خود دیکھ لے کہ مسلمان جب اسپین میں داخل ہوئے تھے تو ان کا رویہ کیا تھا، اور جب عیسائیوں نے ان پر فتح پائی تھی تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں جب عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور مسلمانوں نے جب بیت المقدس کو ان سے واپس لیا تو عیسائیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا۔

حضرات! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک بحرِ ذخار ہے جس کا احاطہ کرنا کسی بڑی کتاب میں بھی ممکن نہیں ہے، کجا کہ ایک تقریر میں کیا جا سکے۔ تاہم میں نے زیادہ سے زیادہ ممکن اختصار کے ساتھ اُس کے چند نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس واحد ذریعۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل کریں۔

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۷۶ء)

رحمۃ اللعالمینؐ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں دُنیا کے حالات جس قسم کے تھے، اس کی نشاندہی قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے کرتوتوں کے سبب۔

یعنی خشکی اور تری میں فساد کی جو کیفیت پھیلی ہوئی تھی، وہ لوگوں کے اپنے اعمال اور کرتوتوں کا نتیجہ تھی۔ اِس زمانے کی دو بڑی طاقتیں فارس اور روم جیسی کہ آج کل رُوس اور امریکہ ہیں باہم دست و گریباں تھیں اور اس زمانے کی پُوری مہذب دُنیا میں بدامنی، بے چینی اور فساد کی کیفیت رُونما ہو چکی تھی۔ اِس لپیٹ میں خود عرب بھی آچکا تھا اور اس کی حالت ایسی تھی گویا وہ تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ قرآن میں اسی حالت کا اِشارہ ان الفاظ میں ہے :

وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ۔

اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے۔

حضورؐ کی بعثت کے وقت دُنیا کا نقشہ

تاریخ کا مطالعہ کرنے والا انسان جو عرب کی اس وقت کی حالت کو جانتا ہے، بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے کتنا صحیح نقشہ اس وقت کے عرب کے حالات کا کھینچا ہے قبائل کے درمیان مختلف قسم کی گمراہیوں کے نتیجے میں اور جاہلی عصبیتوں کی وجہ سے اِس کثرت سے جنگیں ہوتی تھیں کہ ان میں سے بعض جنگیں سو سال تک طُول کھینچ گئیں۔ اِس کیفیت سے

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عرب کتنا تباہ و برباد ہوا ہوگا۔

پھر عرب کی اپنی آزادی کی کیفیت یہ تھی کہ یمن پر حبش کا قبضہ تھا اور باقی عرب کا کچھ حصہ ایران کے تسلط میں تھا اور کچھ رُومی اثر کے زیرِ نگیں۔ پوری عرب دُنیا جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس وقت کی دو بڑی طاقتوں ایران اور روم کی وہی اخلاقی اور سیاسی حالت تھی جو آج کل امریکہ اور رُوس کی ہے۔

اس حالت میں جبکہ دُنیا قبائلی عصبیتوں اور مختلف قسم کی دھڑے بندیوں میں، جن کی سربراہی ایران اور روم کر رہے تھے، بٹی ہوئی تھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے وُہ دنیا کے لیڈروں کی طرح کسی قبیلے کا جھنڈا لے کر نہیں اٹھے تھے، کسی قومی نعرہ پر لوگوں کو اکٹھا نہیں کیا، کوئی اقتصادی نعرہ بلند نہیں کیا۔ ان تمام چیزوں میں سے کسی کی طرف آپؐ نے دعوت نہیں دی۔

جس چیز کی آپؐ نے دعوت دی۔ اس کا پہلا جُزو یہ تھا کہ تمام انسانوں کو تمام بندگیاں چھوڑ کر صرف ایک کی بندگی کرنی چاہیے۔

بنی آدم کو توحید کی دعوت

آپؐ کی دعوت اللہ کی طرف تھی، یہ کہ عبادت صرف اللہ ہی کی ہونی چاہیے اور اس کے سوا آدمی کسی کو کارساز نہ سمجھے۔ آپؐ نے یہ دعوت کسی مخصوص طبقے یا قوم کو نہیں دی بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کو دی۔ آپؐ کی دعوت توحید تمام بنی آدم کے لیے تھی اور آپؐ نے کسی گورے کو، کسی کالے کو، کسی عرب کو کسی عجمی کو اس کی قومی یا علاقائی حیثیت سے نہیں پکارا بلکہ صرف ابنِ آدم کی حیثیت سے یَا اَیُّھَا النَّاس کہہ کر پکارا۔ پھر جو دعوت آپؐ نے دی، وُہ بھی کوئی قومی یا علاقائی نہ تھی بلکہ اصلاح کی اصل جڑ یعنی توحید خالص کی دعوت تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ

اصل خرابی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو چھوڑ کر مختلف قسم کے خداؤں کا دامن تھام لے اور اصل اصلاح یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے۔

اگر یہ خرابی دُور ہو گئی تو اس کی اصلاح بھی ہو جائے گی، ورنہ لاکھ جتن کے باوجود

درستی اور اصلاح نہیں ہوگی۔

دوسری بات جس کی طرف آپ نے انسانوں کو توجہ دلائی وہ آخرت کا تصور تھا۔ آپ نے فرد کو اس کی ذاتی حیثیت میں جواب دہ قرار دیا تاکہ ہر فرد محسوس کرے کہ اسے اپنے اعمال کی ذاتی حیثیت میں جواب دہی کرنی ہے۔ اگر اس کی قوم بگڑی ہوئی تھی تو وہ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتا کہ میرا جس قوم سے تعلق تھا، وہ گمراہ تھی۔

اس سے پوچھا جائے گا کہ اگر قوم گمراہ تھی تو تم راہِ راست پر کیوں نہ رہے، تم کیوں شتر بے مہار بنے رہے۔

آپ نے پہلے لوگوں کے دلوں میں توحید اور آخرت کے دو بنیادی تصورات بٹھائے اور ان کو پختہ کرنے میں برسوں محنت کی، طرح طرح کے ظلم برداشت کیے، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، لیکن آپ نے کسی پر ملامت نہ کی۔ اس مقصد کے لیے آپ نے پتھر اور گالیاں کھا کھا کر لوگوں کو سمجھایا کہ:

اگر خدا اور آخرت کا تصور انسان میں نہیں ہے تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔

جب یہ دونوں چیزیں آپ نے اپنی قوم کے ذہن میں بٹھا دیں، تو پھر ان کے سامنے زندگی کا عملی پروگرام پیش کیا۔

زندگی کا عملی پروگرام

عملی پروگرام میں سب سے پہلی چیز نماز ہے۔ اس کی سب سے اوّل تاکید کی گئی۔

نماز سے مقصود یہ تھا کہ انسان کے دل و دماغ میں یہ چیز رچ بس جائے کہ وہ اللہ کا مخلص بندہ ہے، اسے صرف اللہ ہی کے سامنے جھکنا اور اُس کی اطاعت کرنی ہے۔

پھر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کی ہدایت کی گئی تاکہ آدمی کے دل میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا ہو۔ روزے کی ہدایت بعد میں آتی ہے۔ نماز کے بعد جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ زکوٰۃ ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سب سے بڑا فتنہ مال کی محبت ہے

قرآن میں اسی لیے آیا ہے :

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ تم کو بہتات کی حرص نے غفلت میں رکھا ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا اترو گے۔

یعنی آدمی کا دل دُنیا کی دولت اور کثرت سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آدمی کو دولت کی ایک وادی مِل جائے تو وہ دُوسری کی تلاش میں نِکل کھڑا ہوتا ہے اِسی حرص کی اصلاح کے لیے زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ جہاں زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آدمی حلال کمائی کی فکر کرے۔

اگر چوری کرنے والا زکوٰۃ کی فکر کرے گا تو اسے خود بخود کھٹکا ہوگا کہ اس کی کمائی بھی حلال ہونی چاہیے۔

اسے حلال کی کمائی اور حلال خرچ کی عادت پڑے گی۔ وہ دوسروں کے حقوق پہچانے گا، کیوں کہ اسے ہدایت کی گئی ہے کہ اس کی کمائی میں دوسروں کا بھی حق ہے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔

یہ دونوں عملی پروگرام نماز اور زکوٰۃ انسان کی اصلاح کی بنیادیں ہیں۔ یہ چودہ سو برس پہلے کا اصلاحی پروگرام جس طرح عرب کے لیے اصلاح کا پروگرام تھا اسی طرح دُنیا بھر کے لیے اصلاح کا پروگرام ہے اور اسی طرح آج بھی انسان کی اصلاح کا پروگرام ہے

اگر کوئی آدمی خدا کو نہیں مانتا، آخرت سے بے خوف ہے اس کے سامنے کوئی معاشی پروگرام رکھ دینا بے معنی ہوگا۔ خدا اور آخرت کے خوف کے بغیر کوئی سیاسی اور معاشی اصلاح ہو نہیں سکتی اور دُنیا میں جو مختلف قسم کے ظلم ہو رہے ہیں، ان کو دُور نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ اور آخرت پر یقین اور جوابدہی کے خوف کے بغیر جو بھی انسان یا جماعت اصلاح کے لیے اُٹھے گی وہ اصلاح کی بجائے فساد کا موجب ہوگی۔ وہ دوستی کی بجائے اُلٹی ظلم

میں اضافہ کرے گی۔

جو آدمی با اختیار ہو اور بے خوف ہو وہ رشوت سے کیسے بچے گا۔ آپ لاکھ قانون بنائیے لیکن اس کی تنفیذ کے لیے جس قسم کے انسان درکار ہیں وہ کہاں سے آئیں گے۔

ایمان اور اخلاق کی طاقت

قانون کی پوزیشن بھی یہی ہے کہ جیسے کوئی شخص نماز پر اپنے ایمان کا اعلان کرتا ہے لیکن جب اذان ہو تو وہ نماز کے لیے اُٹھے نہیں۔ زکوٰۃ کا مدعی ہو لیکن جب طلب کی جائے تو کہے:

گر زر طلبی سخن درین است

تو کونسی تحریک ہوگی، اس شخص میں جو اس کو اصلاح پر آمادہ کر سکے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے دل میں کوئی خوف نہ ہوگا تو اس میں کبھی دین کے لیے حرکت نہ پیدا ہو سکے گی۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہی نکات پر مکی دور میں لوگوں کی اصلاح کی۔ جب آپ نے مکے سے ہجرت فرمائی تو ان اصلاح یافتہ لوگوں کی ایک مختصر سی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ ان لوگوں کی تعداد بدر کے معرکے کے وقت تین سو تیرہ تھی اور جب یہ اُحد میں گئے تو ان کی کل تعداد سات سو تھی۔ یہ تعداد مادی اعتبار سے کوئی اُمید افزا نہ تھی لیکن چونکہ یہ گروہ اصلاح یافتہ تھا، ان کو اللہ کی وحدانیت اور آخرت پر یقین کامل تھا، اس لیے وہ اپنے سے کئی گنا مخالفین پر غالب آتے اور نو سال کی مدت نہیں گزرنے پائی تھی کہ وہ پورے خطۂ عرب پر چھا گئے۔

یہ خیال نہ کیجیے کہ ان کی تلوار کی کاٹ بڑی سخت تھی کہ عرب اس کی مزاحمت نہ کر سکا اور مسخر ہو گیا۔ درحقیقت یہ ان کے ایمان و اخلاق کی طاقت تھی جو سب کو مسخر کر گئی۔ جہاں تک جنگوں اور معرکوں کا تعلق ہے ان میں کام کرنے والوں کی کل تعداد تاریخ سے صرف بارہ سو ملتی ہے۔ گویا تسخیر کا یہ عمل میدانِ کارزار میں نہیں ہو سکتا تھا بلکہ ساری تاثیر

ساری طاقت اور ساری قوت اس کیریکٹر کی تھی جو حضورؐ نے اپنے صحابہؓ کے اندر جب بنیادوں (توحید، آخرت، نماز اور زکوٰۃ) پر استوار کیا تھا۔ یہ اسی کیریکٹر کا نتیجہ تھا کہ عین لڑائی کے وقت بھی انھوں نے حق و انصاف کا دامن نہ چھوڑا، انھوں نے یہ لڑائیاں لوٹ اور مالِ غنیمت کے لیے نہ کی تھیں بلکہ ہدایت کی روشنی پھیلانے کے لیے کیں۔ یہ سارے کرشمے اس سیرت کے تھے جو حضورؐ نے بڑی محنت سے تیار کی تھی۔ انھوں نے اگر کبھی کسی جگہ حکومت بھی کی تو لوگ ان کے اقتدار سے زیادہ ان کے کردار سے متاثر ہوتے۔

انسان کی آنکھ نے اس سے پہلے کبھی بوریا نشین حاکم نہ دیکھے تھے جنھوں نے اپنے آرام اور ٹھاٹھ باٹھ کی بجائے خلقِ خدا کو آرام پہنچایا، وہ جاگتے تھے تو لوگ سکون سے سوتے تھے، ان کی حکومت جسموں سے زیادہ دلوں پر تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تعلیم آج بھی موجود ہے مسلمان آج بھی اسے اپنا لیں تو ان کی حکمرانی آج بھی اسی طرح کرۂ ارض پر قائم ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ "اے رسول ہم نے تجھے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک انسان کے لیے کس طرح رحمت بنی تو اس بیان کے لیے ایک تقریر کیا، سینکڑوں تقریریں اور سینکڑوں کتابیں بھی ناکافی ہیں۔ انسان رحمت کے ان پہلوؤں کا شمار نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں آپ کے سامنے اس رحمت کے صرف ایک پہلو کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ اس زاویے سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک ہی ہستی ہے جو انسان کے لیے حقیقتاً رحمت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی سماج کے لیے وہ اصول پیش کیے ہیں جن کی بنیاد پر انسانوں کی ایک برادری بن سکتی ہے اور انہی اصولوں پر ایک عالمی حکومت ـــــ

(WORLD STATE) بھی معرضِ وجود میں آسکتی ہے اور انسانوں کے درمیان وہ تقسیم بھی ختم ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے ظلم کا باعث بنی رہی ہے۔

دُنیا کی مختلف تہذیبوں کے اصُول

اِس نکتے کی وضاحت کے لیے میں پہلے دُنیا کی مختلف تہذیبوں کے اصُول بتاؤں گا تاکہ تقابلی مطالعہ سے یہ معلوم ہو سکے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا اصُول پیش کیے تھے۔ دُنیا میں جتنی بھی تہذیبیں گزری ہیں، انھوں نے جو بھی اصُول پیش کیے ہیں وہ اِنسانوں کو جوڑنے والے نہیں ہیں بلکہ پھاڑنے والے اور انھیں درندہ بنانے والے ہیں۔

آریائی تہذیب

مثال کے طور پر آپ سب سے قدیم آریہ تہذیب کو لے لیجیے۔ وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ نسلی برتری کا تصوّر لے کر گئے۔ وہ ایران میں رہے تب بھی اِسی تصوّر کے ساتھ رہے اور ہندوستان میں آ گئے تب بھی ان کے ساتھ یہی تصوّر تھا، ان کے نزدیک برہمن سب ذاتوں سے بلند و برتر تھا۔ اور باقی جتنے بھی طبقات یا ذاتیں معاشرے میں پائی جاتی تھیں، سب ان سے فروتر اور کم حیثیت تھیں۔ آریہ تہذیب نے واضح طور پر انسان کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا اور یہ تقسیم انسانی صفات کی بنیاد پر نہ تھی۔ بلکہ پیدائش کی بنیاد پر تھی اور اس میں اِنسانی کوشش کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ کوشش سے کوئی شودر برہمن نہ بن سکتا تھا اور نہ کوئی ذات دُوسری ذات میں منتقل ہو سکتی تھی۔ ان کے نزدیک کچھ انسان پیدائشی طور پر برتر پیدا ہوتے تھے اور کچھ ازل ہی سے کم تر اور نیچ تھے۔

ہٹلر کا دعویٰ

اسی اصُول کو ہٹلر نے اختیار کیا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ جرمن نسل سب سے برتر و فائق ہے۔

اور نسلی برتری کا یہی تصوّر یہودی ذہنیت میں بھی رچا بسا ہوا ہے۔ ان کے قانون کے مطابق جو پیدائشی اسرائیلی نہیں، وہ اسرائیلیوں کے برابر نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہوواہ

کے لیے انصاف کا ترازو اور ہے اور غیر یہودیوں کے لیے اور۔ چنانچہ تالمود میں یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ اگر کسی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان تنازعہ ہو جائے تو اسرائیلی کی بہر صورت رعایت کی جائے۔

اسی طرح یونانیوں کے اندر بھی ایک نسلی غرور پایا جاتا ہے۔ ان کی نگاہ میں تمام غیر یونانی گھٹیا اور پست تھے۔

مغرب کی پست ذہنیت

دوسری طرف آپ دیکھیے تو یہی چیز آپ کو مغربی ذہنیت میں پیوست دکھائی دیتی ہے۔ مغربی دنیا سفید نسل کی برتری کے تصور میں مبتلا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ رنگدار نسل سے برتر ہیں۔ اسی زعم باطل کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا ظلم و فساد میں سرتاپا ڈوبی ہوئی ہے اور صرف رنگ کی بنا پر بے حد و حساب ظلم دنیا میں توڑا جا رہا ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک اس تصور کا جائز ہونا تھا جس نے انھیں اکسایا کہ وہ سیاہ فاموں کو افریقہ سے غلام بنا کر لائیں اور بیچیں اور ان پر جس طرح چاہیں ظلم ڈھائیں ان کے لیے حلال ہے۔ اندازہ ہے کہ پچھلی صدی میں کم از کم دس کروڑ انسان غلام بنائے گئے اور ان کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کیا گیا کہ ان میں سے صرف چار کروڑ بچے۔

جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں یہی ظلم آج بھی انسان انسان کے ساتھ کر رہا ہے۔

علاقائی قومیت کا نشہ

اسی قبیل سے علاقائی قومیت (TERRITORIAL NATIONALISM) کا ایک نشہ بھی ہے۔ دنیا کی دو بڑی جنگیں اسی تعصب کی بنیاد پر چھڑیں لیکن جیسا کہ اس عصبیت نے اپنے عملی مظاہرے سے دکھا دیا ہے کہ آدمیوں کو جمع کرنے والی نہیں پھاڑنے والی اور ان کو درندہ بنانے والی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی کالا گورا نہیں ہو سکتا اور کوئی غیر ملکی ملکی نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی اپنی وطنیت کو تبدیل کر سکے۔ وہ جہاں پیدا ہوا ہے بہر حال اسی مقام کا باشندہ ہو گا۔

اور یہی کیفیت خود عرب میں بھی تھی۔ قبائلی عصبیت ان لوگوں کے رگ و ریشہ میں

رچی بسی ہوئی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں برتر و فائق سمجھتا تھا۔ دوسرے قبیلے کا کوئی شخص کتنا ہی نیک کیوں نہ ہوتا، وہ ایک قبیلے کے نزدیک اتنی قدر نہیں رکھتا تھا جتنا کہ ان کے نزدیک ان کا اپنا ایک برا آدمی رکھتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں مسیلمہ کذاب اٹھا، تو اس کے قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ ہماری نگاہ میں ہمارا جھوٹا آدمی بھی قریش کے سچے آدمی سے بہتر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار

جس سرزمین میں انسانوں کے درمیان امتیاز نسل، قبیلے اور رنگ کی بناء پر ہوتا تھا وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پکار انسان کی حیثیت سے بلند کی۔ ایک عرب نیشنلسٹ کی حیثیت سے نہیں اور نہ عرب یا ایشیا کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے کی تھی۔ آپؐ نے پکار کر فرمایا :

"اے انسانو! میں تم سب کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔"

اور جو بات پیش کی وہ یہ کہ :

"اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور تم کو قبیلوں اور گروہوں میں اس لیے بانٹا ہے کہ تم کو باہم تعارف ہو۔ اللہ کے نزدیک برتر اور عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور اس حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان کے درمیان کوئی فرق رنگ، نسل اور وطن کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔

تم کو قبائل میں پیدا کیا تعارف کے لیے۔

یعنی یہاں جو کچھ بھی فرق ہے اس سے مقصود تعارف ہے۔ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ خاندان جمع ہوتے ہیں تو ایک بستی بن جاتی ہے اور بستیاں جمع ہوتی ہیں تو ایک وطن وجود میں آجاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ

اور زبان میں بھی جو کچھ فرق ہے وہ صرف تعارف کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فطری فرق صرف تعارف کے لیے رکھا ہے اور یہ فرق باہمی تعاون CO-OPERATION کے لیے ہے نہ کہ بغض، عداوت اور امتیاز کے لیے۔

اسلام میں برتری کا تصوّر

اب دُنیا میں برتری کا تصوّر ہے تو رنگ کی بنا پر کالے یا گورے ہونے کی بنا پر لیکن اِس بنا پر برتری نہیں کہ کون برائیوں سے زیادہ بچنے والا ہے۔ کون نیکیوں کو زیادہ اختیار کرنے والا ہے، کون اللہ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون ایشیا میں پیدا ہوا ہے، اور کون یورپ میں۔ خُدا کے رسُول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بتایا کہ دیکھنے کی اصل چیزیں یہ نہیں بلکہ انسان کے اخلاق ہیں۔ یہ دیکھیے کہ کون خُدا سے ڈرتا ہے اور کون نہیں۔ اگر آپ کا حقیقی بھائی خُدا کے خوف سے عاری ہے تو وہ قابلِ قدر نہیں ہے لیکن دُور کی قوم کا کوئی آدمی خواہ وہ کالے رنگ ہی کا کیوں نہ ہو، اگر خدا کا خوف رکھتا ہے تو وہ آپ کی نگاہ میں زیادہ قابلِ قدر ہونا چاہیے۔

اُمتِ وسط کا قیام

حضور فلسفی نہیں تھے کہ محض ایک فلسفہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس بُنیاد پر ایک اُمت بنائی اور اسے بتایا کہ:

جَعَلۡنَاكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

اُمتِ وسط سے مراد ایک ایسی قوم ہے جو جانبداری کے لحاظ سے نہ کسی کی دشمن ہے نہ کسی کی دوست۔ اس کی حیثیت ایک جج کی سی ہے جو ہر لحاظ سے غیر جانبدار رہتا ہے وہ نہ کسی کا دوست ہوتا ہے کہ جانبدار بن جاتے نہ دشمن ہوتا ہے کہ مخالفت میں توازن کھو دے۔ اس کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی اگر کوئی جرم کرتے تو وہ اسے بھی سزا دینے میں تامل نہیں کرے گا۔

جج کی یہی حیثیت پوری اُمت کو دے دی گئی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ مسلمان قوم اُمتِ عادل ہے۔

اب یہ اُمّت عادل بنتی کس چیز پر ہے؟ یہ کسی قبیلے پر نہیں بنتی، کسی نسل یا وطن پر نہیں بنتی، یہ بنتی ہے تو ایک کلمے پر یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم تسلیم کر لو تو جہاں بھی پیدا ہوئے ہو، جو بھی رنگ ہے، بھائی بھائی ہو۔ اس برادری میں جو بھی شامل ہو جاتا ہے اس کے حقوق سب کے ساتھ برابر ہیں۔ کسی سید اور شیخ میں کوئی فرق نہیں اور نہ عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت ہے۔ اس کلمے میں شریک ہو گئے تو سب برابر۔ حضورؐ نے اسی لیے فرمایا تھا:

> کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت ہے نہ گورے کو کالے پر، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں سب سے زیادہ عزت پانے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

اِسلامی عدل کی ایک مثال

اسی چیز کو میں ایک واقعے سے آپ کو سمجھاتا ہوں۔ غزوۂ بنی مصطلق میں مہاجرین اور انصار دونوں شریک تھے۔ اتفاق سے پانی پر ایک مہاجر اور انصار کا جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے مہاجروں کو پکارا اور انصار نے انصار کو۔ آپؐ نے یہ پکار سُنی، تو غضب ناک ہو کر فرمایا:

> یہ کیسی جاہلیت کی پکار ہے۔ چھوڑ دو اس متعفن پکار کو۔

اِس سے آپؐ کی مُراد یہ تھی کہ اگر ایک شخص دُوسرے شخص پر ظلم ڈھا رہا ہے تو مظلوم کا ساری اُمّتِ مسلمہ پر حق ہے کہ وہ اس کی مدد کو پہنچے۔ نہ کہ کسی ایک قبیلے اور برادری کا۔ لیکن صرف اپنی ہی برادری کو پکارنا یہ جاہلیت کا شیوہ ہے۔ مظلوم کی حمایت مہاجر اور انصار دونوں پر فرض تھی۔ اگر ظالم کسی کا حقیقی بھائی ہے تو اس کا فرض ہے کہ سب سے پہلے وہ اس کے خلاف کھڑا اٹھے۔ لیکن اپنے گروہ کو پکارنا یہ اسلام نہیں جاہلیت ہے۔ اسلام اسی لیے کہتا ہے:

> "کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ" عدل کو قائم کرنے والے بنو۔

تسخیرِ انسانیت کا وصف

اس امت میں بلال حبشیؓ بھی تھے، سلمان فارسیؓ بھی اور صہیب رومیؓ بھی۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ساری دنیا کو اسلام کے قدموں میں لا ڈالا۔ خلافتِ راشدہ کے عہد مبارک میں ملک پر ملک فتح ہوتا چلا گیا۔ اِس لیے نہیں کہ مسلمان کی تلوار سخت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ جس اصول کو لے کر نکلے تھے اس کے سامنے کوئی گردن جھکے بغیر نہ رہ سکتی۔ ایران میں دنیا ہی اونچ نیچ کا فرق تھا جیسا کہ عرب جاہلیت میں۔ جب ایرانیوں نے مسلمانوں کو ایک صف میں کھڑے دیکھا تو ان کے دِل خود بخود مسخر ہو گئے۔ اسی طرح مسلمان مصر میں گئے تو وہاں بھی اسی اصول نے اپنا اعجاز دکھایا۔ غرض مسلمان جہاں جہاں بھی گئے لوگوں کے دِل مسخر ہوتے گئے۔ اس تسخیر میں تلوار نے اگر ایک فیصد کام کیا ہے تو اس اصولِ عدل نے ننانوے فیصد کام کیا۔

آج دنیا کا کونسا خطہ ہے جہاں مسلمان نہیں ہے۔ حج کے موقع پر ہر ملک کا مسلمان جمع ہو جاتا ہے۔ امریکہ کے مسلمان نیگرو رہنما میلکم ایکس نے حج کا یہ منظر دیکھ کر کہا تھا۔ "نسلی مسئلے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔" صرف یہی وہ چیز ہے جس پر دنیا کے تمام اِنسان جمع ہو سکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ انسان کہیں بھی پیدا ہو، وہ اپنی وطنیت تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک اصول کا عامل ضرور بن سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو ایک ایسا کلمہ دے دیا جس پر وہ جمع بھی ہو سکتے ہیں اور ایک عالمی ریاست بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں پر زوال کیوں آیا؟

مسلمان جب بھی اس اصول سے ہٹے مار کھائی۔ اسپین پر مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت رہی۔ جب مسلمان وہاں سے نکلے تو اس کی وجہ تھی، قبائلی عصبیت کی بناء پر باہمی چپقلش۔ ایک قبیلہ دوسرے کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور باہم دِگر لڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی اور وہ وہاں سے ایسے مٹے کہ آج وہاں ایک مسلمان بھی دکھائی نہیں دیتا۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی طاقت کیوں ٹوٹی۔ ان میں وہی جاہلیت کی عصبیتیں اُبھر آئی تھیں۔ کوئی اپنے مغل ہونے پر ناز کرتا تھا تو کوئی پٹھان ہونے پر۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے مرہٹوں سے پٹے، پھر سکھوں سے پٹے اور آخر میں چھ ہزار میل دُور سے ایک غیر قوم آکر ان پر حاکم بن گئی۔

اسی صدی میں ترکی کی عظیم الشان سلطنت ختم ہوگئی۔ عرب ترکوں سے برسرِپیکار ہوگئے۔ عرب اپنے نزدیک اپنے لیے آزادی حاصل کر رہے تھے، لیکن ہو یہ رہا تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کا جو بھی ٹکڑا ترکوں کے تسلط سے نکلتا تھا وہ یا تو انگریزوں کے قبضے میں پہنچ جاتا تھا یا فرانسیسیوں کی نذر ہو جاتا تھا۔

آج مسلمان مسلمان کو کھاتے جا رہا ہے

اور یہی معاملہ آج بھی ہے۔ عرب عرب کو کھاتے جا رہا ہے۔ یمن میں اڑھائی لاکھ عرب خانہ جنگی میں مارے گئے۔ عرب اسرائیل جنگ میں بھی شکست کی یہی بڑی وجہ تھی۔ ایک زبان اور ایک نسل رکھتے ہوتے وہ ایک دُوسرے کے دشمن ہو گئے تھے۔ اُردن، شام اور لبنان پہلے ۴۸ء میں پٹے، پھر ۵۶ء میں پٹے اور پھر ۶۷ء میں پٹے، حالانکہ یہ سب اور مصر جمع ہو جائیں تو اپنی تعداد اور رقبے کے لحاظ سے اسرائیل سے کئی گنا بڑے ہیں۔

میں نے آپ کو تاریخ سے بتا دیا ہے کہ مسلمان جب اپنے کلمے پر جمع ہوتے تو غالب آتے لیکن جب وہ رنگ، نسل اور وطن کی بنیاد پر جمع ہوئے تو کٹے اور مٹے۔ اسپین جیسی عظیم الشان سلطنت مسلمانوں سے اسی وجہ سے چھنی۔ ہندوستان میں وہ اسی وجہ سے مغلوب ہوئے اور اسی وجہ سے انھیں مشرقِ وسطیٰ میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

حضورؐ کی سیرت کو اختیار کیجیے

آپ سیرت پر کانفرنسیں ضرور کریں، ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مبارک کوئی کام نہیں ہے لیکن یہ محض ذکر اور LIP SERVICE ہو کر نہ رہ جانے۔ اس پر عمل کریں گے تو اس رحمت سے آپ کو حصّہ ملے گا جو صرف پیروئ رسولؐ کے لیے مقدر ہے۔ حدیث میں اسی لیے آیا ہے۔

اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ ۔

"قرآن تم پر حجت ہے، تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف"۔

کوئی قوم اس کی پیروی کرتی ہے تو یہ قرآن اس کے حق میں حجت ہے اور جو پیروی نہیں کرتی اور وہ جانتی ہے کہ یہ حق ہے تو یہ اس کے خلاف حجت بن کر کھڑا ہوگا ۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی شخص قانون کو جاننے والا ہے اور دوسرا اس سے ناواقف ہے۔ قانون اس کے خلاف حجت ہے، جو قانون کو جانتا ہے پھر بھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس کلمے کو لے کر اٹھیں گے تو نہ صرف اپنا ملک مضبوط و مستحکم ہوگا بلکہ مشرق و مغرب مفتوح ہو جائیں گے، لیکن کلمے کو چھوڑا اور قومیتوں کے پیچھے پڑے تو پرکاہ کی حیثیت باقی نہ رہے گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا امتی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین [1]

[1] سیرت کانفرنس ڈھاکہ مشرقی پاکستان (جون ۱۹۹۹ء) میں خطاب فرمایا۔

انک لعلیٰ خلق عظیم

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بعد اگر کوئی ذکر سب سے زیادہ بابرکت ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے ـــــ میں نے اس موقع پر جو فاضلانہ مقالات سُنے ۔ ان کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں ان موضوعات کے متعلق کچھ کہوں ۔ میں اس وقت مختصراً صرف اتنی بات عرض کروں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے جو دلائل قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک بڑی اہم دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے ۔ فرمایا گیا :

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ ۔ یعنی آپ اخلاق کے بلند ترین درجے پر ہیں ۔

جو لوگ آپؐ کی نبوت کو جھٹلاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے آپکے اخلاق کو پیش کیا ہے کہ اس اخلاق و کردار کے انسان کو تم کیسے جھٹلا سکتے ہو اور حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی طرح کے تعصب کے بغیر حضورؐ کی پاک زندگی پر نگاہ ڈالے گا تو اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ اللہ کے رسُولؐ کے سوا کسی اور کی زندگی نہیں ہو سکتی ۔

اپنوں کی شہادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے دو دَور ہیں ۔ ایک دَور نبوت سے پہلے کے چالیس سال کا ہے اور دوسرا نبوت کے بعد کے ۲۳ سال کا ۔ نبوت کے بعد کے دَور میں بھی ۱۳ سال آپ نے مکہ معظمہ میں گزارے اور دس سال مدینہ

منورہ میں۔ نبوت کے بعد پہلے کے چالیس سال کی کسی تفصیل میں جائے بغیر صرف اس بات کو غور کیجئے کہ سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے والی وہ ہستیاں تھیں جن کو سب سے زیادہ آپؐ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مثلاً حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ان میں سے حضرت علیؓ کے متعلق ایک مخالف اسلام شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ آٹھ دس سال کے بچے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پرورش کیا تھا۔ اس لئے اگر وہ اپنے سرپرست پر ایمان لے آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پچپن سال کی خاتون تھیں۔ پندرہ سال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ تھیں۔ ایک بیوی سے بڑھ کر اپنے شوہر کے عادات و خصائل اور اخلاق و مزاج کو جاننے والا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضرت خدیجہؓ کے متعلق تاریخ میں یہ بات ثابت ہے کہ وہ قریش کی نہایت فرزانہ اور دانش مند خاتون تھیں۔ پندرہ سال آپؐ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد حضورؐ کے متعلق ان کی رائے کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے سامنے اس بات کا ذکر کیا کہ میرے پاس اللہ کی طرف سے وحی آئی ہے۔ تو انہوں نے ایک لمحے کا تامل کئے بغیر یہ تسلیم کر لیا کہ آپؐ کو واقعی اللہ نے اپنا نبی بنایا ہے۔ ان کو یقین آ گیا کہ جب اس اخلاق و کردار اور سیرت کا انسان یہ بات کہہ رہا ہے کہ میرے پاس خدا کی طرف سے نبوت کا پیغام آیا ہے تو بالکل سچ کہہ رہا ہے۔

دوسرے شخص حضرت ابوبکرؓ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ہم عمر تھے اور آپ سے عمر میں صرف دو سال چھوٹے تھے۔ وہ حضورؐ کے پرانے دوست اور ہم نشین تھے۔ دوست سے زیادہ دوست کو جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دوست دوست کے عیب، صواب ہر چیز کو جانتا ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ اللہ نے ان کو نبوت سے سرفراز کیا ہے تو انہوں نے بھی ایک لمحے کا تامل کئے بغیر تسلیم کر لیا کہ فی الواقع آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ ان

کے دل میں سرے سے کوئی شک گزرا ہی نہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی ایسی پاکیزہ تھی۔ اور آپ کا اخلاق و کردار اتنا بلند تھا کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے آدمی کو فوراً یقین آگیا کہ آپ فی الواقعی نبوت سے سرفراز ہوئے ہیں۔

تیسرے شخص حضرت زیدؓ بن حارثہ ہیں۔ وہ پختہ عمر کے آدمی تھے۔ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کئی سال سے خادم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ کسی گھر کا خادم یا ملازم آدمی کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے۔ کوئی عیب یا صواب اس سے چھپ نہیں سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت زیدؓ نے بھی جس وقت حضورؐ کا دعوئے نبوت سُنا۔ اسی وقت بغیر کسی شک کے اسے درست تسلیم کر لیا ان کو بھی اس امر میں کوئی شک لاحق نہیں ہوا کہ حبیب اللہ نے آپ کو اپنا نبی مقرر کیا ہے تو واقعی آپ اس کے اہل ہیں۔

دشمنوں کی گواہی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز ہونا ایک ایسی سچائی ہے کہ اس کی شہادت آپؐ کے بدترین مخالفوں کے طرزِ عمل میں بھی موجود ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعوئے فرمایا اور عوام میں سردارانِ قریش آپؐ کے کسی بد سے بدتر مخالف نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ جناب آپؐ نبوت کا دعوئے کیا کر رہے ہیں۔ آپؐ یہ تو کہیں کہ آپ کی زندگی کیسی گزری ہے یہ آپؐ کی نہایت درجہ پاکیزہ اور بلند زندگی ہی کی وجہ سے تھا کہ آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ پر شاعر، ساحر اور کاہن وغیرہ کے مضحکہ خیز الزامات تو لگائے لیکن آپ کا کوئی بدتر سے بدتر دشمن بھی آپ پر کبھی کسی طرح کا اخلاقی الزام نہیں لگا سکا۔

وقت کی شہادت

پھر ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ نبوت سے پہلے کی آپؐ کی چالیس سالہ زندگی انتہائی پاکیزہ اخلاق کی تو تھی لیکن نبوت کے دعوئے سے ایک دن پہلے تک

بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا۔ کہ آپ پہلے سے نبوت کی تیاری کر رہے ہیں۔ ایک دن پہلے تک بھی کسی شخص نے آپؐ سے ایسی کوئی بات نہیں سُنی، نہ آپؐ کا ایسا کوئی طرزِ عمل دیکھا جس کی بنا پر اسے کبھی یہ خیال ہوتا کہ آپؐ کوئی مذہبی دعوےٰ لے کر اٹھنے والے ہیں، آپؐ کے دشمنوں نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ جناب آپؐ تو پہلے سے نبوت کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لئے آپؐ کے اس دعوےٰ نبوت کی حقیقت ہم کو معلوم ہے۔

ماحول کی گواہی

اس کے بعد اس بات پر بھی غور کیجئے کہ مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو تیرہ سال گزرے ہیں ان میں آپ ہی کے قبیلے اور بستی کے کچھ لوگ تھے جنہوں نے آپؐ پر ایمان لانا قبول کیا۔ پھر وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے آپؐ پر ایمان لانے سے انکار کیا۔ دونوں کے طرزِ عمل کو آپ دیکھئے جو لوگ حضورؐ پر ایمان لائے تھے وہ وہی تھے کہ جن کے درمیان چالیس سال آپؐ نے زندگی گزاری تھی اور حضورؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی نظر سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک آدمی اپنی بستی سے باہر جا کر تو اپنی بزرگی کے ڈھول پیٹ سکتا ہے اور لوگ اسکے معتقد بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک آدمی کے اپنے محلے اور بستی کے لوگ جن کے سامنے اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر ادھیڑ عمر تک زندگی بسر کی ہو۔ وہ اس وقت تک اس بات کے قائل نہیں ہو سکتے، کہ یہ واقعی اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے جب تک کہ انہوں نے اس کی پاکیزہ ترین زندگی نہ دیکھی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں نے چونکہ آپؐ کو نہایت درجہ بلند اخلاق پایا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس بات کا یقین کر لیا کہ حضورؐ جو نبوت کا دعوےٰ کر رہے ہیں وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ اس کردار اور سیرت کے آدمی کو یقیناً اللہ کا نبی ہی ہونا چاہیئے۔

دعوت اور کردار میں کوئی بُعد نہ تھا۔

اب آپ حضورؐ کے طرزِ عمل کو دیکھئے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنانِ اسلام کی بُرائیوں پر تنقید فرماتے تھے۔ جن عیوب میں وہ معاشرہ مبتلا تھا ان میں سے ایک ایک عیب پر حضورؐ گرفت فرماتے تھے اور لوگوں کو بھلائی کی تلقین کرتے تھے لیکن یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کے لئے جو لوگ کھڑے ہوئے تھے ان میں سے کسی شخص نے کبھی اُٹھ کر یہ نہیں کہا کہ جناب آپ جن برائیوں سے ہمیں روک رہے ہیں وہ تو خود آپؐ کی زندگی میں پائی جاتی ہیں، یا جن بھلائیوں کی طرف آپؐ ہمیں دعوت دے رہے ہیں، اس پر خود آپؐ کا عمل نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں بلکہ ——— آپؐ کے بلند کریکٹر کا آپ کے دشمنوں پر جس قدر اثر تھا، اس کا اندازہ صرف ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے، اگرچہ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں مگر میں نمونے کے طور پر صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

دعوت کو مسترد کرنے والے بھی کردار کے سامنے بے بس تھے

سب کو معلوم ہے کہ مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دشمن ابوجہل تھا۔ ایک مرتبہ حضورؐ حرمِ مکہ کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف سردارانِ قریش محفل لگائے بیٹھے تھے۔ اتنے میں مکے سے باہر کا، کسی دوسرے قبیلے کا آدمی فریاد کرتا ہوا ان سردارانِ قریش کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرا اونٹ ابوجہل نے خریدا ہے مگر اب قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔ میں باہر کا آدمی ہوں اور میرا یہاں کوئی بھائی بند نہیں ہے آپ لوگ میری فریاد سنیں اور میرے اونٹ کی قیمت مجھے دلوائیں۔ سردارانِ قریش نے ازراہ مذاق اس شخص سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ سامنے جو صاحب تشریف رکھتے ہیں ان کے پاس جاؤ وہ تمہاری رقم تمہیں دلوا دیں گے۔ وہ شخص ناواقف تھا سیدھا آپؐ کے پاس گیا اور جا کر مدعا عرض کیا۔ اب سردارانِ قریش یہ دیکھنا چاہتے

تھے کہ حضورؐ اس پر کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضورؐ اٹھے اور اس شخص کو ساتھ لے کر ابوجہل کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سردارانِ قریش نے ایک آدمی پیچھے پیچھے روانہ کیا تاکہ وہ یہ دیکھے کہ کیا واقعہ پیش آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاکر ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا ـــــ جب وہ باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سامنے کھڑے ہیں۔ آپؐ نے اس سے کہا کہ تم نے اس شخص سے اونٹ خریدا تھا لیکن اب اس کی قیمت دینے میں اسے بلا وجہ تنگ کر رہے ہو، اس کی قیمت ادا کر دو۔ ابوجہل سیدھا گھر گیا اور واپس آکر اس شخص کو اس کے اونٹ کی قیمت ادا کر دی ـــــ آپ اندازہ کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار اور شخصیت کا کتنا زبردست اثر اس شخص پر تھا جو آپ کا بدترین مخالف تھا۔ کوئی شخص مکے میں یہ ہمت نہیں رکھتا تھا کہ ابوجہل کو جاکر ٹوک سکتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاکر اسے ٹوکا۔ اور ایک مظلوم کا حق اُسے دلوایا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپؐ کے مخالفین بھی آپؐ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اگر آپ کی زندگی میں کوئی ذرہ برابر جھول یا داغ ہوتا تو ابوجہل جیسا آپ کا بدترین دشمن اس کی طرف اشارہ کئے بغیر نہ رہتا، لیکن وہاں تو کوئی داغ تھا ہی نہیں ـــــ!

اب اس کے بعد آپ مدینہ طیبہ کی زندگی کو ملاحظہ کیجئے!

پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک مثال

انسان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دس سال اس حیثیت میں زندگی بسر کی ہے کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ تمہارے لئے بہترین نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

(تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے۔)

یہ تو کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک معاشرے میں اور ایک پورے ملک میں لوگوں سے یہ بات کہہ دی جائے کہ یہ شخص تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی کو کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دیا تھا۔ آپؐ کی کوئی چیز پرائیویٹ نہیں تھی۔ سب کچھ پبلک تھا۔ لوگوں کو ہر وقت اس بات کی اجازت تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود آپ کی زندگی کو دیکھیں آپؐ کے اقوال کو سنیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ آپؐ کے افعال کو دیکھیں اور لوگوں تک پہنچائیں بلکہ ان کو یہ بھی اجازت تھی کہ وہ ازواج مطہراتؓ سے آپؐ کی نجی زندگی کے متعلق بھی معلومات حاصل کریں ـــــ اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک ہستی پورے دس سال تک اس طرح عوام کے سامنے ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی پہلو بھی ان سے چھپا ہوا نہیں ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے رسولؐ کے سوا کوئی انسان اس آزمائش (TEST) پر پورا نہیں اتر سکتا۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو اس آزمائش کے لئے پیش نہیں کر سکتا کہ ہر وقت ہر پہلو سے اس کا جائزہ لے کر دیکھا جائے اور پھر کسی پہلو سے اس کے اندر کوئی عیب، کوئی نقص کوئی خامی اور کوئی کمزوری نہ پائی جائے۔ نہ صرف یہ کہ کہیں نقص نہ ہو۔ بلکہ یہ کہ اُسے جس پہلو سے بھی دیکھا جائے وہ اس پہلو سے کامل درجے کا آدمی ہو۔ اور اسکے متعلق فی الواقع لوگ اس بات کو تسلیم کر لیں کہ ہاں یہی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے ـــــ یہ مقام پوری انسانی تاریخ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔

حضورؐ کی گھر کی زندگی کو دیکھئے تو بہترین شوہر اور بہترین باپ ہیں۔ باہر کی زندگی کو دیکھئے تو بہترین دوست اور بہترین ہمسائے ہیں۔ معاملات میں جس کو بھی آپ سے معاملہ پیش آیا ہے۔ اس نے آپ کو کھرا پایا ہے۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں تو بے لاگ انصاف کیا ہے۔ غم بھی پیش آیا ہے خوشی بھی دیکھی ہے۔ غصہ بھی آیا ہے اور محبت بھی کی ہے لیکن کسی حالت میں حضورؐ کی زبان مبارک سے کسی شخص

نے کوئی کلمہ حق کے خلاف کبھی نہیں سُنا۔ دس سال تک لوگ ہر وقت اور ہر آن آپ کی باتیں سُنتے رہے اور دنیا کے سامنے انہیں پہنچاتے رہے لیکن آپؐ کی زبان سے کبھی کوئی بات حق کے خلاف نقل نہیں کی گئی حتیٰ کہ غصے میں بھی کسی کے لئے بُرے الفاظ زبان پر نہ آئے۔ یہ شان کسی معمولی انسان کی نہیں ہو سکتی۔

جسے دُشمنوں نے بھی دوست پایا

اس کے ساتھ آپ یہ بھی دیکھئے کہ آپؐ کو بد ترین دشمنوں سے جنگ بھی کرنا پڑی ہے لیکن آپؐ نے دشمنوں کے ساتھ بھی ہمیشہ انصاف ہی کیا ہے۔ اور انصاف ہی نہیں بلکہ رحم بھی کیا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو آپؐ کے سامنے وہ دُشمن دست بستہ سر جھکائے کھڑے تھے جنہوں نے تیرہ سال تک مکے میں آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اور ہجرت کے بعد مدینے میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ یہ کہ اُن سب کو معاف کر دیا اور فرمایا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ـــــ یعنی آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا چنانچہ کسی شخص کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ بجز اس کے کہ جس سے کوئی جنگی جرم ثابت ہوا۔ اس طرح گنتی کے چند آدمی ایسے نکلے کہ جن سے جنگی جرائم ثابت تھے، باقی سب کو معاف کر دیا۔

ایفائے عہد کی تعلیم

حضورؐ کے ایفائے عہد کا یہ حال تھا کہ جن لوگوں نے ہمیشہ آپؐ کے ساتھ بدعہدیاں کی تھیں ان کے ساتھ بھی آپ نے جواب میں کوئی بدعہدی نہیں کی۔ آپؐ کا کوئی دشمن بھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگا سکا کہ آپ نے کبھی عہد کی خلاف ورزی کی ہے

معاہدات کی پابندی کا یہ حال ہے کہ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اگر مکہ معظمہ سے کوئی شخص مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجائے تو آپؐ اس کو مکے واپس کر دیں گے لیکن مدینے سے بھاگ کر اگر کوئی شخص مکے آجائے تو قریش اس کو واپس نہیں کریں گے۔ جب یہ شرط طے ہو چکی تھی۔ تو حضرت ابو جندلؓ

مکے سے بھاگ کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ حال یہ تھا کہ ان کا سارا جسم زخمی ہو رہا تھا، بھاری بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ لیکن مجھ پر سخت مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ خدارا مجھے کفار کے چنگل سے چھڑائیے۔ حضورؐ نے فرمایا بھائی معاہدہ طے ہو چکا ہے اس لئے اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ غور کیجئے کہ چودہ سو مردانِ جنگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور سب کے سب تلوار بند تھے۔ آپؐ کے ایک اشارے پر حضرت ابو جندلؓ کو چھڑایا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ معاہدے کی شرائط طے ہو چکی تھیں اس لئے آپؐ نے اس معاہدے کے احترام میں صاف انکار کر دیا اور انہیں اسی حالت میں واپس بھیج دیا۔ اس سے بڑھ کر وفائے عہد کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔

رہبر کامل

غرض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے جس دور کو بھی دیکھا جائے۔ آپؐ اس دور کے ایک مردِ کامل نظر آتے ہیں۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس انسانیت کا بلند ترین نمونہ تھی۔ جس کو جس پہلو سے بھی دیکھئے کوئی داغ اور کوئی خامی نظر نہیں آتی ——— یہی وہ چیز ہے جس سے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ حضورؐ اللہ کے رسولؐ تھے اور ہمارے لئے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد رہبر۔ انسان کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے سکتا اور نہ اس کی پیروی اطمینان سے قبول کر سکتا ہے۔ جب تک کہ اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ شخص ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد کریکٹر کا آدمی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی انسان پوری انسانی تاریخ میں ایسا نظر نہیں آتا کہ جو اس درجہ مکمل اور قابلِ اعتماد سیرت و کردار کا مالک ہو۔ اس وجہ سے حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسی شخصیت جس کو انسانیت کا رہبرِ کامل مانا جائے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کے سوا کوئی نہیں۔ اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام کے متعلق ہم کو یہ یقین بھی رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ہی کی بدولت حاصل ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ کیوں کہ جن دوسری کتابوں میں ان کا ذکر آیا ہے ان کی موجودہ حالت میں ان کی حقیقی شخصیتوں کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہے اور ان کے اخلاق و کردار کا غلط نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

علاوہ بریں ان انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا کوئی ریکارڈ آج محفوظ نہیں ہے کہ ان کی پیروی کی جا سکے۔ ہم ان پر ایمان تو رکھتے ہیں، مگر چونکہ ان کی زندگی کا صحیح ریکارڈ محفوظ نہیں ہے اس لئے ان سے رہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جن کی زندگی کے متعلق اتنا مکمل اور مفصل ریکارڈ محفوظ ہے کہ ہم زندگی کے ہر پہلو میں آپؐ کی زندگی سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق حضورؐ نے رہنمائی نہ دی ہو اور صحابہ کرامؓ نے اسے محفوظ نہ کر لیا ہو۔ شخصی زندگی ہو کہ خاندانی، تجارت ہو کہ حکومت، امن ہو کہ جنگ غرض زندگی کے جس پہلو سے آپ دیکھئے ہر پہلو میں مکمل رہنمائی موجود ہے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحاظ سے ایک کامل رہبر تھے، نہایت قابلِ اعتماد سیرت کے مالک، اور آپ کی زندگی میں انسانیت کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی کے ہوتے ہوئے بھی دوسروں لوگوں کو اپنا رہبر مانتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے۔ تو میں کہوں گا کہ وہ بیچارہ اندھا ہے اس کو نظر نہیں آتا کہ روشنی کدھر ہے۔ ایک طرف اس کے سامنے رہنمائی کے لئے بہترین رہنما موجود ہے اور دوسری طرف وہ ان لوگوں کے پیچھے چل رہا ہے کہ جن کے متعلق وہ خود بھی جانتا ہے کہ ان کی زندگی ہزار عیبوں سے پُر ہے۔ بالفرض اگر کسی شخص کی زندگی کا کوئی ایک پہلو اعلیٰ درجے کا ہو بھی تو دوسرے پہلوؤں میں وہ انتہائی ناقص ہے اور اس قابل نہیں کہ رہنمائی کے لئے اسے دیکھا جائے۔

حضرات!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد و محاسن تو اتنے ہیں کہ گویا ایک بحرِ ذخار

ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہمارا کام حضورؐ کو صرف خراجِ تحسین پیش کرنا نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بھی باعث اجر چیز ہے بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم فی الواقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں اور آپؐ کے اسوہ حسنہ پر چلیں ہمارا صحیح خراجِ تحسین حضورؐ کی پیروی میں ہے ؎۔ (ہفت روزہ آئین ۱۴ مئی ۱۹۷۰ء)

؎ شامِ ہمدرد، مئی ۱۹۷۰ء (تذکارِ محمدؐ) کے زیرِ عنوان ہوٹل انٹر کانٹیننٹل میں تقریر فرمائی۔

حصّہ دوم

افادات

• شاہ ولی اللہ صاحبؒ

از

• حجۃ اللہ البالغہ

ترجمہ

• سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

توحید اور شرک

توحید

توحید کا اعتقاد، خیرو اصلاح کی جڑ اور تمام اقسام خیرات کی اصل ہے۔ اس لیے کہ انسان میں رب العالمین کی خالص بندگی اسی سے پیدا ہوتی ہے، اور بندگی کا خلوص وہ چیز ہے جو کسب سعادت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اور تکمیل انسانیت کی تدابیر میں سب سے زیادہ مفید تدبیر علمی کی اصل ہے، اور اسی سے انسان کو غیب کی طرف توجہ عام حاصل ہوتی ہے اور اس کا نفس پاکیزہ ترین صورت سے عالم علوی کی طرف ترقی کرنے کے لیے مستعد ہو جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت جتانے کے لیے فرمایا ہے کہ جو حیثیت انسان کے جسم میں قلب کی ہے کہ اس کے بگڑنے سے سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور اس کے سنورنے سے سارا جسم سنور جاتا ہے وہی حیثیت انواع خیرات میں توحید کی ہے کہ وہ جس قدر زیادہ خالص اور صحیح اور مضبوط ہوگی اسی قدر انسان صداقت اور نیکی کے راستہ پر مستقیم ہوگا۔ جو شخص اس حال میں دنیا سے رخصت ہو کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھیراتا تھا، اس کے حق میں سرکار رسالتمآبؐ نے بر سبیل اطلاق فرمایا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوگا، اللہ نے اس پر آگ حرام کر دی اسے جنت سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ نے حکایۃً بیان فرمایا ہے کہ جو شخص میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو وہ اگر گناہوں کا انبار لیے ہوئے بھی مجھ سے ملے گا تو میں اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا۔

توحید کے چار مرتبے ہیں، ایک یہ کہ وجوب وجود کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص مانا جائے اور اس کے سوا کسی کو واجب الوجود نہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ ہی

کو آسمانوں اور زمینوں اور تمام جو اہر کا خالق مانا جائے، یہ دو مرتبے تو ایسے ہیں جن پر آسمانی کتابوں میں بحث کرنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی، اس لیے کہ یہود و نصاریٰ تو درکنار مشرکین عرب کو بھی ان سے اختلاف نہ تھا۔ قرآن حکیم تصریح کرتا ہے کہ یہ مقدمات اُن کے نزدیک بھی مسلّم تھے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶)

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶)

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مرجانے کے بعد پھر زندگی بخشی تو وہ ضرور کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (الزخرف:)

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے تم کو پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تدبیر بھی صرف اللہ تعالیٰ سے متعلق سمجھی جائے اور چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق نہ ٹھیرایا جائے۔ یہ دونوں مرتبے باہم متلازم ہیں، اور ان کے درمیان ایسا طبیعی رابطہ ہے کہ جو تیسرے مرتبہ کو مانے گا وہی چوتھے مرتبہ میں بھی ثابت اور مستقیم ہوگا۔ اختلاف جو کچھ ہوا ہے انہی مرتبوں میں ہوا ہے، اور اختلاف کرنے والے بے شمار فرقوں میں تین فرقے سب سے بڑے ہیں۔

کواکب پرست اس طرف گئے کہ تارے اور سیارے عبادت کے مستحق ہیں، اور دنیا میں ان کی عبادت نفع بخش ہے، اور حاجات کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ تحقیق ہو گیا ہے کہ رات دن کے حوادث اور انسان کی سعادت و شقاوت اور صحت و سقم میں ان کا اثر بہت بڑا ہے، اور وہ مجرد ذی عقل نفوس رکھتے ہیں جو ان کو حرکت دے رہے ہیں، اور وہ اپنے عبادت گزاروں سے غفلت نہیں کرتے۔ انہی اعتقادات کی بنا پر انہوں نے کواکب کے لیے ہیکل بنائے اور ان کی پرستش کی۔

مشرکین اس حد تک تو مسلمانوں سے متفق ہیں کہ بڑے بڑے امور کی تدبیر اللہ ہی کرتا ہے اور فیصلے اسی کے اختیار میں ہیں اور کسی غیر کے لیے اختیار کلی نہیں ہے، مگر ان کا گمان یہ ہے کہ اُن سے پہلے جو صالحین گذرے ہیں انہوں نے اللہ کی بندگی و عبادت کر کے اس کے ہاں ایسا تقرب حاصل کر لیا کہ اللہ نے ان کو الوہیت عطا کر دی اور وہ دوسرے بندگان خدا کی پرستش کے مستحق ہو گئے۔ گویا ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص شہنشاہ کی خدمت بڑی عمدگی سے بجالائے یہاں تک کہ شہنشاہ اس کو خلعت پادشاہی عطا کر دے اور اپنی مملکت کے کسی حصہ کی تدبیر اس کے سپرد کر دے۔ اب چونکہ وہ شہنشاہ کا مقرر کیا ہوا فرمانروا ہے اس لیے اس حصہ کے رہنے والوں پر اس کی بندگی واجب ہے۔ اسی تخیل کے تحت وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک کہ ان بزرگوں کی عبادت بھی اس کے ساتھ شامل نہ ہو، بلکہ بعض لوگ تو اس حد تک بڑھ گئے کہ حق تعالیٰ ہم سے اس قدر بلند و برتر ہے کہ کسی عبادت سے ہم اس تک تقرب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ناگزیر ہے کہ جو اس سے تقرب حاصل کر چکے ہیں ان کی جناب میں رسائی پیدا کر لی جائے ان کا خیال یہ ہے کہ بزرگ سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، اپنے پرستاروں کی سفارشیں کرتے ہیں، ان کی حاجت روائی اور نصرت و اعانت کرتے ہیں، اور معاملات کی تدبیر انہی سے متعلق ہے۔ اسی خیال سے انہوں نے پتھروں کی مورتیں ان کے نام پر بنائیں اور ان بزرگوں کی ارواح کی طرف توجہ کرنے کے لیے ان مادّی صورتوں کو وسیلہ بنایا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ان بتوں ہی کو اصل سمجھنے لگے اور خود انہی کو معبود اور حاجت روا قرار دے بیٹھے۔

نصاریٰ اس طرف گئے کہ مسیح علیہ السلام کو اللہ سے ایسا تقرب اور حق پر اتنا علو حاصل ہے کہ ان کو بندہ قرار دینا اور دوسرے بندوں کے برابر کر دینا درست نہیں اس لیے کہ یہ ان کے ساتھ بے ادبی اور ان کے تقرب من اللہ کا ابطال ہے۔ پھر اس تخیل میں وہ آگے بڑھے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے مسیح کی اس خصوصیت کو تعبیر کرنے کے لیے "ابن اللہ" کا لفظ پسند کیا، اس اعتبار سے کہ باپ اپنے بیٹے پر خاص نظر عنایت رکھتا ہے اور اپنی آنکھوں میں رکھ کر اس کی تربیت کرتا ہے اور اس کا مرتبہ غلاموں سے برتر ہوتا ہے۔ اور

بعض لوگوں نے ان کے لیے "اللہ" کا نام زیادہ مناسب سمجھا کیوں کہ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ اُن کے اندر حلول کر گیا تھا اور اسی بنا پر ان سے وہ آثار ظاہر ہوتے تھے جو کبھی کسی بشر سے ظاہر نہیں ہوئے مثلاً مردوں کو زندہ کرنا اور پرندوں کو پیدا کرنا۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ مسیح کا کلام خدا کا کلام ہے اور ان کی عبادت خدا ہی کی عبادت ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے وجہ تسمیہ کو فراموش کر دیا اور "بیٹے" کے لفظ کو حقیقی معنوں میں لینے لگے یا یہ سمجھ بیٹھے کہ مسیح من جمیع الوجوہ واجب تعالےٰ ہیں۔

ان تینوں فرقوں کے پاس بہت لمبے چوڑے دعوے اور عجیب عجیب خرافات ہیں جو جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور چونکہ توحید کے اعلیٰ آخری مدارج مراتب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ تمام گمراہیاں پیدا ہوئیں اس لیے قرآن عظیم نے تمام تر انہی سے بحث کی اور کافروں کے ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے۔

حقیقت شرک

سب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ عبادت سے مراد انتہا درجہ کا تذلل ہے۔ اور کسی تذلل کا دوسرے تذلل کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہونا دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ بلحاظ صورت ظاہری ہوگا مثلاً ایک تذلل بصورت قیام ہو اور دوسرا بصورت سجود۔ یا پھر وہ نیت کے لحاظ سے ہوگا مثلاً یہ کہ ایک فعل میں اس تعظیم کی نیت کی جائے جو بندے اپنے مولیٰ کی کرتے ہیں اور دوسرے فعل میں اس تعظیم کی نیت جو رعیت اپنے بادشاہ کی کرتی ہے اور تیسرے فعل میں وہ تعظیم مقصود ہو جو شاگرد اپنے استاد کی کرتے ہیں۔ ان دو شقوں کے سوا کوئی تیسری شق نہیں ہے۔ پھر جب یہ ثابت ہے کہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو اور برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا، اور سجدہ، تعظیم کی صورتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کی صورت ہے تو لازم آیا کہ مدارج کا یہ امتیاز دراصل نیت ہی کی بنا پر ہو۔ لیکن دراصل یہ معاملہ تنقیح کا طالب ہے، لہٰذا اب ہم اس کی تنقیح کرتے ہیں۔

تذلل کی حقیقت پر غور کرو۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو شخص کسی کے مقابلہ میں تذلل اختیار کرتا ہے وہ اپنے اندر ضعف اور اس کے اندر قوت دیکھتا ہے۔ اپنے میں خست اور

اس میں شرف پاتا ہے ۔ اپنے اندر انقیاد اور تخشّع پیدا کرتا ہے اور اس کے اندر تسخیر و نفاذ حکم کی طاقت تسلیم کرتا ہے پس تذلل کی حقیقت بس یہی ہے کہ وہ قوت کے مقابلہ میں انقیاد و تخشّع ہے ۔ اب دیکھو کہ قوت اور شرف اور تسخیر اور ایسے ہی دوسرے کمالات کے متعلق انسان کے تصورات کیا ہیں ۔ وہ اپنے اندر لامحالہ اس امر کا ادراک پاتا ہے کہ ان سب کمالات کے دو مرتبے ہیں ۔ ایک مرتبہ تو وہ ہے جو انسان کے لائق ہے یا ان چیزوں کے لائق ہے جو انسان کی طرح اس عالم حدوث و امکان میں ہیں ۔ اور دوسرا مرتبہ یا تو اس ہستی کے لائق ہے جو حدوث و امکان سے بالکلیہ بالاتر ہو ، یا پھر اُس کو حاصل ہو سکتا ہے جس کی طرف اس بالا و برتر ہستی کی کچھ خصوصیات منتقل ہو گئی ہوں ۔ یہ مثال کے طور پر غیب کے علم کو لے لو ۔ انسان اس کے دو درجوں میں صاف طور پر امتیاز کرتا ہے ۔ ایک درجہ کا علم غیب وہ ہے جو فکر و نظر اور ترتیب مقدمات سے یا حدس سے یا خواب کی حالت میں یا بہرحال کسی ذریعہ اور واسطہ سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور دوسرے درجہ کا علم ، علم ذاتی ہے ، یعنی ایسا علم جو ذاتِ عالم کا مقتضا ہو ، نہ یہ کہ وہ ایسے کسی دوسرے سے حاصل کرے یا اس کے اکتساب کے لیے کوشش کرے ۔ اسی طرح تاثیر اور تدبیر اور تسخیر ، غرض جو لفظ بھی اس معنی کے لیے تم بولو گے ، اس کے بھی دو الگ الگ درجوں کا انسان کو ادراک ہوتا ہے ۔ ایک درجہ وہ ، جو مباشرت کے معنی میں ہے ؛ جوارح اور قوتوں کے استعمال سے اور کیفیات مزاجیہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے اور جس کی استعداد کسی نہ کسی طور پر انسان اپنے اندر پاتا ہے ۔ اور دوسرا درجہ وہ ، جو تکوین کے معنی میں ہے یعنی ایسی تدبیر و تاثیر جو کسی چیز سے مدد لیے بغیر ، کسی کیفیت جسمانیہ کے توسط کے بغیر ، محض مؤثر و مدبر کے ارادہ کے تحت حاصل ہو ۔ اسی کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ، یعنی اللہ کا کام اس طرح ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتا ہے ۔ یہی حال شرف اور عظمت اور قوت کا ہے ۔ انسان اس کے بھی دو مختلف درجوں میں لامحالہ تمیز کرتا ہے ۔ ایک درجہ ایسی عظمت اور بزرگی کا ہے جیسی بادشاہ کو رعیت کے مقابلہ میں اور پہلوان کو کمزور کے مقابلہ میں اور استاد کو شاگرد کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے کہ ان سب کا

مرجع اسباب و ذرائع کی طرف ہے، اور اصل شئے کے اعتبار سے ہر انسان اپنے آپ کو اس کے لائق پاتا ہے۔ اور دوسرا درجہ وہ ہے جو بجز ایسی ہستی کے کسی میں نہیں پایا جاتا جو بہت ہی بالا و برتر ہو۔

غرض اس راز کی تفتیش میں تم آگے بڑھتے چلے جاؤ یہاں تک کہ تم کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ جو شخص بھی سلسلۂ امکان کا ایک ایسی ہستی پر ختم ہونا تسلیم کرتا ہے جو غیر کی محتاج نہ ہو، وہ اضطراری طور پر یہاں تمام صفات کمالیہ وجدیہ کو دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ درجہ جو اس ہستی کے لیے اور دوسرا وہ درجہ جو انسان اور اس کے مرتبہ کی ہستیوں کے لیے ہے۔ اب دیکھو کہ غلطی کہاں واقع ہوتی ہے۔ اوّل تو ان دونوں درجوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ باہم متقارب ہیں اس لیے آسمانی کتابوں کے نصوص کو اکثر غلط معنی پر محمول کرنے کا موقع نکل آتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ جب کبھی کسی انسان یا روح یا فرشتے سے کسی ایسے امر کے صدور پر انسان مطلع ہوتا ہے جس کو وہ اُس جیسی ہستی سے مستبعد سمجھتا ہو تو وہ پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور جہالت کی بنا پر اُس کی طرف خدائی بزرگی اور آلہی تسخیر کی نسبت دینے لگتا ہے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ بالاتر درجہ کی معرفت میں سب لوگ یکساں نہیں ہیں ایک شخص ان انوار کی قوت سے جو موالید پر محیط اور غالب ہیں حقائق پر چھا جاتا ہے اور انہیں ٹھیک ٹھیک پہچان لیتا ہے، مگر دوسرا شخص اتنی قوت نہیں رکھتا۔ تکلیف جو کچھ بھی ہے انسان کی استطاعت کے لحاظ سے ہے، لہٰذا جو شخص زیادہ بڑے درجہ کی معرفت پر قادر نہیں وہ اس کے لیے مکلف بھی نہیں۔ یہی تاویل ہے اس حکایت کی جو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ ایک بندۂ خدا نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کے خوف سے اپنے گھر والوں کو وصیت کی تھی کہ جب وہ مر جائے تو اسے جلا دیں اور اس کی راکھ کچھ پانی میں بہا دیں اور کچھ ہوا میں اڑا دیں تاکہ وہ بعث بعد الموت سے بچ جائے۔ یہ شخص یقین رکھتا تھا کہ اللہ تعالےٰ قدرت تامہ سے متصف تو ضرور ہے مگر قدرت ممکنات میں ہے نہ کہ ممتنعات میں اور اس کا گمان یہ تھا کہ جو راکھ پانی اور ہوا میں منتشر ہو چکی ہے اس کو جمع کرنا ممتنع ہے۔ اس کا یہ خیال اگرچہ حقیقت کے

لحاظ سے غلط تھا، مگر اس کو کافر نہیں قرار دیا گیا، کیونکہ قصور دراصل اس کی فہم کا تھا۔ اور اس پر جو کچھ بھی محاسبہ ہوتا تھا اس کی استعداد علمی ہی کے لحاظ سے ہوتا تھا۔

انہی وجوہ سے اللہ تعالیٰ کو بندوں سے تشبیہ دینے، اور بندوں کو خدا کے درجہ میں لے جانے کی غلطی پیش آئی ہے۔ کہیں خدا کی طرف ایسے نقائص اور عیوب منسوب کیے گئے جو دراصل مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہیں۔ کہیں نجوم و کواکب کو ایسی صفات سے متصف ٹھیرایا گیا جو خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ اور کہیں اللہ کے صالح بندوں کو خدائی کا درجہ دیا گیا محض اس لیے کہ ان سے خوارقِ عادات اور کشف اور استجابت دعاء کا ظہور ہوا تھا۔ ہر نبی جو کسی قوم میں مبعوث ہوا، اس کا کام یہی تھا کہ لوگوں کو شرک باللہ کی حقیقت سمجھائے اور دونوں درجوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دے اور توحید کی اس طرح تعلیم دے کہ درجہ مقدسہ واضح طور پر الگ ہو کر واجب تعالیٰ کی ذات میں محصور کر دیا جائے، اگرچہ الفاظ باہم متقارب ہی کیوں نہ رہیں، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طبیب سے فرمایا کہ تو محض رفیق ہے۔ اصل طبیب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مگر جب وہ نبی گذر گیا اور اس کے اصحاب اور اس کے دین کے حامل بھی رخصت ہو گئے تو اس کے بعد ناکارہ نسلیں اٹھیں جنھوں نے اللہ کی عبادت کو چھوڑ دیا اور شہوات کی پیروی شروع کر دی۔ یہ لوگ ان متشابہ الفاظ کو جو نصوص میں استعمال ہوئے تھے ایسے معنی پر محمول کرنے لگے جو دراصل ان سے مراد نہ تھے۔ مثلاً انہوں نے اس محبوبیت اور شفاعت کو جسے اللہ تعالیٰ نے تمام شرائع میں اپنے خاص بندوں کے لیے ثابت کیا ہے غلط معنوں میں لے لیا۔ اسی طرح انہوں نے خرق عادات اور اشراقات کے صدور کو اس امر پر محمول کیا کہ علم اور تسخیر کا وہ درجہ جو خدا کے لیے خاص ہے اس شخص کی طرف منتقل ہو گیا ہے جس سے ان کا صدور ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت ان سب چیزوں کا مرجع وہ ناسوتی یا روحانی قوتیں ہیں جو ایک طور سے تدبیرِ الٰہی کے نزول کا واسطہ بنتی ہیں۔ ایجاد اور خلق و تدبیر وغیرہ امور مختص باللہ میں ان کا ذرہ برابر کوئی دخل نہیں۔

اس مرض کے بیماروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں بعض تو وہ ہیں جو اللہ کے جلال کو بالکل ہی بھول چکے ہیں اور خدا شناسی سے کچھ ایسے بیگانہ ہوئے ہیں کہ بس شرکاء ہی کی عبادت کرتے

ہیں اور انہی کی طرف اپنی حاجتیں لے جاتے ہیں، اور اللہ کی طرف اصلاً کوئی توجہ نہیں کرتے اگرچہ نظری حیثیت سے یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ سلسلۂ وجود کی انتہا اللہ ہی کی ذات پر ہوتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کا اعتقاد یہ ہے کہ سردار اکبر اور مدبر اعلیٰ تو اللہ ہی ہے مگر وہ اپنے کسی مقرب بندے کو شرف اور الوہیت کی خلعت سے سرفراز کر دیتا ہے، اور اسے بعض خاص امور میں تصرف کے اختیارات بخش دیتا ہے، اور اپنے بندوں کے حق میں اس کی سفارشیں سنتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صورت معاملہ قریب قریب ایسی ہے جیسے ایک شہنشاہ اپنی سلطنت کے ایک ایک خطہ میں ایک ایک چھوٹا بادشاہ مقرر کرتا ہے اور بڑے بڑے معاملات کو اپنے لیے مخصوص کر کے باقی معاملات کی تدبیر ان چھوٹے بادشاہوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ لوگ جس بندۂ خدا کے متعلق اس طرح کے اعتقادات اپنے دل میں قائم کر لیتے ہیں اس کو خدا کا بندہ کہتے ہوئے ان کی زبانیں رکتی ہیں، کیوں کہ اسے عام بندوں کے ساتھ مساوی کر دینے کو وہ اس کی اہانت سمجھتے ہیں۔ یہی خیال ہے جس کی بنا پر انہوں نے کسی کو ابن اللہ اور کسی کو محبوب الٰہی کے ناموں سے موسوم کیا اور اپنے آپ کو ان بندوں کا بندہ قرار دیا اور اپنے نام عبدالمسیح اور عبدالعزیٰ وغیرہ رکھے۔ یہی مرض ہے جس میں عام طور پر یہود و نصاریٰ اور مشرکین مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں آج کل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض منافقین مبتلا نظر آتے ہیں۔

چونکہ شریعت کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس چیز میں برائی کا گمان ہو اس کو اصل برائی کے مانند سمجھا جاتا ہے اور اصل برائی ہی کی طرح اس کی ممانعت کی جاتی ہے، اس لیے ہر اس عمل کو کفر قرار دیا گیا ہے جس کی محسوس صورت مشرکین کے عمل سے ملتی جلتی ہو اور جس میں شرک کا مظنہ پایا جاتا ہو چاہے اس میں درحقیقت شرک کی نیت نہ ہو۔ مثال کے طور پر بتوں کے سامنے سجدہ کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا کفر ہے، اگرچہ ان افعال کا فاعل اپنے دل میں توحید کا قائل اور نیت کفر سے بالکل پاک ہی کیوں نہ ہو۔ اس علم کا دروازہ مجھ پر اس وقت کھلا جب مجھے بتایا گیا کہ بعض لوگ ایک قسم کی مکھی کو سجدہ کرتے ہیں جو زہریلی ہے اور اپنی دم اور پروں کو ہر وقت حرکت دیتی رہتی ہے۔ میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ

فی الواقع کیا ان کے اندر شرک کی تاریکی موجود ہے، اور کیا گمراہی ان پر پوری طرح چھا گئی ہے؟
دل نے جواب دیا کہ نہیں تو ان میں یہ چیز نہیں پاتا کیونکہ یہ تو اس مٹی کو قبلہ بناتے ہیں اور تذلل
کے ایک درجہ کو دوسرے درجہ سے خلط ملط نہیں کرتے۔ اس کے بعد اصل راز کی طرف مجھے
ہدایت بخشی گئی اور میرا دل اس علم سے بھر دیا گیا کہ شریعت نے اصل شرک کی طرح مظنۂ شرک
کو بھی حرام قرار دیا ہے، اور عبادت کی تمام ظاہری صورتوں کو بھی اصل عبادت کی طرح
خدا کے لیے خاص کر دینے کا حکم دیا ہے، تاکہ لوگ صورت شرک سے حقیقت شرک تک پہنچ
جانے کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں۔

اقسام شرک

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی بزرگ شخص کے متعلق یہ اعتقاد رکھے کہ اس سے جو
آثار عجیبہ کا صدور ہوا ہے، وہ دراصل اس بنا پر اس سے صادر ہوئے ہیں کہ وہ اُن صفات کمالیہ
میں سے کسی صفت سے متصف ہو گیا ہے جو انسان کے لیے سزاوار نہیں بلکہ حق جل مجدہ کے
لیے مختص ہیں، اور ذات حق کے سوا کسی اور میں نہیں پائی جا سکتیں الا یہ کہ خود حق تعالیٰ ہی
اپنے سوا کسی اور کو خلعتِ الوہیت سے سرفراز کر دے، یا اس کو اپنی ذات میں فنا کر کے اپنی
ذات سے باقی کر دے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے مزافات جن پر اس قسم کے اعتقادات رکھنے والے
ایمان لاتے ہیں سب کے سب شرک کی حقیقت میں داخل ہیں ....

.... مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ مشرکین اس طرح تلبیہ کرتے تھے کہ لبیک لبیک
لا شریک لک الا شریک ھو لک تملکہ وما ملک (لبیک لبیک، تیرا کوئی شریک نہیں
بجز اس شریک کے جو تیرا ہے اور تو مالک ہے اس کا بھی اور اُن چیزوں کا بھی جن کا وہ مالک
ہے)۔ اس طرح عرب کا مشرک خدا کے ساتھ ساتھ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریک کے سامنے بھی
انتہا درجہ کا تذلل پیش کرتا تھا اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتا تھا جو بندے اللہ تعالیٰ کے
ساتھ کرتے ہیں۔

شرک کی یہ روح بہت سے قالب اور طرح طرح کے پیکر اختیار کرتی ہے جن کا شمار
نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی تعلیم کا اصل مقصد روح شرک کو مٹانا ہے تاکہ وہ کوئی قالب اور کوئی پیکر

اختیار ہی نہ کر سکے۔ لیکن شریعت (یعنی قانون اسلام) چونکہ تدبیر کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اس لیے وہ خاص طور پر اس کے اُن قالبوں پر حملہ کرتی ہے جن کو عام طور پر لوگ شرک کی نیت سے اختیار کرتے رہے ہیں اور جن کا رابطہ رواج عام کی بدولت روح، شرک کے ساتھ ایسا قوی ہوگیا ہے کہ نیت شرک کے بغیر بھی اگر ان کو اختیار کیا جائے تو ان میں مظنۂ شرک ضرور ہے شریعت ایسی تمام عملی صورتوں کو حرام قرار دیتی ہے، کیونکہ یہ بات اس کے اصول میں سے ہے کہ وہ ہر چیز کی علت متلازمہ کو وہی حیثیت دیتی ہے جو خود اس چیز کی حیثیت ہو مصلحت کی علت متلازمہ خود مصلحت کے پہلو میں جگہ پائے گی، اور مفسدہ کی علتِ متلازمہ کو عین مفسدہ کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔

اب ہم تمہیں بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات میں کن کن امور کو مظنۂ شرک قرار دیکر ممنوع ٹھیرایا ہے۔

۱۔ مشرکین بتوں اور کواکب کے آگے سجدہ کرتے تھے۔ اس لیے حکم ہوا کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرو چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ: ۵)	نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ سجدہ کرو اس خدا کو جس نے ان کو پیدا کیا ہے

چونکہ سجدہ میں شرک کرنا تدبیر میں شرک کرنے کے ساتھ متلازم ہے اور ملا ہے اس لیے موخرالذکر سے بچانے کی خاطر مقدم الذکر کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ توحید عبادت دراصل اللہ تعالیٰ کے ان احکام میں سے ایک حکم ہے جو اختلاف ادیان و شرائع کے ساتھ ساتھ مختلف ہوتے رہے ہیں، اور جن کی بنا کسی دلیل برہانی پر نہیں ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالےٰ تخلیق و تدبیر میں اپنی یکتائی و لاشریکی کو بطور دلیل پیش کرکے مشرکین کو شرک فی العبادۃ پر ملزم نہ ٹھیراتا، جیسا کہ سورہ نمل کے پانچویں رکوع میں وہ ان کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ "بتاؤ" اللہ بہتر ہے یا تمہارے وہ معبود جن کو تم اس کا شریک ٹھیراتے ہو؟ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسا کر خوشنما باغ لگادیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ کون ہے جس نے زمین

کو جائے قرار بنایا اور اس میں نہریں جاری کیں اور اس کو ٹھیرانے کے لیے اٹل پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان حد فاصل لگا دی ؟ کیا اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی خدا ان کاموں میں شریک ہے ؟" یہ استدلال جو قرآن میں پیش کیا گیا ہے دراصل الزامی استدلال ہے۔ چونکہ مشرکین خود معترف تھے کہ تخلیق اور امور عظام کی تدبیر میں اللہ کا کوئی شریک نہیں، اور یہ بھی ان کو تسلیم تھا کہ عبادت ان دونوں چیزوں کے ساتھ متلازم ہے، اس لیے اللہ تعالےٰ نے خود انہی کے مسلمات سے ان پر حجت قائم کی اور ثابت کر دیا کہ عبادت میں غیر کو شریک کرنا دراصل تدبیر و تخلیق میں غیر کو شریک سمجھنے کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ رکھتا ہے یہ دونوں ایک دوسرے کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا ایک کو رد کرنے کے لیے دوسرے کو روکنا ضروری ہے۔
۲۔ مشرکین اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے روما نگتے تھے[1] کوئی بیمار ہوتا تو اُن سے دعا کرتے

---

[1] استعانت بغیر اللہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے عجیب عجیب دلائل پیش کیے جاتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح پیاس میں پانی سے استعانت کرنا اور مرض میں دوا سے استعانت کرنا شرک نہیں ہے اسی طرح اپنی حاجات اور اپنے مقاصد میں بزرگوں سے استعانت کرنا بھی شرک نہیں لیکن یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے اللہ تعالےٰ نے ہماری حاجات و ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے قانون فطرت کے تحت جو اسباب و وسائل پیدا مسببات کئے ہیں ان سے کام لینا اور ہر مقصد کیلئے ان اسباب کو استعمال کرنا جو سنت اللہ کے مطابق اس مقصد کے لیے مقرر کیے گئے ہیں یقیناً شرک نہیں بلکہ قانون الٰہی کا عین مقتضیٰ ہے۔ مگر اس سلسلہ اسباب و سے ہٹ کر اور قانون طبیعی کو نظر انداز کر کے بزرگوں کی ارواح کی طرف رجوع کرنا اس امید کے ساتھ کہ وہ فوق الطبیعی طریقہ سے تمہاری حاجت پوری کریں گے، یا تدبیر الٰہی کے ڈھنگ پر سلسلہ اسباب کو حرکت دیں گے یہ یقیناً شرک ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس مضمون کی ابتدا میں تسخیر و تدبیر اور تاثیر کے جن دو درجوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان پر غور کرنے سے اس طریق استدلال کی غلطی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ارواح اولیاء کو پہلے درجے میں صاحب تسخیر و تدبیر سمجھتا ہے تو وہ مشرک تو نہیں مگر اندھا اور غیر ذوی عقل ضرور ہے۔ اس لیے کہ وہ حضرات اس دنیا سے گذر چکے ہیں ان کا اس عالم مادی کے ساتھ تعلق باقی نہیں رہا ہے اور کوئی صاحب ہوش ان کو اس پہلے درجہ میں مدبر و موثر نہیں سمجھ سکتا۔ اور اگر کوئی شخص دوسرے درجہ یعنی درجہ عالیہ و مقدسہ میں ان کو موثر و مدبر مانتا ہے تو اس کے مشرک ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ ترجمان القرآن

کہ اسے اچھا کر دو۔ کوئی تنگ دست ہوتا تو ان سے التجا کرتا کہ مجھے مالدار بنا دو۔ کسی پر کوئی آفت آئی تو ان کو پکارتا کہ میری مدد کرو۔ وہ ان کے لیے نذر و نیاز کرتے اور توقع رکھتے تھے کہ ان نذروں اور نیازوں سے ان کے مقاصد حاصل ہوں گے۔ وہ ان کے نام جپتے اور امید رکھتے تھے کہ ان ناموں سے برکت حاصل ہوگی اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو ممنوع کر دیا اور حکم فرمایا کہ اپنی نمازوں میں بار بار اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْن (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) کا اعادہ کرتے رہو۔ نیز فرمایا کہ لَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو) اِس ارشاد میں دُعا سے مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بلکہ دراصل استعانت مراد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ اَغَیْرَ اللّٰہِ تَدْعُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِکُوْنَ (الانعام: ۴)

اے نبی ان سے کہو کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر آجائے یا قیامت آموجود ہو تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم سچے ہو؟ نہیں بلکہ تم خدا ہی کو پکارو گے، پھر اللہ چاہے گا تو اس آفت کو دور کر دے گا جس کے لیے تم اسے پکارو گے۔ اس وقت تم اِن معبودوں کو بھول جاؤ گے جن کو تم شریک ٹھیراتے ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (الحج: ۱۰)

خدا کو چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو، وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ سب کے سب مل کر ہی کیوں نہ کوشش کریں۔ اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ اس کو چھڑا بھی نہیں سکتے۔ طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب بھی اور جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ (الاعراف: ۲۴)

کرنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ فَادْعُوْھُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (الاعراف: ۲۴)

خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ یقیناً تم ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو اگر تم سچے ہو تو وہ تمہاری فریاد کو پہنچیں۔

۳۔ مشرکین اپنے بنائے ہوئے شریکوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے

اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا خواہ یہ تسمیہ حقیقی نہیں بلکہ مجازی معنوں ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس میں جو راز ہے اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔

۴. وہ اپنے احبار (علما) اور رھبان (مشائخ) کو اربابٌ من دون اللہ بناتے تھے، اس معنی میں کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جو کچھ انہوں نے حلال ٹھیرا دیا ہے وہ نفس الامر میں حلال ہے اور اس کے ارتکاب میں کوئی خرابی نہیں، اور جو کچھ انہوں نے حرام ٹھیرا دیا ہے وہ درحقیقت حرام ہے اور اس کے ارتکاب پر ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ قرآن میں اللہ تعالے نے اس کی مذمت فرمائی کہ اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم کے سوال پر خود اس آیت کی تشریح فرمائی تھی کہ یہود ونصاریٰ اپنے احبار ورہبان کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام مانتے تھے اور یہی ان کا شرک تھا۔ اس میں راز یہ ہے کہ تحلیل اور تحریم دراصل وہ تکوین ہے جو عالم ملکوت میں نافذ کی جاتی ہے کہ فلاں چیز پر مواخذہ کیا جائے گا اور فلاں چیز پر نہ کیا جائے گا پھر یہی تکوین سبب بن جاتی ہے مواخذہ اور ترک مواخذہ کا۔ اور یہ مخصوص ہے اللہ تعالے کے لیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو تحلیل و تحریم منسوب کی جاتی ہے۔ وہ تو اس معنی میں ہے کہ آپ کا حلال اور حرام قرار دینا اللہ کی تحلیل و تحریم پر قطعی الدلالت ہے۔ رہے امت محمدیہ کے مجتہدین تو ان کی تحلیل و تحریم اللہ کی تحلیل و تحریم پر قطعی الدلالت نہیں، بلکہ وہ صرف اس بنا پر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یا تو وہ معتبر ذریعہ سے نص شارع پیش کریں یا نصوص معتبرہ سے استدلال کر کے کوئی حکم مستنبط کریں۔ ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر مجرد کسی مجتہد کے قول کو حجت بنانا اور اس بنا پر کسی چیز کو حرام مان لینا دراصل ان مجتہدین کو ارباب من دون اللہ بنانا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالے جب کسی رسول کو بھیجے اور اس کی رسالت ثابت ہو جائے اور اس کے ذریعہ سے اللہ کسی ایسی چیز کو حلال ٹھیرائے جو لوگوں کے نزدیک حرام ہو پھر کوئی شخص اس حکم کو قبول کرنے میں اپنے اندر رکاوٹ محسوس کرے اور اس کے نفس میں اپنے سابق طریقہ کی وجہ سے اُس حلال کی حرمت کا خیال باقی رہ جائے تو اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ اس شریعت کے ثبوت ہی میں شک رکھتا ہو۔ اس صورت میں وہ کفر بالنبوت کا مرتکب ہوگا۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس چیز

کو وہ کسی انسان کے کہنے پر حرام سمجھتا ہے۔ اس کے متعلق اس کا اعتقاد یہ ہو کہ اس کی تحریم منسوخ نہیں ہو سکتی بدین وجہ کہ اللہ نے اپنے اس بندہ کو خلعت الوہیت سے سرفراز کر دیا تھا۔ اور وہ اللہ کی ذات میں فانی اور اس کی ذات سے باقی ہو گیا تھا، اور اس کا کسی چیز سے منع کرنا یا کراہیت کرنا دراصل اللہ کا فعل ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے میں جان و مال کے زیان کا خطرہ ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ اعتقاد ہو تو وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے اور غیر اللہ کے لیے وہ چیز ثابت کرتا ہے جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

۵۔ مشرکین اپنے بتوں اور اپنے معبود ستاروں سے تقرب حاصل کرنے کے لیے جانور ذبح کرتے تھے۔ اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو ذبح کرتے وقت ان کے نام لیے جاتے تھے۔ یا مخصوص قربان گاہوں پر قربانیاں کی جاتی تھیں[1] اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو بھی حرام کر دیا۔

۶۔ مشرکین اپنے معبودوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے[2] اللہ نے اس کو بھی حرام کیا۔

۷۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ بعض بزرگوں کے نام مبارک اور باعظمت ہیں، اور جو شخص ان کی جھوٹی قسم کھاتا ہے اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے ان کے نام کی قسم کھایا کرتے تھے اور اپنے جھگڑوں میں فریق مقابل سے ان کے نام پر حلف اٹھواتے تھے۔ اللہ نے اس کو بھی حرام ٹھیرایا اور اللہ کے نبی نے فرما دیا کہ جس نے خدا کے سوا کسی کی قسم کھائی اس نے خدا کے ساتھ شرک کیا۔ بعض محدثین نے اس کو تہدید و تغلیظ کے معنی پر محمول کیا ہے لیکن میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک

---

[1] بزرگوں کے نام سے کھانے کو منسوب کرنا، اور ان کے نام پر کھانا پکا کر اسے متبرک سمجھنا، اور خاص خاص مقامات پر جا کر نیازیں اور نذریں چڑھانا بھی کسی طرح مشرکین کے اس فعل سے مختلف نہیں ہے۔

[2] آج مسلمان بھی اس فعل کے مرتکب ہو رہے ہیں، چنانچہ دکن میں بزرگوں کے نام پر بکرے چھوڑنے جاتے ہیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی امرِ گذشتہ کی شہادت دینے کے لیے، یا آئندہ کوئی فعل کرنے یا نہ کرنے کا یقین دلانے کے لیے غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے کیونکہ اس کی تہ میں یا تو درحقیقت وہ اعتقاد ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، یا اگر وہ اعتقاد نہیں ہے تب بھی اس کا مظنہ ضرور ہے۔ [۳]

۸۔ غیر اللہ کے لیے حج کرنا بھی مشرکین کے طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ حج لغیر اللہ سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص مقام کو کسی بزرگ ہستی کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ سے متبرک سمجھا جائے اور اس ہستی سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اس مقام کا قصد کیا جائے۔ اللہ کی شریعت میں اس کو بھی ممنوع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لاتشدوا الرحال الا الی ثلثۃ مساجد یعنی تبرک اور تقرب حاصل کرنے کی نیت سے جو سفر کیا جاتا ہے تین مسجدوں کے سوا کسی اور مقام کی طرف نہ کیا جائے، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ [۱]

۹۔ مشرکین اپنے بچوں کو عبدالشمس اور عبدالعزیٰ اور ایسے ہی دوسرے ناموں سے موسوم کرتے تھے اور اہل کتاب بھی ان کی تقلید اختیار کر کے عبدالمسیح اور اسی قسم کے دوسرے نام رکھنے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو صرف خدا ہی کا بندہ نہ سمجھتے تھے بلکہ ستاروں اور بزرگوں کا بھی بندہ سمجھتے تھے۔ نیز ان کا طریقہ یہ بھی تھا کہ اولاد ہونے کے لیے اپنے معبودوں اور بزرگوں سے دعا کرتے یا ان کی منتیں مانتے تھے اور جب بچہ پیدا ہوتا تو اس کا نام اس ہستی کے نام پر رکھ دیتے تھے جس کی منت مانی تھی، گویا کہ بچہ اسی کا بخشا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شرک اور حرام قرار دیا اور فرمایا کہ فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الاعراف: ۷) یعنی جب اللہ ان کو جیتا جاگتا بیٹا دیتا ہے تو وہ اس بخشش میں

---

[۳] بزرگوں کے ناموں کی قسمیں کھانا بھی آج مسلمانوں میں عام ہے۔

[۱] مشرکین عرب کے حج لغیر اللہ اور ہندوستان کی جاتراؤں اور مسلمانوں کے اسفار زیارت میں اصول کے اعتبار سے کونسا فرق ہے۔

دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔ اللہ ان کے اس شرک سے بہت بلند و برتر ہے۔ اسی بنا پر بکثرت احادیث میں وارد ہوا ہے کہ سرکار رسالتمآب ؐ نے اس قسم کے ناموں کو عبد اللہ اور عبد الرحمٰن جیسے ناموں سے بدل دیا۔[۲]

یہ ہیں وہ قالب اور وہ صورتیں جن میں شرک اپنی روح کا اظہار کرتا ہے۔ شریعت نے اسی بنا پر ان کو ممنوع کیا ہے کہ روح شرک ہمیشہ ان قالبوں میں ظہور کرتی رہی ہے پس یہ قطعی حرام ہیں خواہ ان میں شرک کی روح اور اس کی نیت ہو یا نہ ہو۔

---

[۲] کیا آج مسلمانوں میں عبد الرسول اور عبد النبی اور نبی بخش اور حسین بخش اور پیر بخش جیسے نام بکثرت نہیں رکھے جاتے؟ لطف یہ ہے کہ بعض لوگ عبد الرسول نام رکھنے کی تائید میں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا یعنی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو اپنا بندہ کہہ کر پکاریں حالانکہ قرآن میں صاف فرما دیا گیا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (آل عمران ۸) یعنی کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ جب اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ اس کا کام تو یہ کہنا ہے کہ تم خدا پرست بن جاؤ۔

ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

حدیثِ نبویؐ سے شرائع کا استنباط

علوم نبوی کی اقسام

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے اور کتب حدیث میں جمع کیا گیا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں :۔

ایک وہ جو تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں ہے۔ اسی کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (رسول تم کو جو کچھ دے اسے لو اور جس سے روک دے اس سے رُک جاؤ)۔ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ مثلاً آپ نے علوم معاد اور عجائب ملکوت جو کچھ بیان کئے وہ سراسر وحی کی سند پر ہیں اور اجتہاد کا ان میں کوئی دخل نہیں۔ شرعی احکام اور عبادات کے ضوابط اور تمدنی معاملات کے متعلق جو ہدایات آپ نے دیں ان میں سے بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض آپکے اجتہاد پر، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی بمنزلہ وحی ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ نے حضور کو اس بات سے محفوظ کر دیا تھا کہ آپ کسی غلط رائے پر جم جائیں۔ پھر یہ گمان کرنا بھی صحیح نہیں کہ آپ کا اجتہاد منصوص احکام سے استنباط کے طور پر تھا۔ بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی تعلیم و ہدایت سے مقاصد شرع اور قانون تشریع اور اصول تیسیر و احکام پر بدرجہ کمال حاوی ہو چکے تھے اس لئے آپ جو کچھ بھی اجتہاد فرماتے تھے وہ اسی آلٰہی ہدایت پر مبنی ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں حکمت اور مصلحت کی

وہ باتیں بھی داخل ہیں جو حضور نے برسبیل عموم و اطلاق بیان کی ہیں، اور جن کے لئے آپ نے حدود اور اوقات مقرر نہیں فرماتے ہیں، مثلاً اخلاق صالحہ اور خصائل مذمومہ اور فضائل اعمال اور مناقب عمال وغیرہ۔ ان میں سے بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض اجتہاد پر مگر ان معاملات میں بھی آپ کا اجتہاد اس معنی میں نہیں ہے کہ آپ نے دنیوی حکماء کی طرح غور و خوض کر کے کسی چیز کو اچھا اور کسی کو برا ٹھیرایا ہو، اور اس میں غلطی کا امکان ہو بلکہ وہ اس معنی میں ہے کہ اللہ تعالٰے نے آپ کے قلب میں مصالح عباد اور قوانین ارتفاق کا علم بھر دیا تھا اور یہی علم اس حکمت و دانائی کا منبع تھا جس سے آپ کلیات اخذ کرتے تھے اور ان سے جزئیات نکالتے تھے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق تبلیغ رسالت کے سلسلہ سے نہیں ہے۔ اسی کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ انما انا بشرٌ اذا امرتکم بشئٍ من دینکم فخذو (بہ واذا امرتکم شئٍ من رأیی فانما انا بشرٌ (میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تم کو دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اس کی پیروی کرو۔ اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو میری حیثیت ایک انسان ہی کی ہے) اور اس کی طرف حضورؐ کا وہ ارشاد بھی اشارہ کرتا ہے جو آپ نے درخت خرما کو گابھہ لگانے کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ فانی ظننت ظنًّا فلا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ (میں نے تو ایک بات اپنے گمان سے کہی تھی اور تم میرے گمان پر گرفت نہ کرو۔ البتہ جب میں کوئی بات خدا کی طرف سے کہوں تو اس کی پیروی کرو کیوں کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا) اس دوسری قسم کے علوم میں بہت سی چیزیں ہیں، مثلاً حدیث کے وہ ابواب جو طب سے تعلق رکھتے ہیں، اور آپ کا وہ ارشاد کہ تم فلاں قسم کے گھوڑے استعمال کرو۔ ان چیزوں کی بنا تجربہ پر تھی نہ کہ وحی یا اجتہاد نبوی پر۔ اسی طرح آپ کے وہ افعال جو آپ نے عادت کے طور پر کئے ہیں

نہ کہ عبادت کے طور پر، یا اتفاقاً کیے ہیں نہ کہ قصداً یا وہ باتیں جو آپ نے
اسی طریقہ سے بیان کی ہیں جس طریقہ پر آپ کی قوم کے لوگ بیان کیا کرتے تھے
مثلاً ام ذرع کا قصہ اور خرافہ کا قصہ کہ ان چیزوں کا بھی کوئی تعلق تبلیغ
رسالت سے نہیں ہے۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کے پاس ایک مرتبہ چند لوگ حاضر ہوئے اور
انھوں نے فرمائش کی کہ ہمیں رسول اللہ کی باتیں سنائیے۔ جواب میں حضرت
زیدؓ نے فرمایا کہ "میں حضور کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی
تو آپ مجھے بلا بھیجتے اور میں اس وحی کو لکھ دیتا تھا۔ پھر آپ کی صحبت میں
بیٹھ کر جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس ذکر میں شریک
ہو جاتے تھے، اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی ہمارے
ساتھ حصہ لیتے تھے، اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی ہمارا
ساتھ دیتے تھے۔ اب کیا میں یہ سب باتیں احادیث رسول کی حیثیت سے تمہارے
سامنے بیان کروں"؟ اس قول میں حضرت زید کی مراد حضورؐ کی ایسی ہی باتوں
سے تھی جو آپ بحیثیت ایک انسان کے اپنے گھر میں یا اپنے دوستوں کی
صحبت میں کیا کرتے تھے اور جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں وہ کام بھی آجاتے ہیں جو حضورؐ نے اپنے عہد کی کسی جزئی مصلحت
کی خاطر کئے تھے اور جو تمام امت کے لئے امور لازمہ میں سے نہیں ہیں۔ اس
قسم کے کاموں کی حیثیت ایسی ہے جیسے خلیفۂ وقت اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے
لحاظ سے فوجوں کی صف آرائی کے لئے کوئی خاص طریقہ مقرر کرے یا اپنی افواج
کے لئے کوئی خاص شعار معین کرے کہ یہ چیزیں بعد والوں کے لئے لازم نہیں
ہوتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بنا پر فرمایا تھا کہ "اب ہم کو طواف
میں اکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہم ایک خاص قوم پر اپنی قوت کے اظہار
کے لئے کرتے تھے، اور وہ قوم اب ہلاک ہو چکی ہے" مگر بعد میں آپ نے

محض اس خوف سے یہ راستے واپس لے لی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کچھ اور مقصد بھی ہو اور وہ ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بہت سے احکام اسی قبیل سے شمار کیے گئے ہیں۔ مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ جو شخص کسی کو جہاد میں قتل کرے اس کے کپڑے اور ہتھیار وغیرہ اسی کو دیئے جائیں۔ یا مثلاً آپ کے خاص فیصلے جو آپ نے خاص معاملات میں فرمائے تھے کہ مقدمات میں انہی کی پیروی لازم نہیں ہے بلکہ ہر مقدمہ کا فیصلہ ثبوت اور شہادت کی بنا پر کرنا ضروری ہے۔ اسی کی طرف نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس قول میں اشارہ کیا ہے جو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا کہ "غائب ان سب چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا جو حاضر کے پیش نظر ہوتی ہیں۔

مصالح اور شرائع کا فرق

شارع نے ہم کو دو قسم کے علم دیئے ہیں جن کے احکام باہم مختلف اور جن کے مواقع باہم متباین ہیں۔

ایک قسم کا علم وہ ہے جو مصالح اور مفاسد سے تعلق رکھتا ہے، یعنی وہ علم جس میں شارع نے ہم کو اخلاق فاضلہ کے اکتساب اور خصائل رذیلہ کے ازالہ سے تہذیب نفس کے طریقے بتلائے ہیں اور تدبیر منزل اور آداب معاش اور سیاست مدینہ کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ اس علم میں تمام ترکلیات اور اصول ہیں۔ کسی چیز کی مقدار معین نہیں کی گئی، نہ کوئی ایسا ضابطہ بنایا گیا ہے جو ہر ایک چیز کی حد معین کرتا ہو، نہ ایسی تفصیلات دی گئی ہیں جن میں ہر جزئیہ دوسرے جزئیے سے ممیز ہو بلکہ عمومیت کے ساتھ فضائل کی طرف رغبت اور رذائل سے نفرت دلائی گئی ہے، اور کلام اس طرز پر کیا گیا ہے کہ ہر شخص جو زبان سے واقف ہے اس کا مفہوم خود سمجھ سکتا ہے، اور ہر شخص جو نفس مصلحت یا نفس مفسدہ کو

جانتا ہے وہ خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس موقع پر کیا چیز کس حد تک مطلوب ہے یا قابل حذر ہے۔ مثال کے طور پر کیا سستی اور شجاعت کی مدح کی گئی اور رفق و محبت کا حکم دیا گیا اور معیشت میں اقتصاد کی ہدایت کی گئی مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ ان چیزوں کی حد کیا ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اور ان کی عملی صورتیں کون کون سی ہیں جنہیں اختیار کیا جائے، اور ان میں کوتاہیاں کون سی ہیں جن سے پرہیز کیا جائے۔

دراصل شارع کے پیش نظر تین مقاصد ہیں جن کی طرف تمام احکام اور ہدایات کا مرجع ہے:۔

۱۔ تہذیب نفس، اُن اخلاق و خصائل کے ذریعہ سے جو دنیا اور آخرت میں نافع ہیں۔

۲۔ اعلاء کلمۂ حق اور تمکین شرائع اور اشاعت دین حق۔

۳۔ بندگان خدا کے معاملات کا انتظام اور ان کے طرز عمل کی شائستگی اور ان کو ایک دوسرے کی بھلائی میں مددگار بنانا۔

ہر بھلائی جس پر شارع نے ہم کو ابھارا ہے اور ہر برائی جس سے اس نے ہمیں روکا ہے، اسی حیثیت سے بھلی یا بری ہے کہ وہ ان مقاصد اصلیہ میں سے کسی ایک یا سب کے موافق یا مخالف ہو۔ جو چیز ان کی طرف لے جانے والی ہو وہ بھلی ہے اور شارع چاہتا ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ اور جو چیز ان کے حصول میں مانع ہو، یا جس سے اندیشہ ہو کہ وہ مانع ہو سکتی ہے یا جو اپنی فطرت کے اعتبار سے ایسی ہو کہ ان مقاصد سے انسان کو پھیر دینا ہی اس کا خاصہ ہو، یا جس کا تعلق عادۃً اس مقاصد کے اضداد ہی سے رہا ہو، وہ شارع کی نگاہ میں بری ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ انسان اس سے بچے۔ اللہ تعالےٰ کی رضا کا تعلق اِن مصالح سے اور اس کی ناراضی کا تعلق ان مفاسد سے دائمی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے پہلے اور بعد یکساں رہا ہے۔

اگر یہ دائمی تعلق نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام بھیجے ہی نہ جاتے۔ شرائع اور حدود فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں کہ محض ان کے لئے انسان کو مکلف کرنے اور ان پر انسان سے مواخذہ کرنے کی خاطر انبیاء کو مبعوث کیا جاتا۔ دراصل یہ مصالح اور مفاسد چوں کہ نفس انسانی کی تہذیب یا تلویث کے موجب تھے، اور نوع انسانی کی فلاح یا خسران سے ان کا گہرا تعلق تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس کا مقتضی ہوا کہ ایسے برگزیدہ نفوس بھیجے جو بنی آدم کو ان چیزوں سے خبردار کریں جو ان کے لئے اہمیت رکھتی ہیں، اور ان چیزوں پر مکلف کریں جو ان کے لئے ناگزیر ہیں اور چوں کہ یہ مقصد بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگوں کے لئے حدود اور شرائع مقرر کیے جائیں، اس لئے اللہ کا لطف و کرم پھر اس کا مقتضی ہوا کہ انہی برگزیدہ نفوس کے ذریعے سے شرائع اور حدود مقرر کرے۔

مصالح اور مفاسد کا یہ علم جو حدود اور شرائع کی جڑ ہے اس میں تمام تر وہ چیزیں ہیں جو معقول المعنی ہیں اور جن کا تعلق بالکلیہ فہم اور تدبر سے ہے۔ ان میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کو عام طور پر لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کے فہم کا دروازہ صرف انہی لوگوں پر کھلتا ہے جن کے قلوب پر انبیاء علیہم السلام کے نور علم کا فیضان ہوا ہو اور جنہوں نے اصول شرع کو ٹھیک سمجھ لیا ہو۔

دوسری قسم کا علم شرائع اور حدود اور فرائض کا علم ہے جس میں مقادیر کی توضیح کی گئی ہے۔ شارع اس علم میں صاف اور واضح طور پر ہم کو بتاتا ہے کہ بھلائی کے کام کون سے ہیں، کن چیزوں میں بھلائی کی توقع کی جاتی ہے، کون سی علامتیں ہیں جن سے بھلائی پہچانی جاتی ہے۔ انہی چیزوں پر وہ احکام کو دائر کرتا ہے اور لوگوں کو ان کا مکلف ٹھیراتا ہے۔ وہ ارکان اور شروط اور آداب کی تعیین سے خیر و صلاح کی ایک ایک نوع کو منضبط کرتا ہے، اور ہر نوع کے لئے ایک حد مقرر کر دیتا ہے کہ اس کو پورا کرنا تو لامحالہ ضروری ہے اور

اس سے زائد عمل کرنا ضروری نہیں مگر پسندیدہ ہے۔ اس طرح تکلیف شرعی کا رُخ فی نفسہ ان چیزوں کی طرف پھر جاتا ہے جن میں بھلائی کی توقع ہے، اور احکام کا مدار بالذات وہ چیزیں قرار پاتی ہیں جو بھلائی کی علامات ہیں۔

اس نوع کے علم کا مرجع قوانین سیاست ملیہ ہیں اور اس میں مصلحت یا مفسدہ کی توقع پر جتنی چیزوں کو واجب یا ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ سب کی سب ایک ضابطہ سے منضبط ہیں، امور محسوسہ میں سے ہیں اور ایسے کھلے اوصاف سے متصف ہیں جن کو خاص و عام سب جان سکتے ہیں۔

ایجاب اور تحریم کے احکام جن اصول اور قوانین پر مبنی ہیں ان کو تو ہم جان سکتے ہیں، اور ان اسباب میں سے بھی بہتوں کو ہم جانتے ہیں جن کی بنا پر کسی چیز کو واجب اور کسی چیز کو حرام کیا گیا ہے، مگر یہ بات کہ کون سی چیز کس مقدار یا کس تعداد یا کس شکل میں واجب ہے، اور کون سی چیز کس حد پر حرام ہے اس کا تعین عقلی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالےٰ کے فیصلے پر منحصر ہے جو ملاء اعلیٰ میں لکھا ہوا ہے اور ہمارے پاس اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بجز نص شارع کے نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم اس قاعدۂ طبیعی کو تو جانتے ہیں کہ برف بننے کا سبب پانی کو ٹھنڈک پہنچنا ہے۔ مگر یہ بات کہ اس وقت جو پانی سے بھرا ہوا پیالہ ہمارے سامنے رکھا ہے اس کا پانی برف بن گیا ہے یا نہیں، اس کا علم ہم کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ یا تو ہم خود اس کا مشاہدہ نہ کریں یا کسی مشاہدہ کرنے والے سے ہم کو اس کی خبر نہ ملے۔ علیٰ ہذا القیاس ہم یہ تو جانتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے بہرحال ایک نصاب ہونا چاہیئے، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ سو درہم اور پانچ وسق کی مقداریں نصاب کے لئے بالکل مناسب ہیں کیوں کہ ان کا مالک آسانی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ یہی وہ نصاب ہے جو اللہ نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے اور اسی پر اللہ کی خوشنودی و ناخوشی کا مدار ہے۔ یہ بات ہم کو صرف نص شارع ہی سے معلوم

ہو سکتی ہے۔

علماء کی ایک متعدد جماعت اس بات پر متفق ہے کہ مقادیر کے باب میں قیاس جاری نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک قیاس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کسی مشترک علت کی بنا پر اصل کا حکم فرع میں بھی جاری کر دیا جائے مگر یہ جائز نہیں کہ ہم بطور خود کسی مصلحت کے مظنہ کو علت قرار دے لیں یا کسی چیز کو مناسب دیکھ کر رکن یا شرط ٹھیرا دیں۔ نیز اس پر بھی وہ متفق ہیں کہ محض مصلحت کا موجود ہونا قیاس کے لئے کافی نہیں بلکہ کوئی منضبط علت ہونی چاہیے جس پر حکم دائر کیا جا چکا ہو۔ مثال کے طور پر کسی ایسے مقیم شخص کو جو کسی حرج میں مبتلا ہو مسافر پر قیاس کر کے نماز اور روزے کی رخصتوں کا مجاز نہیں ٹھیرایا جا سکتا، کیوں کہ مسافر کو قصر و افطار کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی مصلحت اگرچہ دفع حرج ہی ہے، لیکن یہ اس کی علت نہیں ہے بلکہ شارع نے سفر کو اس کی علت قرار دیا ہے۔

ان مسائل میں علماء کے درمیان اجمالاً تو اختلاف نہیں ہے، مگر تفصیل میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن میں علت پر مصلحت کا شبہ ہوتا ہے۔ بعض فقہاء کا تو یہ حال ہوا کہ جب قیاس کی گہرائیوں میں گئے تو ان پر حیرت طاری ہو گئی، چنانچہ بعض مقادیر کو انھوں نے بجنسہٖ باقی رکھنے پر اصرار کیا اور ان سے ملتی جلتی دوسری مقادیر اختیار کرنے سے انکار کر دیا، اور بعض مقادیر کو دوسری مقادیر سے بدلنے میں ان سے تسامح ہو گیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انھوں نے کپاس کے لئے پانچ گٹھوں کا نصاب مقرر کیا، اور کشتی کے سفر کو دوران سفر کا مظنہ ٹھیرا کر اجازت دے دی کہ اس میں بیٹھ کر نماز پڑھی جائے اور ماء کثیر کے لئے دس ہاتھ سے دس ہاتھ کی مقدار مقرر کی۔

جب کسی معاملہ میں شریعت ہم کو اپنے حکم کی مصلحت بتا دے، اور ہم

وہی مصلحت کسی دوسرے معاملہ میں موجود پائیں تو بلا شبہ ہم وہی حکم اس دوسرے معاملہ میں بھی جاری کر سکتے ہیں، کیوں کہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رضا کا تعلق دراصل اس مصلحت سے ہے، نہ کہ اس خاص معاملہ سے لیکن مقادیر کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، کیوں کہ یہاں رضا کا تعلق خاص انہی مقادیر سے ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی وقت کی نماز چھوڑ دے تو وہ بہرحال گناہ گار ہوگا چاہے وہ اس وقت ذکر الٰہی یا کسی دوسری قسم کی عبادت ہی میں کیوں نہ مشغول رہا ہو۔ اسی طرح جو شخص زکوٰۃ مفروضہ ادا نہ کرے، وہ اگر اس سے بہت زیادہ مال کسی کارِ خیر میں صرف کر دے تب بھی گناہ سے نہ بچ سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خلوت میں ریشمی لباس اور سونا پہنے جہاں نہ فقرا کی دل شکنی کا اندیشہ ہے، نہ اس بات کا خوف ہے کہ اس سے لوگوں میں دنیا طلبی کی پیاس بڑھ جائے گی، نہ اس امر کا کوئی امکان ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کی شان اور ترفہ کا اظہار ہو، تب بھی وہ گناہ گار ہی ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دوا کے طور پر شراب پیئے اور اس میں کسی فساد یا ترک صلوٰۃ کا خوف نہ ہو تب بھی گناہ بہرحال اس پر عائد ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی اور ناخوشی نفس ان اشیا ہی سے وابستہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غرض اصلی مفاسد کا سد باب اور مصالح کا حصول ہے، لیکن حق تعالےٰ جانتا تھا کہ سیاستِ امت بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ نفس ان اشیاء ہی کو واجب یا حرام کیا جائے اس لئے اس کی خوشنودی اور ناخوشی سے ساتھ بالذات متعلق ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص ریشم سے بہت زیادہ قیمتی اُون کا لباس پہنے یا سونے سے بہت زیادہ قیمتی جواہر کے برتن استعمال کرے، تو وہ فی نفسہٖ اس لئے کہ اس نے حکم صریح کی خلاف ورزی اور نافرمانی نہیں کی، البتہ اگر اس کے فعل میں غریبوں کی دل شکنی، یا اسراف کی تحریص یا تفاخر

کا قصد متحقق ہو جائے تو وہ ان مفاسد کی وجہ سے رحمت آلہی سے دور ہو جائے گا۔

صحابۂ کرام اور تابعین رحمہم اللہ کو جہاں کہیں تم ایسا عمل کرتے دیکھو جو مقادیر کی تعیین سے مشابہ نظر آتا ہو، وہاں سمجھ لو کہ ان کا مقصد دراصل مقادیر کی تعیین نہیں ہے، بلکہ مصلحت کا بیان اور اس کی طرف ترغیب اور مفسدہ کا بیان اور اس سے ترہیب ہے، اور انہوں نے جو خاص صورت کسی حکم کی تجویز کی ہے وہ بطور مثل کے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ دراصل معانی مقصود ہیں، اگرچہ بادی النظر میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ صورت کی تعیین مقصود ہے۔ اور جس جگہ خود شرع نے کسی مقدار کو قیمت سے بدل دینا جائز رکھا ہے، جیسے ایک قول کے مطابق زکوٰۃ میں نبت مخاض[1] کے بجائے اس کی قیمت دینے کی اجازت ہے، تو اس کو تسلیم کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی تعیین مقدار ہی ہے کیونکہ تعیین مقدار میں ایسا استقصار نہیں کیا جا سکتا جو دائرۂ عمل کو تنگ کر دینے کا موجب ہو۔ لہذا بسا اوقات اس طور پر مقدار معین کی جاتی ہے کہ اس کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہو سکتا ہو جیسے یہی نبت مخاض کہ کبھی ایک نبت مخاض دوسرے نبت مخاض سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات قیمت سے مقدار کی تعیین کرنے میں فی الجملہ ایک حد معلوم ہوتی ہے، جیسے چوری میں قطع ید کا نصاب ایسی چیز کو قرار دیا گیا جس کی قیمت چوتھائی دینار یا تین درہم ہو۔

یہ بھی سمجھ لو کہ ایجاد اور تحریم دونوں تقدیر[2] کی قسم سے ہیں، یہ اس

---

[1] اونٹ کا وہ بچہ جو ایک سال سے گذر کر دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

[2] تقدیر سے مراد تعیین مقادیر ہے۔

سے کہ بہت سی چیزیں جو مصلحت یا مفسدہ نظر آتی ہیں ان کی صورتیں بے شمار ہیں اور ہو سکتی ہیں، لہٰذا شارع نے چند خاص صورتیں ایجاب کے لئے اور چند خاص صورتیں تحریم کے لئے معین کر دیں، کیوں کہ وہ ایسی صورتیں تھیں جو ضبط میں آسکتی تھیں یا لوگوں کو ملل سابقہ میں اُن کا حال معلوم تھا یا ان کی طرف انسانی طبائع زیادہ راغب تھیں۔ اسی وجہ سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے معاملہ میں عذر فرمایا کہ مجھے خوف ہے، کہیں وہ تم پر فرض نہ کر دی جائے، اور مسواک کے متعلق فرمایا کہ اگر میری امت پر سختی کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کو مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

پس جب حال یہ ہے تو یہ کسی طرح جائز نہیں کہ جن چیزوں کا حکم منصوص نہیں ہے ان کو منصوص پر قیاس کر کے فرض یا حرام قرار دیا جائے۔ رہا ندب[1] اور کراہت تو اس میں تفصیل ہے۔ ہر وہ مندوب فعل جس کو شارع نے کرنے کا حکم دیا، اور جس کے حکم کی تصریح کی اور جس کی عہد صحابہ و تابعین کے لوگوں نے پابندی کی اس کا حال وہی ہے جو واجب کا حال ہے۔ اور جس مندوب فعل کی محض مصلحت بیان کرنے پر شارع نے اکتفا کیا، یا جس پر خود شارع نے عمل کیا مگر اس کو دوسروں کے لیے سنت نہیں بنایا، نہ اس کی پابندی پر زور دیا تو وہ اسی حالت پر باقی ہے جس پر تشریع سے پہلے تھا اس میں جو کچھ بھی اجر ہے وہ اس مصلحت کے لحاظ سے ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہو، نہ کہ نفس فعل کے اعتبار سے۔ یہی تفصیل مکروہات میں بھی ہے اس مقدمہ کو جب تم اچھی طرح سمجھ لوگے تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ بہت سے قیاسی مسائل جن پر لوگ فخر کرتے ہیں، اور جن کی بنا پر وہ متبعین حدیث کو مطعون

---

[1] ندب سے مراد کسی کام کی طرف رغبت دلانا اور اس کے کرنے کی طرف دعوت دینا ہے اور مندوب اس کام کو کہتے ہیں جس کی دعوت دے گئی ہو۔

کرتے ہیں، وہ دراصل خود انہی کے لئے وبال ہیں، مگر وہ نہیں جانتے۔

نبیؐ سے اخذ شرع کی کیفیت

نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے امت نے دو طرح پر شریعت اخذ کی ہے، ایک اخذ ظاہر دوسرے اخذ بطور دلالت۔

اخذ ظاہر کی دو صورتیں ہیں۔ متواتر اور غیر متواتر

متواتر کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو لفظاً متواتر ہے، مثلاً قرآن عظیم اور چند احادیث جن میں سے ایک یہ حدیث ہے کہ انکم سترون ربکم کما ترون ھٰذا القمر لاتضامون فی رؤیتہٖ[1] دوسری وہ جو معنیً متواتر ہے جیسے طہارت اور نماز اور زکوٰۃ اور روزے اور حج اور بیوع اور نکاح اور غزوات کے کثیر التعدد احکام جن میں مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہیں۔

رہا غیر متواتر تو اس کے مختلف درجات ہیں۔ اعلےٰ درجہ خبر مستفیض کا ہے، یعنی وہ جس کو کم از کم تین صحابہ نے حضورؐ سے نقل کیا ہے اور ان کے بعد پانچویں طبقہ تک رواۃ کی تعداد برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس قسم کی احادیث بکثرت موجود ہیں اور فقہ کے بڑے بڑے مسائل انہی پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد ایسی خبر کا درجہ ہے جس کی صحت یا حسن کا فیصلہ اکابر محدثین اور حفاظ حدیث نے بالاتفاق کر دیا ہو۔ پھر ان خبروں کا درجہ ہے جن میں کلام کیا گیا ہو۔ بعض نے قبول کیا اور بعض نے رد کر دیا ہو۔ ان میں سے جس خبر کی تائید پر شواہد موجود ہوں یا جس کی تائید اکثر اہل علم نے کی ہو یا جس کی صحت پر عقل صریح شہادت دیتی ہو اس کا اتباع ضرور کرنا چاہیئے۔

---

[1] تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو کہ اسے دیکھنے کے لئے تمہیں ہجوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سے اس کو دیکھ رہا ہے۔

اخذ بطور دلالت یہ ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو کوئی فعل کرتے دیکھا یا حضور سے کوئی بات سُنی۔ اس سے وجوب وغیرہ کا کوئی حکم مستنبط کیا، اور اس استنباط کی بنا پر لوگوں سے کہا کہ فلاں بات واجب ہے اور فلاں جائز۔ پھر تابعین نے صحابہ سے اسی طرح اخذ کیا اور اس کے بعد تیسرے طبقہ کے لوگوں نے ان کے فتاویٰ اور فیصلوں کو مدون کر دیا۔ اس باب میں جو صحابہ سب سے پیش پیش ہیں وہ حضرات عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ صحابہ سے مشورہ اور بحث کرتے اور کوئی فیصلہ اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک کہ حقیقت بالکل بے نقاب نہ ہو جاتی اور آپ کو صحت کا وثوق حاصل نہ ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اکثر فیصلوں اور فتووں کو تمام دنیائے اسلام میں قبول کیا گیا اور اسی بنا پر ابراہیم النخعی نے کہا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے وفات پائی تو علم کے دس حصوں میں نو حصے چلے گئے، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمرؓ جب کسی طریقہ پر چلتے تو ہم اس کو آسان پاتے تھے بخلاف اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ عموماً مشورہ نہ فرماتے اس سے آپ کے اکثر فیصلے کوفہ ہی تک محدود رہے اور بہت کم لوگوں نے ان کو لیا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی کوفہ میں رہے اور اسی علاقہ کے لوگوں نے زیادہ تر ان کے فیصلے اختیار کئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کا عہد گذر جانے کے بعد اجتہاد کیا اور بہت سے احکام میں ان سے اختلاف کیا۔ ان کے فتاویٰ کو زیادہ تر اہل مکہ نے لیا ہے جو ان کے شاگرد تھے مگر جمہور اہل اسلام نے ان کے ایسے فتووں کو قبول نہیں کیا جن میں وہ منفرد تھے۔ ان چار بزرگوں کے سوا جو صحابہ تھے وہ دلالت پر تو نظر رکھتے تھے، مگر آداب اور سنن کو رکن اور شرط سے تمیز نہیں کرتے

تھے۔ ان میں حضرات ابن عمر، عائشہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے صحابہ شامل ہیں۔

تابعین میں سے بھی چند لوگ اس باب میں نمایاں ہیں، مثلاً مدینہ میں سعید بن المسیب، مکہ میں عطا بن رباح، کوفہ میں ابراہیم النخعی، قاضی شریح اور شعبی، بصرہ میں حسن رضی اللہ عنہم۔

ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خلل رہتا ہے جس کو دُور کرنے کے لئے دوسرے طریقے سے مدد لینی پڑتی ہے، اس لئے کوئی ایک طریقہ دوسرے طریقہ سے بے نیاز نہیں ہے۔ اخذ ظاہر میں اس طرح خلل واقع ہوتا ہے کہ مثلاً راوی اصل الفاظ بھول گیا اور جو معنی اس کے ذہن میں محفوظ رہے ان کو اس نے دوسرے الفاظ سے ادا کیا جن سے معنی میں کچھ نہ کچھ تغیر ہو گیا۔ یا مثلاً حکم ایک واقعہ خاص میں تھا راوی نے سمجھا کہ حکم کلی ہے، یا مثلاً کوئی بات تاکید کے ڈھنگ پر کہی گئی تھی تاکہ لوگ اس کی اہمیت سمجھیں اور اس کا اہتمام کریں، راوی نے سمجھا کہ وجوب یا حرمت کا حکم ہے، حالانکہ معاملہ یہ نہ تھا۔ ایسی صورتوں میں صحیح مطلب وہی سمجھتا ہے جو فقیہہ ہو اور اصل واقعہ کی تفصیلات اس کے سامنے ہوں اور قرائن سے حقیقت حال کو سمجھے۔ مثال کے طور پر حدیث میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے اور پھلوں کا حسن و قبح ظاہر ہونے سے پہلے ان کی بیع کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت زید موقع و محل اور انداز کلام سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے مراد تحریم نہیں ہے بلکہ حضورؐ کا یہ ارشاد مشورہ کے طور پر تھا۔ دوسری طرف اخذ بالدلالت میں بھی مختلف صورتوں سے خلل واقع ہوتا ہے۔ اس میں صحابہ و تابعین کے قیاسات اور کتاب و سنت سے ان کے استنباط کا بڑا دخل ہے اور ظاہر ہے کہ اجتہاد ہمیشہ صحیح تو نہیں ہوتا۔ پھر ایسا بھی ہوا ہے کہ ان

کو کوئی حدیث نہیں پہنچی یا اس طور پر پہنچی کہ اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا، اس لئے انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، بعد میں کسی دوسرے صحابی کے ذریعہ سے صحیح بات معلوم ہوئی، جیسے جنابت میں تیمم کا مسئلہ ہے کہ اس میں حضرت عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کو غلط فہمی پیش آئی۔
بہت سے معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صحابہ رضی عنہم نے محض دلالت عقلی کی بنا پر ایک رائے بالاتفاق قائم کر لی تھی حالانکہ شرع میں ان کی کوئی تصریح نہ تھی اسی کی طرف حضور نے اشارہ فرمایا کہ تم میری سنت کا التزام کرو اور میرے بعد میرے خلفاء راشدین کے طریقہ کی پیروی کرو۔

پس جو شخص اخبار و آثار اور الفاظ حدیث پر وسیع نظر رکھتا ہو وہ ایسی پُرخطر راہوں سے بخیریت گذر سکتا ہے جہاں قیاس و اجتہاد کے قدم پھسل جایا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں طریقوں میں درک حاصل کرے اور دونوں مذہبوں میں تجرپید اکرے اور شعائر ملت میں بہترین شعار وہ ہے جس پر جمہور رواۃ اور اکثر حاملین علم کا اجماع ہو اور جس میں دونوں طریقوں کا تطابق پایا جاتا ہو۔
ترجمان القرآن - جمادی الاول ۱۳۵۶ھ

چوتھی صدی ہجری کا فقہی و مذہبی انقلاب

چوتھی صدی ہجری سے قبل کسی خاص امام کی تقلید کا خیال رائے عامہ کو متاثر نہ کر سکا تھا ابوطالب مکی قوت القلوب میں فرماتے ہیں :-

"لوگوں کی یہ تصانیف تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی میں لوگوں کے اقوال حجت نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ خصوصیت کے ساتھ کسی ایک ہی شخص کے مذہب پر فتوے دیا جائے اُسی کی رایوں سے استدلال کیا جائے اور ہر مسئلہ و معاملہ میں اُسی کا قول تلاش اور بیان کیا جائے حتیٰ کہ صرف اُسی کے مذہب پر تفقہ اور استنباط مسائل کی بنا رکھی جائے۔"

پھر تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تخریج و استنباط مسائل کا کسی قدر رواج شروع ہوا لیکن، جیسا کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے، اس وقت بھی عام لوگوں میں تقلید شخصی کا شیوع نہ تھا اور نہ کسی امام کے اقوال کی روایت و تدوین ان کا شیوہ تھا، بلکہ خواہ عوام ہوں یا خواص و علماء سب کے سب ان خیالات سے بہت دور تھے۔

عوام کا حال یہ تھا کہ وہ اجماعی اور اصولی مسائل میں، جو تمام ائمہ اور ارباب اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے۔ براہ راست شارع علیہ السلام کی تقلید کرتے تھے۔ وضو، غسل، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کے طریقے تو اپنے بزرگوں سے سیکھ لیتے یا اپنے گاؤں اور شہر کے اصحاب درس و تدریس سے اور اُسی پر عمل کرتے۔ اور اگر کوئی اہم معاملہ پیش آ جاتا تو جس فقیہ یا مفتی کو پاتے بلا لحاظ مذہب و مسلک اُس سے فتویٰ پوچھ لیتے۔

خواص اور علماء کا حال یہ تھا کہ ان میں جو ارباب روایت و اصحاب حدیث ہوتے وہ ہر طرف سے نظریں ہٹا کر احادیث میں مشغول رہتے۔ اگر انہیں احادیث یا آثار صحابہ میں کوئی

مشہور و مستند چیزیں جاتی جس پر فقہائے سلف کا عمل بھی رہ چکا ہو تو وہ پیروی کے لیے اسکو کافی سمجھتے، اور لوگوں کے اقوال و مذاہب کی طرف التفات ہی نہ کرتے۔ لیکن اگر وہاں کوئی چیز نہ ملتی، تو پھر جمہور صحابہؓ و تابعین کے مشہور اقوال کو دلیل راہ بناتے۔ اور کبھی ان ماخذ سے بھی انہیں کوئی تسلی بخش حل نہ ملتا۔ مثلاً نصوص باہم متعارض ہو جاتیں اور کوئی وجہ ترجیح اُن کے ذہن میں نہ آسکتی تو ایسی حالت میں وہ فقہائے متقدمین کے اقوال کی طرف رجوع کرتے اور ان کی مختلف رایوں میں سے اس رائے کو اختیار کرتے جو اُن کے نزدیک کتاب و سنت کی روح سے زیادہ اقرب ہوتی اور جس کے حق میں دلائل زیادہ مضبوط ہوتے وہ ماخذ اور دلیل کو دیکھتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ کونسا قول کس گروہ کا ہے۔

یہ طریقہ محدثین کا تھا۔ اصحاب تخریج کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ جن مسائل کا حل نصوص شرعیہ میں صاف اور صریح نہ پاتے، انہیں تخریج و استنباط کی روشنی میں حل کرتے اور اپنے اصول کے مطابق اجتہاد کرتے تھے اور اس اجتہاد کے باوجود یہ لوگ اپنے اپنے ہم خیال ائمہ کبار کے مذہب سے منسوب کیے جاتے تھے۔ مثلاً کہا جاتا کہ فلاں شخص حنفی ہے اور فلاں شافعی ہے۔ یہی طریقہ محدثین کے بارے میں بھی برتا گیا۔ مذاہب مرجہ میں سے جس مذہب سے اِن کا مسلک نسبتاً زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہوتا آزادیٔ رائے اور عدم تقلید کے باوجود اُسی مذہب کی طرف انہیں منسوب کردیا جاتا۔ مثلاً نسائی اور بیہقی جو بجائے خود امام اور محدث تھے "شافعی" کہے جانے لگے۔ غرض اُس زمانہ میں قضاء اور افتاء کی مسند پر وہی بیٹھتا تھا جو شان اجتہاد رکھتا ہو۔ جو مجتہد نہ ہوتا وہ فقیہ بھی نہ کہلاتا۔

اب وہ دور آتا ہے جس میں علوم شریعت پر ایک طرح اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔ مسلمان بکثرت اِدھر اُدھر پھیل جاتے ہیں اور ان کے علمی ذوق میں ایک تباہ کن انقلاب برپا ہوتا ہے وہ ذہنی بیماریاں جنہوں نے اِن کی فکری و علمی صلاحیتوں کو شدید پہنچایا چند اقسام کی تھیں۔

۱۔ پہلی بیماری جس نے ملت مرحومہ کے پیکر کو کھوکھلا بنانے میں سب سے نمایاں حصہ لیا وہ فقہ اور اُسکی تفصیلات سے متعلق اہل علم کی باہمی نزاع اور ہنگامہ آرائی

تھی یہ افسوسناک داستان امام غزالیؒ نے تفصیل سے بیان کی ہے ۔ جس کا ماحصل یہ ہے
خلفائے راشدین کا میمون و مبارک دور جب ختم ہوگیا تو زمام خلافت ایسے لوگوں
کے ہاتھ میں آئی جو اس امانت کے اٹھانے کی مطلقاً صلاحیت نہ رکھتے تھے اور احکام
شریعت سے قریب قریب نابلد تھے ، اس لیے وہ مقدمات فیصل کرنے اور قضائے
شرعی کرنے کے لیے مجبور ہوئے کہ علماء دین کی صحبت سے استفادہ کریں ، اور
قدم قدم پر اُن سے رجوع کریں ۔ گو خیر القرون کا دور ختم ہوچکا تھا ۔ مگر پھر بھی
حق پرست اور صحیح علم و بصیرت رکھنے والے علماء سے دنیا بالکل خالی نہ تھی ۔ خلفاء
کو ایسے لوگوں کی تلاش رہتی مگر ان کی بے نیازی کا عالم ہی کچھ اور تھا حکومتیں
انہیں جتنا اپنی طرف کھینچتیں ، وہ ان سے اتنا ہی زیادہ کھنچے جاتے ۔ جاہ پسند
لوگوں نے جب دیکھا کہ اس اعراض اور استغناء کے باوجود وہ مرجع خلائق
بنے ہوئے ہیں بڑے بڑے ائمہ دین ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور انہیں جو عزت
و عظمت اور مقبولیت حاصل ہے بادشاہ وقت کے لیے بھی باعث صد رشک
ہے تو ان کے دلوں میں اس ذریعہ عزت یعنی علوم دین کے حاصل کرنے
کا شوق پیدا ہوا تاکہ اُسے بازار میں لاکر عزوشرف کا سوداکریں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
علم دین کا ایوان عظمت جاہ پرستی کے سیلاب میں غرق ہوکر رہ گیا ۔ اب علماء
و فقہا ڈھونڈے نہ جاتے بلکہ وہ خود اپنے ڈھونڈھنے والوں کو ڈھونڈھتے پھرتے
تھے جو کچھ انکی عزت تھی سلاطین سے منہ موڑنے کی بدولت تھی ۔ جب
انہوں نے خود سلاطین کا رُخ کیا تو عزت ذلت سے بدل گئی ۔ الا ماشاءاللہ

" اس سے قبل کلامی جدلیات کی داغ بیل پڑ چکی تھی ، علم کلام پر بعض
کتابیں لکھی جا چکی تھیں ، بحث و مناظرہ کے اصول و فروع بھی قائم ہو
چکے تھے ، اختلافی مسائل پر سوال و جواب کا رواج عام ہوچکا تھا ۔ بالآخر
ابی فقہا کیلئے یہ چیزیں خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں کیونکہ دربار وں میں
اس کے بغیر بار نہ حاصل ہوتا ۔ بعض خلفاء فقہی مناظروں کے بڑے دلدادہ تھے

حنفی اور شافعی مباحثوں میں خصوصیت کے ساتھ انہیں دلچسپی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ارباب فن، کلام اور دیگر علوم کے میدان تحقیق و جستجو سے نکل کر اختلافی مسائل فقیہ کے معرکہ زار میں اتر آئے اور حنفیت اور شافعیت کے اکھاڑوں میں باہم زور آزمائی ہونے لگی کہ خداوندان جاہ و ثروت کی توجہ حاصل کرنے کا یہی مجرب ترین نسخہ تھا۔

" ستم یہ کہ وہ اپنی اس قیل و قال کو علم دین کی بڑی خدمت شمار کرتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے اسرار و دقائق کا استنباط کر رہے ہیں ہر مذہب کے علل و مصالح بیان کر رہے ہیں، اور اصول فتویٰ کی راہ کھول رہے ہیں۔ اسی خیال کے ماتحت انہوں نے تصنیفات اور استنباطات کا ڈھیر لگا دیا اور بحث و جدال کے گوناگوں اسلحہ ایجاد کر ڈالے۔ افسوس کہ وہ اب تک اسی روش پر چلے آرہے ہیں۔

۲۔ دوسری خاص بات اس زمانہ میں یہ پیدا ہوئی کہ تقلید جامد پر لوگوں نے قناعت کر کے تحقیق و اجتہاد کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ تقلید پرستی غیر شعوری طور پر ان کے ایک ایک رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ اس کے چند اسباب تھے۔

پہلا سبب فقہا کی باہمی جنگ و جدل ہے۔ کیونکہ جب ان میں آپس کی مناظرانہ چپقلش اور مزاحمت شروع ہوئی تو نوبت یہ آگئی کہ جہاں کسی فقیہ نے فتویٰ دیا۔ دوسرا فوراً اس کی نفی کر دیتا اور اپنی الگ رائے پیش کرتا۔ اس نزاع میں جب تک کسی قدیم امام یا مجتہد کا قول حکم نہ بنتا۔ جھگڑے کا تصفیہ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح ارباب علم و افتاء کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ کسی نہ کسی امام کی تقلید محض کے حصار میں پناہ لیں۔

دوسرا سبب قضاۃ وقت کا ظلم و جور ہے۔ ان کے فیصلے اکثر سنت عادلہ سے بے پروا ہو کر جور و ستم پر مبنی ہوا کرتے۔ اس وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں ان کی رائیں مشکوک رہا کرتیں اور انہیں اس وقت تک تسلیم نہ کیا جاتا جب تک وہ سلف میں سے کسی امام کی رائے کا حوالہ نہ دیتے۔

تیسرا سبب جہل کا شیوع ہے۔ اکثر مفتیوں کا حال یہ تھا کہ نہ وہ علم حدیث سے کچھ بہرہ رکھتے تھے اور نہ تخریج و استنباط کی اہلیت رکھتے تھے، جیسا کہ تم اکثر متاخرین کے اندر یہ صفت بآسانی دیکھ سکتے ہو۔ علامہ ابن ہمام وغیرہ نے اس علمی و فقہی زوال پر شدید احتجاج ہے ایک وقت وہ تھا جب فقیہ اور مجتہد کے الفاظ ایک ہی معنی میں بولے اور سمجھے جاتے مگر اب فقاہت کا معیار بدل چکا تھا۔ اب غیر مجتہد بھی فقیہ ہونے لگا۔

۳۔ اس دور میں ایک اور چیز پیدا ہو گئی، جس نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی وہ علوم شریعت کے اصل سرچشمہ سے اک گونا بے پرواہ ہوتے گئے اور زیادہ تر جزوی فنون میں داد تحقیق دینے لگے۔ بعض نے بزعم خود علم الرجال اور فن جرح و تعدیل کی بنا ڈالی پھر جدید و قدیم تاریخ کی تدوین میں منہمک ہو گئے۔ کچھ لوگ غریب و نادر احادیث و اخبار کی چھان بین میں مصروف ہو گئے، خواہ وہ سرتاپا افسانہ ہی کیوں نہ ہوتیں۔ ایک گروہ نے اصول فقہ کے دامن کو پھیلانا شروع کیا اور ہر صاحب نظر نے اپنے امام و اصحاب کے مسلک کی تائید میں بے شمار جدلی قواعد و ضوابط مدون کر ڈالے۔ ردّ و ایراد کے چرچے بہت بڑھ گئے۔ میدان مبارزت میں بے پناہ گرمی پیدا ہو گئی اور اس فن پر ہر ایک نے اپنے مسلک اور مذاق کے مطابق طویل و مختصر تصانیف کا انبار لگا دیا۔ ایک اور جماعت اٹھی جس نے بغیر کسی احساس ضرورت کے محض فرضی صورتیں جن پر وہ اپنی قیل و قال کی بنیاد رکھتے کبھی کبھی حد درجہ مستبعد اور بے اصل ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح کبھی کبھی مجتہدین سلف کے عموم عبارت اور اشارات کو لیکر خیال آرائی شروع کر دیتے جس کو ایک عامی انسان بھی سننا پسند نہیں کر سکتا۔

یہ دور اتنے فتنوں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ اختلاف و نزاع اور لاطائل تعمق و تدقیق کا یہ فتنہ تاریخ اسلام کے اس سیاسی فتنے سے کسی طرح کم نہ تھا جس نے شیرازہ ملت پر اپنی تیز مقراض چلا کر اس کا سارا نظام ہی درہم برہم کر ڈالا۔ پہلا فتنہ خلافت اور حکومت کی طلب کا اٹھایا ہوا تھا۔ ہر شخص نے اپنی جماعت یا اپنے جماعتی سرگروہ کو برسر تخت لانے کی جا و بیجا سر توڑ کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک " عضوض " (جابر و ظالم بادشاہ) امت

کے سر پر مسلط ہو گئے۔ اور تاریخ اسلام میں ایسے ہولناک واقعات پیش آتے۔ جن کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح یہ جدید فتنہ بھی قریب قریب ویسے ہی اسباب کے ماتحت آیا اور لوگوں کے دماغ میں جہل اور شکوک واوہام کے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔

زمانہ گذرتا رہا اور اسی اندھی، متعصبانہ تقلید پرستی پر نسلیں ختم ہوتی گئیں جس کی رو سے حق و باطل کی تمیز کرنا اور جدل محض اور استنباطِ صحیح کے حدود الگ کرنا بدترین گناہ ہے۔ اب فقیہ تمام ہونے لگا اس شخص کا جس کی زبان بحث و جدال کے میدان میں تیز تر ہو جو کسی بات پر چپ رہنا جانتا ہی نہ ہو۔ جس نے بلا امتیاز رطب و یابس، فقہا کے تمام اقوال رٹ رکھے ہوں اور ان کی دھواں دھار تلاوت کر سکتا ہو۔ یہی حال اصطلاحی محدث کا تھا جو یہ سمجھے بیٹھا ہوا تھا کہ غلط اور صحیح، موضوع اور مستند اور ہر قسم کی روایتوں کو گن گن کر الگ کر لینا اور بغیر کسی معقولیت اور فہم و بصیرت کے انہیں بیان کر دینا حدیث دانی کا سب سے بڑا کمال ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہی حال سب کا تھا۔ نہیں۔ اس قحط کے باوجود اللہ کے کچھ بندے سلف کی یاد تازہ کرنے والے بھی پائے جاتے تھے۔ اگرچہ بہت کم تھے مگر اللہ کی تائید ان کے شریک حال تھی۔ یہی لوگ ارضِ الٰہی پر اس کی حجت ہیں۔

اس دور کے بعد جتنا وقت گذرتا گیا فتنہ آرائی اور متعصبانہ تقلید پرستی کا طوفان بڑھتا ہی گیا اور دلوں سے علم و بصیرت کی خداوندی امانتیں نکلتی گئیں، حتیٰ کہ آج کے علمائے کرام امور میں غور و تدبر کی "بدعت" کو مٹا کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (ہم نے اپنے آباء کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقوش قدم کی پیروی کریں گے) اب سوائے اللہ کے اور کس سے اس کا گلہ کیا جائے۔ وہی ہمارے حال پر رحم کرے۔

ترجمان القرآن مئی ۱۹۳۸ء

دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب

جو صاحب سیاست کبریٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا دین لے کر آیا جو تمام ادیان کا ناسخ ہو، اُس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے دین کو فتنۂ تحریف کی دست برد سے محفوظ کرے کیونکہ اس کی عام اور ہمہ گیر دعوت مختلف استعداد، مختلف مزاج اور مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والی جماعتوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتی ہے۔

ایسا ہوا کرتا ہے کہ لوگ اپنی ہوا پرستی یا اپنے پہلے مذہب کی محبت کی وجہ سے مصالح شریعت کا کامل احاطہ نہ کرنے والی فہم نارسا کے اشارہ پر بہت سی منصوص تعلیمات شرع کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور کبھی اس میں غیر شرعی تخیلات اور تعلیمات ٹھونس دیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا دین مسخ اور درہم برہم ہو جاتا ہے جیسا کہ بہت سے قدیم مذاہب کی تاریخ گواہ ہے لیکن چونکہ اس فتنہ کے دروازے بے شمار اور ان کی تعداد غیر متعین ہے اور سب کا استقصا ممکن نہیں۔ لہٰذا شارع کے لیے ضروری ہے کہ اُمت کو اجمالاً اسباب تحریف سے ڈرا کر متنبہ کر دے اور اس کے لیے چند ایسے اصولی مسائل کو مخصوص کرے جن کے بارے میں قیاس کہتا ہے کہ عموماً تہاون اور تحریف کے فتنے بنی نوع انسان میں انہیں راستوں سے گھسا کرتے ہیں، اور ان راستوں کو اچھی طرح بند کر دے۔ اس تہدید و انذار کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی شریعت میں ایسی چیزوں کو داخل کرے جو مسخ شدہ اور باطل مذاہب کے اصول اور مشہور ترین رسوم و شعائر کے بالکل مخالف ہوں مثلاً نماز وغیرہ تاکہ کوئی ظاہری تشابہ باقی نہ رہ جائے اور کسی پرانے مذاہب کے شعائر سے مماثلت

کا امکان باقی نہ رہے۔

تہاون

تحریف کے اسباب میں سے ایک تہاون ہے یعنی احکام شرع سے بے پروائی۔ تہاون کی حقیقت یہ ہے کہ رسول کے تربیت یافتہ حواریوں کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہونے لگیں جو نماز کو ضائع کر کے شہوات کی پیروی میں غرق ہوں، علم وعمل اور تعلیم وتعلم کے ذریعہ دین کی اشاعت کا اہتمام چھوڑ دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اور اس طرح چند روز بعد مخالف دین رسوم پیدا ہو جائیں اور بحیثیت مجموعی عام طبائع انسانی کا رجحان مزاج شریعت کے خلاف ہو جائے۔ پھر ایسے دوسرے خلف آئیں جو شریعت سے بے اعتنائی کے اس جرم میں اور زیادہ آگے بڑھ جائیں یہاں تک کہ علم دین کا اکثر حصہ نسیاً منسیاً ہو کر رہ جائے یوں تو اُمت کے ہر طبقہ کا تہاون خطرناک اور مضرت رساں ہے مگر جب اس کا صدور روٴساء اکابر قوم سے ہو تو پھر اس کی مضرتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسی سبب سے حضرت نوح وابراہیم علیہما السلام کی شریعتیں برباد ہو گئیں اور آج اس کے اصل خط وخال کا سراغ لگانا قریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

تہاون کے چند اسباب وذرائع ہیں۔

(۱) پہلا سرچشمہ تہاون کا صاحب شریعت کی روایات کو محفوظ نہ رکھنا اور ان کے مطابق عمل نہ کرنا ہے۔

مندرجہ ذیل ارشاد نبوی اسی فتنہ سے باخبر کر رہا ہے۔

دیکھو عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب طعام۔ شراب سے ایک بدمست انسان اپنے تخت پر بیٹھ کر کہے گا کہ تم اس قرآن کو مضبوط پکڑ لو اور اس میں جس چیز کو حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو اور جس شے کو حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو۔ حالانکہ خدا کے رسول کی حرام کی ہوئی چیز بھی ویسی ہی قطعی الحرمت ہے۔ جیسی خود اللہ کی حرام کی ہوئی۔

اسی بات کو دوسری جگہ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے علم نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھائے

گا اور ان کے اُٹھ جانے سے علم اُٹھ جائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے گا اس وقت لوگ جاہلوں کو امام بنا کر اُن کی طرف رجوع کرنے لگیں گے ان سے مسئلہ پوچھا جائے گا اور وہ بغیر کسی علم و بصیرت کے فتویٰ دیں گے خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہی کے جہنم میں ڈال دیں گے۔

(۲) دوسرا سبب ایسی اغراضِ فاسدہ ہیں جو تحریف تاویلات پر آمادہ کرتی ہیں مثلاً نفس پرست امراؤ ملوک کی طلب و رضا جس کی وجہ سے انسان اُن کی ہوا پرستوں کے لیے کلام الٰہی کی غلط تاویلیں کر کی سند جواز مہیا کرتا ہے۔ آیت ذیل ایسے ہی ایمان فروشوں کو مخاطب کرتی ہے۔

"جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اور تو کچھ نہیں مگر اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں" (بقرہ۔ رکوع ۲۱)

(۳) تہاون کا تیسرا منبع منکرات اور فاحشات کا اُمت میں پھیل جانا اور علماء کا ان پر خاموشی اختیار کر لینا ہے۔ اسی حالت کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

• تم سے پہلے گزرنے والی اقوام میں ایسے ارباب خیر کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو ارضِ الٰہی میں فساد برپا کرنے سے روکتے (ہاں ایسے لوگ تھے تو سہی مگر بہت کم تھے جنہیں ہم نے عذاب سے بچالیا۔ رہے ظالم و نافرمان لوگ تو وہ اسی لذت دنیوی میں سرشار رہے جو انہیں دی گئی تھی اور یہ لوگ کچھ تھے ہی بدکردار" (ہود۔ رکوع ۱۰)۔

بنی اسرائیل کی معصیت پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں:۔

"ان کے علماء نے انہیں برائیوں سے روکا لیکن وہ نہ رکے۔ پھر علماء نے قطع تعلق کرنے کے بجائے ان کی مجلسوں میں اُٹھنے بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا (یعنی سب کو معصیت کی سیاہی میں رنگ دیا) اور داؤد و عیسیٰ ابن مریم

کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ گئے تھے۔

تعمق تحریف کا دوسرا سبب تعمق تھا یعنی خواہ مخواہ بال کی کھال نکالنا۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً یہ کہ جب شارع کسی چیز کا حکم دے یا کسی کام سے روکے تو اُس کے حکم کو سن کر کوئی شخص اپنے ذہن کے مطابق خود ایک معنی متعین کرے پھر وہی حکم اپنی طرف سے کسی ایسی دوسری چیز پر عائد کر دے جو بعض وجوہ سے پہلی شے کے مشابہ ہو، یا دونوں میں کسی پہلو سے اشتراک علت نظر آئے۔ یا ایک شے کے حکم کو اُس کے تمام اشکال اور متعلقات اور اجزاء پر علیحدہ علیحدہ جاری کر دے یا جب کبھی روایات کے تعارض کی وجہ سے اصل حکم اور اس کے صحیح محل و موقع کی تمیز نہ کر سکے تو تمام صورتوں میں سے سخت ترین صورت کو اختیار کر کے اُسے واجب سمجھ لے۔ یا رسول اللہ صلعم کے ہر فعل کو عبادت پر محمول کرے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بہت سے افعال محض عادۃً کے طور پر کئے ہیں، عبادت سے ان کا کوئی تعلق نہیں) اور یہ خیال کر کے یہ تمام امور شریعت کی حیثیت رکھتے ہیں اور امر و نہی کے ذیل میں آتے ہیں، حکم لگا دے کہ خدا نے ان کاموں سے روکا ہے اور ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ یہ تمام صورتیں تعمق فی الدین کی ہیں مثال کے طور پر روزہ کے احکام کو لے لو۔ شارع نے جب نفس حیوانی کو مغلوب کرنے کے لیے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اس میں مباشرت سے منع فرمایا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ سحری کھانا بھی خلاف شرع ہے کیونکہ اس سے روزہ کا مقصد (یعنی نفس کشی) فوت ہو جاتا ہے۔ نیز روزہ دار کے لیے بیوی کا بوسہ لینا بھی ناجائز ہے کیونکہ وہ مباشرت کا داعیہ ہے۔ بلکہ قضائے شہوت میں ایک طرح مباشرت کے مشابہ ہے۔ رسول اللہ صلعم کو جب ان خیالات کی اطلاع پہنچی تو آپ نے ان کی غلطیوں کو واضح کر کے فرمایا کہ اس قسم کا قیاس تحریف دین ہے۔

تشدد تحریف و بدعت کا تیسرا دروازہ تشدد ہے، یعنی ایسی سخت اور شاق عبادتوں کا اختیار کرنا جن کا شارع نے حکم نہیں دیا۔ مثلاً مسلسل

روزے رکھنا، ہر وقت نماز و مراقبہ میں معروف رہنا، تجرد اختیار کرنا، سنن و آداب کا واجب اور فرض کی طرح التزام و اہتمام کرنا وغیرہ چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن عمر اور عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہما نے ایسی ہی سخت ریاضتوں کا ارادہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب کوئی شخص دین کے ساتھ سختی برتے گا اور اپنے نفس کو ناقابلِ برداشت عبادتوں میں مبتلا کرے گا، تو وہ دین کی پیروی سے عاجز ہو جائے گا"۔

اس تعمق یا تشدد کو اختیار کرنے والا جب کسی گروہ کا امام اور معلم بن جاتا ہے تو اس کے مقلد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ سارے امور جنہیں ان کا امام بطور عبادت کے سر انجام دے رہا ہے، شرعی احکام ہیں اس طرح یہ تمام چیزیں جزو دین خیال کی جانے لگتی ہیں۔ یہود اور عیسائی راہبوں کی یہی وہ خطرناک روش تھی جس نے دین کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

استحسان تیسرا سبب استحسان ہے، یعنی جاہلانہ قیاس آرائی۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص شارع کے طریق تشریع پر نگاہ ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ ہر مصلحت اور حکمت کے لیے ایک مناسب مظنہ مقرر کرتا اور ہر ایک مقصد کے حصول کے لیے ایک موزوں قالب معین کرتا ہے لیکن چونکہ یہ شخص نگاہ نبوت کی حقیقت شناسی اور وسعت سے قطعاً محروم ہوتا ہے اور اسرار تشریع کے تمام پہلوؤں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے وہ ایک آدھ مصلحت کو اچک کر اپنی فہم کے مطابق شریعت کی دفعات بتانے لگتا ہے۔ یہود کی مثال تمہارے سامنے ہے انہوں نے خیال کیا کہ شارع نے معاصی سے روکنے کے لیے حدود کا حکم محض اس لیے دیا تھا کہ دنیا میں امن قائم ہو اور معاملات درست رہیں۔ پھر انہیں یہ نظر آیا کہ زانی کے لیے جو سزائے رجم شارع نے مقرر کر رکھی ہے اس سے آپس کی اختلاف اور جدال و قتال پیدا ہوتا ہے جو بدترین فساد ہے۔ یہ سوچ کر انہوں نے رجم کی سزا کو مجرم کا منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کی سزا سے بدل دینا بہتر سمجھا اور ایسا کیا بھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس فعل کو تحریف اور ترک احکام الٰہی قرار دیا۔

ابن سیرین سے روایت ہے کہ

"سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا۔ چاند اور سورج کی پرستش محض قیاس نے کرائی"

امام حسنؓ نے آیت خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ پڑھ کر فرمایا "یہاں ابلیس نے قیاس کیا اور وہ سب سے پہلا قیاس کرنیوالا ہے۔

امام شعبیؒ سے منقول ہے کہ :-

"قسم خدا کی اگر تم نے قیاس سے کام لیا تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرکے رہوگے"

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ :-

"تین چیزیں قصرِ اسلام کو ڈھادیں گی، ایک عالم کی لغزش، دوسری منافق کا قرآن سے استدلال تیسری گمراہ ائمہ کے احکام"۔

یہ تمام باتیں اس قیاس کے متعلق ہیں جس کا سرشتہ کتاب و سنت سے نہ ہو بلکہ محض وہمی اور عقلی ہو۔

اتباع اجماع فتنہ تحریف کا چوتھا ذریعہ اتباع اجماع ہے۔ اجماع سے مراد یہ ہے کہ حاملین شریعت کا ایک گروہ، جس کی اصابت رائے پر عام لوگوں کو اعتقاد ہو، کسی چیز پر اتفاق کرے اور لوگ یہ سمجھیں کہ مجرد اتفاق ہی حجت شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کا اتباع اجماع اس وقت تحریف دین کے مترادف ہو جاتا ہے جب اس اجماع کی اصل کتاب وسنت میں موجود نہ ہو۔ اور یہ وہ اجماع نہیں ہے جس کے حجت ہونے پر اُمت کا اتفاق ہے کیونکہ اُمت کا اتفاق تو اسی اجماع کے اتباع پر ہے جس کی سند کتاب وسنت میں موجود ہو یا جو کتاب و سنت سے مستنبط ہو رہا وہ اجماع جس کی اصل نہ قرآن میں ہو نہ حدیث میں، سو اس کو کسی نے بھی حجت نہیں مانا۔ بلکہ اس کے اتباع کی مذمت میں تو قرآن کہتا ہے کہ وَاِذَا قِیْلَ لَہُمُ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اس چیز

پیرو خدا نے اتاری ہے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار میں یہود نے جو دلیل پیش کی تھی وہ اسی اتباع اجماع پر مبنی تھی ان کے اسلاف نے بزعم خود ان انبیائے صادقین کے حالات کا تفحص کیا اور انہیں نبوت کے معیار پر نہ پایا ان کا انکار ہمیشہ کے لیے ایک برہانِ قاطع بن گیا۔ نصاریٰ کے اندر بھی اسی اتباع اجماع نے بے شمار گمراہیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ ان میں تورات انجیل کے خلاف اور ان کے احکام سے زائد صدہا باتیں شریعت کی حیثیت سے موجود ہیں جن کے بارے میں ان کے پاس "سلف اجماع" کے سوا اور کوئی دلیل نہیں۔

تقلید

پانچواں سرچشمہ جہاں سے تحریف دین کا سیلاب پھوٹتا ہے کسی غیر معصوم (غیر نبی) انسان کی اندھی تقلید ہے یعنی کوئی عالم دین کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور اس کے مقلدین بغیر دلیل و حجت محض حسن ظن کی بناء پر یہ خیال کریں کہ امام کا اجتہاد قطعاً یا غالباً صحیح ہے پھر اس خیال کے ماتحت کسی صحیح حدیث کو اس کے اجتہاد کے لیے رد کر دیں یہ تقلید وہ تقلید نہیں ہے جس کے جواز پر اُمت مرحومہ کا اتفاق ہے اُمت نے مجتہدین کی تقلید کے جواز پر جو اتفاق کیا ہے وہ چند قیود کے ساتھ ہے اوّلاً آدمی کو یہ علم و اعتقاد رکھنا چاہیے کہ مجتہد معصوم نہیں ہے۔ اس کا اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی ثانیاً اسے ہر وقت ارشاد نبوی کی تلاش میں اس عزم کے ساتھ لگا رہنا چاہیے کہ جب کبھی کوئی صحیح حدیث اجتہاد امام کے برخلاف مل جائے تو وہ امام کی تقلید اس مسئلہ میں ترک کر دے گا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے متعلق فرمایا کہ یہود اپنے علماء و مشائخ کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ کرتے یہ تھے کہ جس چیز کو یہ لوگ حلال کہہ دیتے اسے وہ بغیر کسی حجت شرعی کے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے یہ حرام کہہ دیتے اُسے حرام سمجھ لیتے تھے۔۔

غلط مذاہب دین کے اندر فتنہ تحریف کے گھسنے کا چوتھا راستہ مختلف مذاہب اور شرائع کا باہم اس طرح غلط ملط کر دینا ہے کہ ایک دوسرے سے متمیز نہ ہو سکے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی پہلے کسی اور مذہب کا پیرو رہتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر اپنی سابق مذہبی سوسائٹی کے علوم و نظریات پوری طرح حاوی ہوتے ہیں پھر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں ان پرانے نقوش کا اثر باقی رہتا ہے انجام کار یہاں بھی ان علوم و نظریات کی توقیر و قبولیت چاہتا ہے خواہ وہ بجائے خود کیسے ہی بے جان اور بے اصل ہوں حتی کہ بسا اوقات وہ اس کے لیے روایتیں گھڑنے پر اتر آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل برابر راہ اعتدال پر قائم رہے یہاں تک کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خالص اسرائیلی نہ تھے (باپ اسرائیلی تھا) اور ماں دوسری قوم سے) یعنی لونڈی زادے تھے ان لوگوں نے دین میں رائے کو دخل دیا نتیجہ یہ ہوا خود گمراہ ہوئے اور اوروں کو بھی گمراہ کر دیا چنانچہ خود ہمارے دین میں بھی آج بے شمار علوم اسی نوع کے داخل ہو چکے ہیں مثلاً اسرائیلی علوم، خطبا جاہلیت کے اقوال، یونان کا فلسفہ، ایران کی تاریخ، علم نجوم رمل اور علم کلام وغیرہ۔ رسول اللہ صلعم کے حضور میں جب تورات پڑھی گئی تو آپ بہت خفا ہوئے، اس خفگی میں یہی راز تھا۔ نیز کتاب دانیال کے طالب کو حضرت عمرؓ نے اسی وجہ سے سزا دی تھی۔ (ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

ترجمان القرآن جنوری ۱۹۲۹ء

اسلام کا فلسفۂ عمرانؒ

انسان اس لحاظ سے حیوانات کا شریکِ حال ہے کہ اس کو بھی دوسرے جانوروں کی طرح غذا اور پانی کی، مجامعت اور تناسل کی، سردی اور گرمی سے بچنے کی، اور ایسے ہی دوسرے طبعی امور کی حاجت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام حاجات کو پورا کرنے کے اسباب و وسائل انسان اور حیوان دونوں کے لیے فراہم کر رکھے ہیں۔ اور پھر وہ اللہ ہی ہے جو ہر ایک نوعِ حیوانی کو اسکی مخصوص نوعیت کے مطابق طبعی طور پر الہام کرتا ہے کہ وہ کس طرح ان اسباب و وسائل سے کام لیکر اپنی حاجت پوری کرے۔ مثلاً وہ شہد کی مکھی کو الہام کرتا ہے کہ وہ کس طرح پھولوں سے رس چوسے، کس طرح شہد بنائے، کس طرح چھتہ تیار کرے، کس طرح اپنے ہم نوع کے ساتھ مل کر رہے اور کس طرح اپنی ملکہ کی اطاعت کرے۔ اسی طرح وہ چڑیا کو الہام کرتا ہے کہ وہ اپنی بھوک کو رفع کرنے کے لیے کونسی چیزیں کس طرح کھائے، اپنی پیاس کو رفع کرنے کے لیے کیا چیز کس طرح پیئے۔ اپنی جان بچانے کے لیے بلی اور شکرے کے مقابلے میں کیا تدبیر کرے۔ اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لیے نر اور مادہ کس طرح ملیں۔ کیسے گھونسلا بنائیں۔ چڑیا انڈے دینے اور سینے کا کام اور چڑا دانہ فراہم کرنے کا کام کیسے کرے پھر بچے ہوں تو وہ ان کو کس طرح پالیں اور کب تک پالنے پوسنے اور انکی حفاظت کرنے کا فرض انجام دیں۔ اسی طور پر ہر نوع کے لیے ایک شریعت ایک طریقہ ہے، جس کو فرداً فرداً

ؒ یہ مضمون حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف ابواب کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ اقتباسات کے درمیان ربط پیدا کرنے کیلئے ایسے ٹکڑے لگا دیئے گئے جو شاہ صاحب کے اصل الفاظ میں نہیں ہیں مگر ان کے فلسفہ کی روح کے حامل ہیں۔

اس نوع کے ایک ایک شخص کے سینے میں بطریق الہام اتار دیا جاتا ہے۔ اور یہی معاملہ انسان کے ساتھ بھی ہے کہ اُس کے مقتضائے فطرت کے مطابق اسکی ساخت بنائی گئی اور اسکی حاجات پوری کرنے کے لیے اسباب و وسائل فراہم کر دیئے گئے، اور پھر اس کو الہام کیا گیا کہ وہ کس طرح ان اسباب و وسائل سے کام لے کر اپنی ان ضرورتوں کو رفع کرے۔

مگر انسان کی نوعی خصوصیت (یعنی اسکی انسانیت) کے اقتضاء سے تین باتیں اس کے لیے ایسی رکھی گئی ہیں جو دوسرے حیوانات کے لیے نہیں ہے۔

ایک یہ کہ اسکی حاجات محض جسمانی نہیں ہیں بلکہ وہ ان سے بالاتر چیزوں کی حاجت بھی اپنے اندر پاتا ہے۔ اس کو محض طبعی داعیات مثلاً بھوک، پیاس شہوت وغیرہ ہی عمل پر نہیں ابھارتے، بلکہ عقلی داعیات بھی ہیں جو اسے کسی ایسے نفع کی طلب یا کسی ایسے نقصان سے بچنے کی کوشش پر ابھارتے ہیں جس کا تقاضا عقل کرتی ہے نہ کہ حیوانی طبیعت مثلاً وہ ایک صالح نظام تمدن مانگتا ہے، تکمیل اخلاق اور تہذیب نفس کی پیاس اپنے اندر محسوس کرتا ہے دور رس منفعتوں کا تصور کرتا ہے اور ان کے لیے قریب کے نقصانات گوارا کرتا ہے بعید نقصانات کا ادراک کرتا ہے اور ان سے بچنے کی خاطر قریبی فائدوں اور منفعتوں کا تصور کرتا ہے اور اُن کے لیے قریب کے نقصانات گوارا کرتا ہے، بعید نقصانات کا ادراک کرتا ہے اور ان سے بچنے کی خاطر قریبی فائدوں اور منفعتوں کو قربان کر دیتا ہے عزت شرف اور جمال اور خیر وغیرہ عقلی امور کے متعلق نظریات قائم کرتا ہے اور انکی طلب میں سعی کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسکی فطرت حیوانات کی طرح محض اپنی حاجات پوری کرنے اور ان کے لیے اسباب و وسائل سے کام لینے پر ہی قناعت نہیں کرتی بلکہ ہر چیز میں لطافت اور حسن و خوبی کی طالب ہوتی ہے، اور اس کے بھی کسی خاص مرتبہ کو پہنچ کر ٹھیر جانے پر راضی نہیں ہوتی بلکہ ہر مرتبہ کے بعد کامل تر مرتبے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ مثال کے طور پر حیوانی حاجت محض غذا ہے تاکہ بھوک رفع ہو اور زندگی برقرار رہے۔ مگر انسانی فطرت اس کے ساتھ لذت کام و دہن اور لطف ذوق و نظر بھی مانگتی ہے اور پھر تنوع کے لیے بیقرار ہوتی ہے اسی طرح وہ صرف لباس نہیں بلکہ لباسِ فاخر، صرف مسکن نہیں بلکہ مسکنِ لطیف

اور صرف صنفِ مقابل نہیں بلکہ اس کا حسین و جمیل فرد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

تیسرے یہ کہ جس طرح انسانی حاجات کی نوعیت حیوانی حاجات کی نوعیت سے مختلف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی کیفیت بھی انسان کے حق میں اُس الہام سے مختلف ہے جو حیوانات پر ہوتا ہے۔ حیوانات کے بخلاف نوعِ انسانی کے سب افراد پر سب حاجتوں کے بارے میں یکساں الہام نہیں ہوتا بلکہ مختلف قسم کی حاجات کے لیے مختلف اوقات میں مختلف قابلیتوں کے لوگوں پر مختلف طرز کے الہامات ہوتے ہیں جن سے مدد لے کر انسان مفید تر اور صالح تر طریقہائے انتفاع کا استنباط کرتا ہے۔ بعض حاجات سرے سے بعض انسانوں کے سینے میں کھٹکتی ہی نہیں اور بعض کے سینوں میں کھٹکتی ہیں۔ پھر جو حاجات بہت سے انسانوں کے سینے میں کھٹکتی ہیں ان کو پورا کرنے کا طریقہ یا بہتر طریقہ ان سب کو الہام نہیں ہو جاتا بلکہ کسی ایک پر الہام ہوتا ہے اور پھر دوسرے انسان اس سے وہ طریقہ اخذ کرتے ہیں۔ یوں انسانی زندگی میں نئی نئی حاجتوں کا اضافہ ہوتا ہے، ان کو پورا کرنے کے طریقے نکلتے ہیں، اور پھر پچھلے طریقوں سے بہتر طریقے نکلنے کا سلسلہ چلتا ہے۔

یہی تین خصوصیات دراصل انسانی تمدن کی پیدائش اور اس کے اختلاف و تنوع اور اس کے نشو و نما اور ترقی کی بنیاد ہے۔ اب اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں خصوصیات کی بناء پر قدرتی اسباب و وسائل سے انسان کے انتفاع اور الہامِ الٰہی کی رہنمائی کے دو درجے ہیں۔

پہلا درجہ وہ ہے جس کو اجتماعی زندگی اور مدنیت کا ڈھانچہ کہنا چاہیے اس کے بڑے بڑے ارکان یہ ہیں:- اداءِ مافی الضمیر کے لیے زبان کا استعمال۔ آلات، اسلحہ اور برتنوں کی صنعت اور ان کا استعمال۔ زراعت باغبانی اور آبپاشی وغیرہ۔ کھانے کی صنعت لباس کی صنعت۔ مساکن کی صنعت۔ جانوروں کو مسخر کرنا اور ان سے مختلف کام لینا۔ عورت اور مرد کے درمیان مستقل تعلق جو منزلی زندگی کی بنیاد ہو۔ مختلف حاجات و ضروریات کے لیے انسان اور انسان کے درمیان اجناس یا اموال یا محنت وغیرہ کا مبادلہ۔ قیام امن اور حفظِ معاملات کے لیے قانون اور فصلِ خصومات کی ضرورت۔ حفظِ صحت اور بقائے حیات

کے لیے دوا اور علاج. داخلی معاملات کا نظم قائم کرنے اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرنے کے لیے ایک ریاست کا قیام ۔ یہ دو چیزیں ہیں جو آغاز تمدن سے کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی مرتبہ میں انسانی اجتماعات کی جزو لاینفک رہی ہیں، اور اس بارے میں کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی مرتبہ کے الہامات انسان پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں جن کی رہنمائی سے انسان فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور اٹھا رہا ہے ۔

دوسرا درجہ اس سے بالاتر ہے اور اس کو تمدن کی صورت نوعی کہنا چاہیے جس میں اس کا حسن یا قبح نمودار ہوتا ہے ۔ اس درجہ میں اس ذوق لطافت، اور اس حب معقولات اور اس جستجوئے کمال کا ظہور ہوتا ہے جسے ہم نے خصوصیات انسانی میں شمار کیا ہے ۔ یہاں انسان اپنے معیار لطافت اور اپنے ادراک معقولات اور اپنے تصورات کمال کے مطابق کھانے، پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے کے مختلف آداب اختیار کرتا ہے۔ اپنے لباس اور اپنے مسکن اور اپنے اسباب زندگی اور اپنے برتاؤ میں شائستگی طہارت اور زینت کے کچھ اصول معین کرتا ہے ۔ اپنے تمدنی معاملات کو خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتے ہوں، یا کسب معاش سے یا سیاست مدن سے یا فصل خصومات سے متعلق ہوں بہتر طریقہ پر سرانجام دینے کے لیے کچھ اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق ضابطے اور قوانین اور اطوار بنا کر کام کرتا ہے ۔ اس درجہ میں دو قسم کے الہام انسان کو دو راستوں کی طرف چلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

ایک الہام شیطانی، جو اشخاص اور جماعتوں کو خود غرضی، نفس پرستی، عیش پسندی، لذت طلبی، تنگ نظرانہ منفعت خواہی، بغض، حسد، ظلم، شقاوت اور بے اعتدالی کی طرف راغب کرتا ہے ۔ لطافت کے معیار، معقولات کے ادراک اور کمال کے تصورات کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے ۔ تمدن کی صورت نوعی میں ظاہری چمک دمک مگر باطنی فساد اور بد اخلاقی پیدا کرتا ہے ۔

دوسرا الہام ربانی جو لطافت کا صحیح معیار، معقولات کا سلیم ادراک، اور کمال کا ٹھیٹھ فطری تصور دیتا ہے اور اسی کے مطابق شائستگی، طہارت، زینت اور حسن تدبیر و

حُسنِ معاملت کے آداب واطوار معین کرتا ہے۔[1]

ان مبادی کو ذہن نشین کرنے کے بعد آگے بڑھو۔ انسان اپنی جس فطرت کی بنا پر تمام انواعِ حیوانی سے ممتاز ہے وہ ارتفاق کے پہلے درجے پر قانع نہیں رہتی بلکہ بالارادہ یا بلا ارادہ دوسرے درجے کی طرف پیش قدمی کرتی ہے۔ شائستگی کی کوئی نہ کوئی صورت، کمال کا کوئی نہ کوئی منتہا، اور حُسن کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہی ایسا ہوتا ہے جس کی وہ فریفتہ ہوتی ہے اور اُس کے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ اس میلان ورغبت سے اپنے آپ کو خالی کرے۔ اسی درجے میں انسانی جماعتوں کو اس امر کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کوئی حکیم انکی رہنمائی کرے جو انکی حاجت کو سمجھتا ہو اور اس حاجت کو پورا کرنے کا طریقہ ان کو بتائے یہ رہنمائی کرنے والے حکماء دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو اپنی فکر اور قوتِ فہم وادراک سے حکمت کا استنباط کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے نفس میں اتنی زبردست قوتِ ملکیہ ہوتی ہے کہ وہ براہ راست ملاءِ اعلیٰ سے علم وحکمت حاصل کرتے ہیں دوسرا گروہ پہلے گروہ سے افضل ہے، اسکی رہنمائی زیادہ قابلِ وثوق ہے اور اسی کی ہدایت سے انسان اپنی فطرت کے مقتضیٰ کو زیادہ صحیح اور مکمل طور پر پہنچ سکتا ہے کیونکہ پہلے گروہ کے کام میں حکمت کے ساتھ جہل اور شیطانی وساوس کی آمیزش بھی ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اعتدال قائم نہیں رکھ سکتے۔

پھر ارتفاق کا ظہور جن تمدنی صورتوں اور طورطریقوں میں ہوتا ہے ان کے اندر مفاسد گھس جاتے ہیں، اور ان مفاسد کے گھسنے کا راستہ اس طرح کھلتا ہے کہ ایک طرف تو جماعت کی رہنمائی وسیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جنہوں نے عقلِ کلی سے بہرہ نہیں پایا ہے یہ لوگ حیوانی، شہوانی یا شیطانی اعمال اختیار کرکے جماعت میں ان کو رواج دیتے ہیں اور دوسری طرف جماعت میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ان رئیسوں کی پیروی کرتے ہیں ان مفاسد سے تمدن کو پاک کرنے کے لیے بھی ایک طاقت ور شخصیت

---

[1] اقتباس از بحث ارتفاقات

کی ضرورت ہوتی ہے جسے غیبی تائید حاصل ہو اور جو مصلحت کلیہ کی بھی تابع ہو اور رازداں بھی ہو تاکہ زندگی کے باطل طور طریقوں کو ایسی غیر معمولی تدبیروں سے حق کی طرف پھیر دے جو بجز تائید غیبی کے آدمی سے بن نہیں آتیں۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو خدا کی بندگی و عبادت سکھانے کے ساتھ ان کو صحیح طور پر دنیا میں کام کرنے کے اصول بتاتے جائیں اور زندگی کے فاسد طریقے مٹا دیتے جائیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

بعثت لمحق المعازف

میں لہو ولعب کے آلات کو مٹانے آیا ہوں۔

اور یہ کہ

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

میں مکارم اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچانے آیا ہوں۔

اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ نبی کا کام عقائد اور عبادات کی تعلیم دینے کے ساتھ تمدن کی اصلاح بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہرگز نہیں ہے کہ لوگ اسباب عالم سے کام لینا چھوڑ دیں۔ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی اس کی تعلیم نہیں دی اور روحانی ترقی کا راستہ ہرگز یہ نہیں ہے جیسا کہ ان لوگوں نے گمان کیا ہے جو سرے سے تمدنی و اجتماعی زندگی کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور وحوش کی سی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ اسی بنا پر جن لوگوں نے قطع علائق کا ارادہ ظاہر کیا ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مابعثت بالرھبانیۃ وانما بعثت بالحنیفیۃ السمحہ

(میں رہبانیت سے کر نہیں آیا ہوں بلکہ مجھے سیدھی سادی شریعت دے کر بھیجا گیا ہے)

پس درحقیقت انبیاء علیہم السلام کو دنیا اور اس کے اسباب سے ترک تعلق کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی اور اسباب دنیوی سے انتفاع میں صحیح اعتدال پیدا کریں تاکہ انسان نہ تو شاہان عجم کی طرح دنیا پرست بندۂ عیش بن جائے اور

نہ غیر متمدن وحشی بن کر رہے۔ خوشحالی ایک لحاظ سے اچھی چیز ہے کیونکہ اس سے اخلاق میں راستی اور مزاج میں درستی پیدا ہوتی ہے اور انصاف کی اُن صفات کو ظاہر ہونے کا موقع ملتا ہے جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہیں۔ دوسرے لحاظ سے خوشحالی بُری چیز بھی ہے کیونکہ وہ انسان کو دُنیا کے دھندوں میں پھنسا کر خدا سے غافل اور فکر عاقبت سے بے پرواہ بنا دیتی ہے۔ ان متضاد کیفیات کے درمیان توسط و اعتدال کی صحیح صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان کو اسباب دنیوی سے نفع اٹھانے کا پورا موقع دیا جائے مگر اس انتفاع کی بنیاد نفس پرستی پر نہیں بلکہ خدا پرستی پر ہو اور دنیوی کاروبار کے دوران میں بار بار خدا کو یاد دلایا جائے، اور ایسے آداب اور ضوابط مقرر کر دیئے جائیں کہ انتفاع اپنی حد سے گذر کر ظلم اور فساد تک نہ پہنچنے پائے۔

تمدنی معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی کے طور طریقوں پر نظر کی جائے کھانے اور پینے میں، لباس اور مکان میں، زینت اور تجمل میں ان کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں؟ ازدواجی زندگی اور خاندانی روابط میں وہ کن قاعدوں پر چلتے ہیں؟ خرید و فروخت اور دوسرے معاملات میں ان کے درمیان کس قسم کے طریقے رائج ہیں؟ جرائم کی روک تھام اور نزاعات کے تصفیہ میں ان کے درمیان قوانین کیسے ہیں؟ اسی طرح زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں پر بھی نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ جو طریقے لوگوں میں رائج ہیں ان میں سے کون سی چیزیں مصلحت کلی کے مطابق ہیں اور کون اس کے خلاف؟ جو چیزیں اس مصلحت کے مطابق ہوں ان کو مٹانے یا کسی دوسری چیز سے بدلنے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی طرف شوق اور رغبت دلاتے ہیں، ان پر قائم رہنے کی تاکید کرتے ہیں، اور ان کی حکمت و مصلحت سمجھاتے ہیں۔ اور جو چیزیں مصلحت کلی کے خلاف ہوں اور ان کو مٹا دینے یا بدل دینے کی ضرورت ہو، مثلاً جو بعض انسانوں کے لیے موجب نفع و راحت اور بعض کے لیے موجب نقصان و اذیت ہوں۔ یا جن کی وجہ سے انسان لذات دنیوی میں منہمک ہو کر عیش کا بندہ بن جاتا ہے، یا جو آدمی کو طریق احسان سے ہٹا دینے والی ہوں، یا جو انسان کو جھوٹی تسلی دے کر دنیا اور آخرت کی مصلحت کے لیے عمل

کرنے سے غافل کر دیتی ہوں، ایسی چیزوں کے باب میں انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ
ہے کہ وہ انسان کو دفعتہً ایسی اصطلاحات کی طرف نہیں پھیر دیتے جن سے وہ بالکل مانوس
نہ ہوں بلکہ حتی الامکان انہیں ایسے طریقوں کی تعلیم دیتے ہیں جن کے نظائر ان کے درمیان
پہلے سے پائے جاتے ہوں۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اختلاف
رہا ہے حالانکہ دین ان سب کا ایک تھا۔

بالغ النظر لوگ اس راز کو جانتے ہیں کہ نکاح اور طلاق اور معاملات زینت اور لباس
اور قضاء اور حدود اور تقسیم غنائم کے باب میں شریعت نے بالکل انوکھے طریقے ایجاد نہیں کئے
ہیں کہ لوگ پہلے ان کو بالکل نہ جانتے ہوں، بلکہ انہی طریقوں کو باقی رکھا ہے جو پہلے سے رائج
تھے اور صرف اُن اجزاء کو ملایا مٹایا ہے جو فاسد تھے۔ خون کے بدلے میں دیت کا طریقہ
پہلے سے رائج تھا۔ خراج، عُشر اور جزیہ سے پہلے بھی دُنیا آشنا تھی۔ زانی کو رجم کرنے
اور سارق کا ہاتھ کاٹنے اور جان کے بدلے جان لینے کا قانون پہلے سے موجود تھا۔ شریعت
محمدیہ نے ان چیزوں کو برقرار رکھا اور صرف ان کو منضبط کر دیا۔ مال غنیمت میں رئیس قوم کا حصہ
پہلے سے مقرر تھا۔ شریعت محمدی نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے پانچواں حصہ معین کر دیا
البتہ جو چیزیں بالکل ہی غلط تھیں ان کو قطعاً حرام کر دیا، مثلاً سود، اور پھلوں کا عیب و صواب
ظاہر ہونے سے پہلے ان کو فروخت کرنا۔ اس باب میں اگر تم زیادہ تعمق سے کام لوگے تو دیکھوگے
کہ انبیاء علیہم السلام نے عبادات میں جدت طرازی سے کام نہیں ہے بلکہ زیادہ تر عبادت
کے وہی طریقے باقی رکھے ہیں جن سے لوگ پہلے سے مانوس تھے۔ البتہ ان میں اتنی اصلاح
کر دی کہ جاہلیت کی تحریفات اور بے اعتدالیاں نکال دیں، اوقات منضبط کر دیئے ارکان
میں باقاعدگی پیدا کر دی، اور عبادت کی ہر صورت کو صرف اللہ کے لیے مخصوص کر دیا۔

رومیوں اور عجمیوں کو جب خلافت ملی اور ایک طویل مدت تک وہ اس منصب پر سرفراز رہے
تو لذات دنیا میں گم ہو کر رہ گئے، اور شیطان ان پر ایسا مسلط ہوا کہ زیادہ سے زیادہ اسباب
عیش فراہم کرنا، اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنی خوشحالی کی نمائش کرنا ان کی زندگی کا مقصد
قرار پا گیا۔ عقل و حکمت کا استعمال بھی ان کے ہاں بس یہی تھا کہ معاشی انتفاع کے دقیق سے

سے دقیق وسائل تلاش کیے جائیں اور پھر اُن سے لطف اٹھانے کے عجیب عجیب طریقے نکالے جائیں۔ اِن کے رؤسا اپنی شانِ ریاست کے اظہار میں جس طرح دولت صرف کرتے ہیں اس کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص کا شمار رئیسوں میں ہوتا ہو اُس کے لیے دو لاکھ درہم سے کم قیمت کا تاج پہننا عار کی بات تھی

اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک عالیشان محل میں رہے

جس کے ساتھ آبزن اور حمام اور باغ بھی ہوں، غلاموں کی ایک فوج اسکی خدمت میں اور قیمتی گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد اس کے اصطبل میں ہو، اُس کا دسترخوان نہایت وسیع ہو اور بہتر سے بہتر کھانے اس کے مطبخ میں ہر وقت تیار رہیں۔ ان چیزوں کی تفصیلات تمہارے سامنے بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ اپنے عہد کے امراء و رؤسا کی زندگی میں تم خود یہی رنگ دیکھ رہے ہو۔ غرضیکہ یہی چیزیں ان کے اصولِ معاش میں گھس گئیں اور ایسی جیسی کہ دلوں سے اِن کا نکلنا محال ہے۔ یہ ایک بیماری تھی جو اُن کے تمدن کی رگ رگ میں اتر گئی۔ اس کے اثرات بازاروں اور پرگنوں تک پھیل گئے۔ مزدور اور کسان تک اِن سے بچ نہ سکے۔ اس نے چند محلوں میں عیش و عشرت کے سامان جمع کرنے کے لیے ملکوں اور اقلیموں کی بے شمار مخلوق کو مصائب میں مبتلا کر دیا، اس لیے کہ یہ سامان جمع نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ اِن کے لیے پانی کی طرح روپیہ نہ بہایا جاتے اور اتنی کثیر دولت فراہم کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ تاجروں اور کاشت کاروں اور دوسرے محنت کش طبقے پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جائیں، پھر اگر ٹیکسوں کی زیادتی کے سبب سے تنگ آکر یہ غریب طبقے روپیہ دینے سے انکار کریں تو اِن کو فوجوں سے پامال کرایا جاتے، اور اگر طاقت سے ڈر کر وہ اطاعت میں سر جھکا دیں تو اِن کو گدھوں اور بیلوں کی طرح محنت میں جوت دیا جائے تاکہ وہ رات دن رئیسوں کے لیے دولت پیدا کرنے میں لگے رہیں اور اِن کو دم لینے کی فرصت نہ ملے کہ خود اپنی سعادتِ دُنیا و آخرت کے لیے بھی کچھ کر سکیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں کروڑوں کی آبادی میں مشکل ہی سے ایسا شخص ملتا ہے جس کی نگاہ میں دین و اخلاق کی کوئی اہمیت ہو وہ بڑے بڑے کام جن پر نظامِ عالم کی بنا قائم ہے اور جن پر انسانی فلاح و ترقی کا مدار ہے قریب قریب معطل ہو گئے تھے۔

وگ زیادہ تر یا تو ان صنعتوں میں لگ جاتے تھے جو رؤسا کے لیے لوازمِ عیش پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں، یا پھر ان فنون اور ان پیشوں کو اختیار کرتے تھے جن سے رئیسوں کو عموماً دلچسپی ہوا کرتی تھی اس لیے کہ ان کے بغیر کوئی شخص رؤسا کے ہاں درخور حاصل نہ کر سکتا تھا، اور رؤسا کے ہاں درخور حاصل کرنے کے سوا خوشحالی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ایک اچھی خاصی جماعت شاعروں مسخروں، نقالوں، گویوں مصاحبوں، شکاریوں اور اسی طرح کے لوگوں کی پیدا ہو گئی تھی جو درباروں سے وابستہ رہتی تھی، اور ان کے ساتھ اگر اہلِ دین تھے بھی تو وہ حقیقت میں دیندار نہ تھے بلکہ کسبِ معاش کے لیے دین کا پیشہ کرتے تھے تاکہ اپنے زہد کی نمائش سے یا اپنے شعبدوں سے، یا اپنے مکر و فریب سے کچھ کما کھائیں۔ اس طرح یہ مرض ان ممالک میں انسانی جماعت کو اوپر سے لیکر نیچے تک گھن کی طرح کھا گیا تھا۔ اُس نے پوری پوری قوموں کے اخلاق گرا دیتے تھے اور ان کے اندر ذلیل خصلتیں پیوست کر دی تھیں اسکی بدولت ان کی سرزمین میں اتنی صلاحیت نہ رہی تھی کہ خدا پرستی اور مکارمِ اخلاق کا بیج اس کے اندر جڑ پکڑ سکے۔ اس مرض کی حقیقت کا صحیح اندازہ اگر تم کرنا چاہو تو کسی ایسی قوم کا تصور کرو جس میں اس نوع کی خلافت و ریاست نہ ہو۔ جہاں کھانے اور لباس میں مبالغہ نہ کیا جاتا ہو، جہاں ہر شخص اپنی ضروریات کے لیے خود کافی کام کر لیتا ہو اور اس کی پیٹھ پر ٹیکسوں کا بھاری بوجھ لدا ہوا نہ ہو۔ ایسی جگہ لوگوں کو دین و ملت کے امور پر توجہ کرنے اور تہذیبِ انسانی کو ترقی دینے کے لیے کافی فراغت و طمانیت نصیب ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی حالت کا تصور کرو جس پر اس نوع کی خلافت و ریاست سوار ہو گئی ہو اور اس نے اپنے خدم و حشم سمیت ملک پر مسلط ہو کر اپنی خدمت لینے کے سوا بندگانِ خدا کو کسی اور کام کے قابل نہ رکھا ہو۔

جب روم و عجم کے ممالک پر یہ مصیبت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور مرض اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اللہ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس نے اس مرض کا علاج کرنے کے لیے فیصلہ کر دیا کہ مرض کی جڑ کاٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ اُس نے ایک نبی اُمی کو مبعوث کیا جو رومیوں اور عجمیوں سے کھلا ملا نہ تھا اور جس تک انکی عادات و خصائل کا کوئی اثر نہ پہنچا تھا۔ اس کو صحیح

اور غلط، صالح اور فاسد میں امتیاز کرنے والی میزان بنا دیا اسکی زبان سے عجمی اور رومی عادات قبیحہ کی مذمت کرائی۔ حیات دنیا میں استغراق اور لذات دنیوی میں انہماک کو مردود ٹھہرایا۔ عجمی عیش پرستی کے ارکان میں سے ایک ایک کو چن کر حرام کیا۔ مثلاً سونے اور چاندی کے برتن، سونے اور جواہر کے زیور، ریشمی کپڑے، تصاویر اور مجسمے وغیرذالک غرضیکہ اللہ نے اس نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی سرداری سے روم و عجم کی سرداری کا استیصال کر دیا اور اعلان کروایا کہ

هلك كسرى فلا كسرى بعده وهلك قيصر فلا قيصر بعده

اس طرح معیشت اور تمدن کی وہ تمام گمراہیاں جو انسان کی زندگی کو تنگ کرنے والی ہیں اُس ہادی برحق کے ذریعے مٹا دی گئیں۔ خون کے بدلے لینے کا جاہلانہ طریقہ جس کی بنا پر ایک شخص کے قتل کی بدولت دو خاندانوں میں پشتوں تک عداوت چلتی تھی یکلخت بند کر دیا گیا۔ میراث جس میں رو ساقوم اپنے حسب منشاء جس طرح چاہتے تھے فیصلے کرتے تھے اس کے لیے ایک ضابطہ بنا دیا گیا۔ سود جسکی بدولت ایک شخص کچھ روپیہ دے کر دولت کے ڈھیر کے ڈھیر جمع کرتا چلا جاتا تھا اور دوسرے شخص کی زندگی تنگ ہو جاتی تھی یکسر حرام کر دیا گیا۔ بیع و شراء کے وہ تمام طریقے جن سے ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے فریق کا نقصان ہو ممنوع ٹھیرا دیئے گئے۔ جوئے کی ساری اقسام حرام کر دی گئیں کیونکہ یہ سب انتفاع کے غیر فطری طریقے ہیں۔[1]

ترجمان القرآن اپریل ۱۹۳۹ء

---

[1] باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ملخصاً

اسلامی قانونِ معیشت

اسکی روح اور اسکے اصول

جب کسی جگہ انسانوں کی کثیر تعداد سکونت پذیر ہو تو دوسرے تمدنی معاملات کے ساتھ ان کے معاشی امور کی تنظیم بھی ضروری ہوتی ہے، اور یہ دیکھنا حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ معاشی رجحانات غیر متوازن اور نامناسب نہ ہونے پائیں، ورنہ اگر باشندوں کی اکثریت مثلاً صنعت و حرفت اور ملکی نظم و نسق میں مشغول ہو جائے اور جانوروں کی پرورش، غلہ کی کاشت اور اشیائے خوردنی کی فراہمی محض چند لوگوں تک محدود رہ جائے تو ان کی دنیوی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کچھ لوگوں نے کسب معاش کے لیے شراب کشید کرنے اور بت تراشی کا مشغلہ اختیار کر لیا تو عوام الناس میں خواہ مخواہ ان اشیاء کے معروف عام مفاسد پھیل کر رہیں گے اور ان کی اخلاقی زندگی برباد ہونے سے نہ بچ سکے گی۔ لیکن اگر حکومت لوگوں کو اس طرح بے راہ رو نہ ہونے دے اور تمدن کی بہبودی اور ملکی معیشت کے مصالح کی پوری نگہداشت کر کے پیشوں اور حصول رزق کے ذرائع کو لوگوں پر توازن کے ساتھ تقسیم کر دے اور انھیں غیر مفید اور ناجائز وسائل معاش اختیار کرنے سے روک دے تو جمہور کی زندگی نہایت آسائش اور سکون کے ساتھ گذرے گی۔

فسادِ تمدن زیادہ تر امراء کی نفس پرستیوں کا رہین منت ہوا کرتا ہے۔ وہ زندگی کی سادہ اور حقیقی ضروریات سے گذر کر دنیا کی رنگ رلیوں کے شیدائی بن جاتے ہیں۔ عام لوگ ان کے نفسانی میلانات کو دیکھ کر، اور ساہنی کو منفعت بخش پا کر ان کی شہوات نفس کی تسکین کے لیے طرح طرح کے طریقے ایجاد کرتے اور اپنی روزی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ایک گروہ لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دینے کے لیے تربیت گاہ کھولتا ہے۔ دوسرا رنگ برنگ کے قیمتی خوش نما اور

منقش لباس فاخرہ تیار کرتا ہے۔ تیسرا حسین و دلفریب زیورات کی صنعت اختیار کر لیتا ہے۔ چوتھا اونچے اونچے خوبصورت ایوانات تعمیر کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ جب کسی بدقسمت ملک کی اکثریت ان وسائل معاش پر جھک پڑتی ہے تو دوسرے اہم تر وسائل معیشت اور مفید تر مشاغل تمدن متروک و مہجور ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو تھوڑے بہت بدنصیب ان پیشوں کو اختیار بھی کیے رہتے ہیں ان کی گردن ٹیکسوں کے بھاری بوجھ سے ناقابل برداشت حد تک دبی رہتی ہے کیونکہ امراء کو ان تمام لوازم عیش و عشرت کی فراہمی کے لیے بے شمار دولت کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ دولت اس وقت تک جمع نہیں ہو سکتی جب تک کہ کاشت کاروں، تاجروں اور صناعوں کا پیٹ نہ کاٹا جائے۔ نیز یہ امراء اپنی قربان گاہ نفس کی نذروں سے اتنی فرصت ہی نہیں پاتے کہ حقیقی مصالح ملک و ملت پر ایک حبہ خرچ کر سکیں۔ انجام کار تمدن زہریلے مفاسد کی بھینٹ چڑھنا شروع ہوتا ہے اور یہ فساد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پوری قوم میں سرایت کر جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور بلک بلک کر جان دے دیتی ہے۔ دنیوی عروج سے یوں ہاتھ دھوتی ہے تو اخروی کا کمال کا پوچھنا ہی کیا۔

یہی وہ مرض ہے جو ظہور اسلام کے وقت عجمی ممالک پر مسلط تھا۔ لہذا خدا نے اپنے فرستادہ آخری روحانی طبیب کو اشارہ کیا کہ اس مرض مزمن کی جڑ کاٹ کر پھینک دے۔ اس طبیب حاذق نے مرض کی اچھی طرح تشخیص کر کے ان تمام منافذ کو بند کر دیا جن کے متعلق گمان غالب تھا کہ مرض کے جراثیم انہیں سے گذر کر پیکر انسانیت میں داخل ہوتے ہیں، اور صرف سلبی پہلو پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایجاباً ایک صالح نظام معیشت کی بنا ڈالی جو خالص اصول فطرت پر مبنی تھا۔

معیشت کے فطری اصول و مبادی:۔

وہ فطری اصول و مبادی جن پر اسلامی قوانین معیشت کی بنا رکھی گئی ہے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اللہ تعالٰی نے اپنی مخلوق کو زمین پر پیدا کر کے ان کی روزی کا سامان بھی اسی زمین میں فراہم کیا، اور ان سب کے لیے زمین کے وسائل سے اکتساب رزق کو مباح کر دیا۔ پھر جب ان کے درمیان خود غرضانہ مسابقت (COMPETITION) اور باہمی تنازع

(STRUGGLE) کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر فرد یہ ان تھک کوشش کرنے لگا کہ دوسروں کو محروم کرکے خود زیادہ سے زیادہ وسائل معاش پر قابض ہو جائے تو اللہ تعالےٰ نے اس مفسدۂ عام کو دور کرنے کے لیے یہ حکم نازل فرمایا کہ جو شخص کسی جگہ پر پہلے قابض ہو جائے یا کسی وسیلۂ اکتساب رزق (MEANS of livelihood) کو پہلے حاصل کرلے تو اس سے نفع اٹھانے کا حق ترجیح اس کو حاصل ہے، اور دوسرا شخص اس حق سے اس کو محروم نہیں کرسکتا تاوقتیکہ پہلا شخص مبادلہ یا باہمی رضامندی سے اس کو دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اسی چیز کا نام "حق ملکیت" ہے اور اس کا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

من احییٰ الضامیتۃ فھی لہ — جس شخص نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا، وہی اسس زمین کا مالک ہے۔

مردہ زمین سے مراد بے کار پڑی ہوئی زمین ہے۔ اور اس کو زندہ کرنے سے مراد کارآمد بنانا ہے۔

اسس ارشاد نبوی کا فلسفہ وہی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی ہر شے کا مالک حقیقی تو خدا ہی ہے، حقیقی ملکیت اس کے سوا کسی کو نہیں پہنچتی۔ لیکن جب خدا نے اپنے بندوں کو اپنی اس ملکیت سے عام انتفاع کی اجازت دے دی تو طبعاً ان میں منافست اور منازعت پیدا ہوئی۔ اس کے سدباب کے لیے یہ حکم صادر کیا گیا کہ جس چیز پر ایک شخص پہلے پہل قابض ہو وہ اس کی ملک سمجھی جائے گی۔ لہٰذا جب کوئی شخص کسی افتادہ اور غیر مزروعہ زمین کو جو آبادی کے احاطہ سے باہر ہو، سب سے پہلے اور دوسروں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر آباد کرے یا قابل انتفاع بنائے، تو وہ اس زمین کا مالک ہو جاتا ہے اور اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ زمین ساری کی ساری درحقیقت مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے جو مصلیوں اور مسافروں کے لیے وقف رہتی ہیں، اور سارے نمازی مسجد کے استعمال میں نیز سارے مسافر سرائے کے استعمال میں اصلاً برابر کے شریک اور حقدار ہیں۔ لیکن جو پہلے آکر کسی گوشہ کو گھیر لیتا ہے وہ اس خاص جگہ کے استعمال کرنے کا بہ نسبت دوسروں کے زیادہ مستحق ہو جاتا ہے۔ اور ملک کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان کسی شے سے

انتفاع کا حق دوسروں کی نسبت زیادہ رکھتا ہے۔

اس اصول کو رسول اللہ صلعم نے ایک اور ارشاد میں یوں بیان فرمایا ہے۔

عادی الارض للہ ورسولہ ثم　　عادی الارض اللہ اور اس کے رسول کی ہے پھر یہ
ھی لکم منی　　منی ملکیت تمہیں میرے واسطہ سے پہنچتا ہے۔

"عادی الارض" اس زمین کو کہتے ہیں جو کسی وقت میں کسی قوم یا فرد کے قبضہ اور ملک میں رہی ہو مگر اب اس کے مالک ہلاک ہو چکے ہوں اور کوئی اس کی ملکیت کا مدعی باقی نہ رہا ہو اس صورت میں زمین پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ یعنی دوبارہ مباح بن جاتی ہے جیسی کہ ابتدا میں تھی، اور جبکہ ایسی زمین اسلامی حکومت کے دائرہ اقتدار میں واقع ہو تو حکومت اس کی مالک ہے، اور وہ اسے پھر جن لوگوں کو چاہے استعمال کے لیے دی سکتی ہے۔

۲ ۔ دوسرا فطری اصول معیشت یہ ہے کہ نظام تمدن ایسا ہو جس میں سب افراد جماعت حصہ لیں اور تعاون کریں اور بجز معذور لوگوں کے کوئی شخص تمدن کے کاروبار میں شریک ہونے سے خالی نہ رہے۔

۳ ۔ تیسری اصل یہ ہے کہ جو چیزیں قدرت نے عام فائدے کے لیے بنائی ہیں اور جن کو کارآمد بنانے میں کسی خاص شخص یا گروہ کی محنت وقابلیت کا دخل نہیں ہے ان کو حتی الامکان اپنی اصل (یعنی اباحت عام) پر باقی رہنا چاہیئے یعنی ہر شخص کو ان سے فائدہ اٹھانے کا حق ہونا چاہیے۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز ایسی ہو کہ اس سے فائدہ اٹھانا بغیر اس کے ممکن نہ ہو کہ اسے روکا جائے، تو ایسی چیز کے لیے یہ ضابطہ ہونا چاہیئے کہ ہر ہر شخص کو جتنا روکنے کی ضرورت ہو بس وہ اتنا ہی روکے اور پھر دوسروں کے لیے چھوڑ دے۔ مقصد یہ ہے کہ عام فائدے کی چیزوں میں کسی کو دوسرے پر تنگی کرنے کا اختیار نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً گھاس اور چارہ اور جنگل کی لکڑیاں قدرت کا ایک عام انعام ہیں۔ ان کے پیدا ہونے میں کسی انسان کی محنت وکوشش کا دخل نہیں ہے، لہٰذا ان کو سب کے لیے عام ہونا چاہیئے۔ کسی کو یہ حق نہ ہونا چاہیئے کہ انہیں اپنے لیے مخصوص کرلے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا حمی الا للّٰہ ورسولہٖ   چراگاہیں کسی کی ملکیت نہیں وہ اللہ اور رسول کی ہیں۔
رؤسائے جاہلیت کا دستور تھا کہ وہ زرخیز اور شاداب چراگاہوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے اور ان سے انتفاع کی عوام کو اجازت نہیں دیتے تھے لیکن چونکہ یہ بات عوام کے حق میں سراسر ظلم اور غضب تھی اور ان کے لیے ضرر اور تنگی کا باعث تھی اس لیے شریعت عادلہ نے چراگاہوں سے انسانی ملکیت کا حق سرے سے باطل کر دیا۔

ایک مرتبہ آنحضور نے نمک کی ایک کان جو شہر مارب میں تھی ایک شخص ابیض بن حمال کو دیدی۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ اس کان سے نمک بغیر کسی خاص محنت و مشقت اور بغیر کسی خاص اہتمام و انتظام کے نکلتا ہے تو آپ نے وہ اس سے واپس لے لی اور عام لوگوں کو اس سے استفادہ کا حق دے دیا۔ اس لیے کہ جو شے بغیر محنت و مشقت کے قابل انتفاع ہو اسے ایک شخص کے لیے مخصوص کر دینا عوام کے حق میں سخت مضرت اور زحمت کا باعث تھا۔

یہی حال پانی کا ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ مہزور نامی ندی (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصفیہ فرمایا تھا کہ جس شخص کا کھیت پہلے پڑے وہ پانی کو روک کر اپنے کھیت کو سیراب کرے اور جب پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اسے چھوڑ دے تاکہ بعد کے کھیت والا اپنی کاشت کو سیراب کر سکے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے سب پانی لیتے جائیں۔ کسی کو محض اپنے ہی لیے روک رکھنے کا اختیار نہیں۔ یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ پانی جب مباح الاصل چیز تھی تو آپ نے کیوں ایک کو استعمال کا حق پہلے دیا اور دوسرے کو بعد میں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ جب کسی مباح چیز میں لوگوں کے حقوق مساوی ہوں تو انتظام عام کے لیے ضروری ہے کہ اس سے استفادہ کرنے میں ترتیب کا لحاظ رکھا جائے اور جس کا نمبر پہلے آئے اسے انتفاع کی اجازت دی جائے اور جس کا نمبر بعد میں ہو اسے بعد میں، ورنہ باہمی مخاصمت پیدا ہو کر سخت بدنظمی کا باعث ہوگی۔

۴۔ لوگوں کا معاشی تعاون کے ذریعہ اپنے مال اور رزق کی ترقی میں سعی کرنا تمدن کی بقاء اور فلاح کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مثلاً ایک شہر سے دوسرے شہر میں تجارت کرنا، سعی و کوشش کر کے لوگوں کا مال کمانا، اور رائج الوقت چیزوں کو پہلے سے بہتر بنانا یا اپنی قابلیت سے کوئی نئی چیز نکالنا

یہ سب قابل قدر کام ہیں جن پر بڑی حد تک لوگوں کی خوشحالی کا مدار ہے۔ لیکن جب ترقی اموال کے ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جو تعاون کی روح سے خالی ہوں تو اصول فطرت کے لحاظ سے وہ بالکل ناجائز اور حکمت مدنیت کے حق میں سم قاتل ہوں گے۔ جیسے قمار بازی اور سٹہ بازی وغیرہ اسی طرح اکتساب رزق کے جن ذرائع میں تعاون کی ظاہری شکل تو موجود ہو مگر تہ میں تعاون کی موت چھپی ہوئی ہو وہ بھی حکمت مدنیت کے خلاف ہیں مثلاً سودی کاروبار، جس میں گو بظاہر مقروض معاملہ پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے لیکن دراصل یہ رضامندی زبردستی کی ہوتی ہے اور وہ بیچارہ اپنے افلاس کی خوفناکی سے گلوگرفتہ ہوکر اپنے لیے ایسی شرائط کے التزام کو تسلیم کرتا ہے جسے وہ اکثر اوقات پورا بھی نہیں کر سکتا۔ اکتساب مال کے یہ طریقے تمدن کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور یہیں سے وہ ملعون زرپرستی پیدا ہوتی ہے جو مدنیت کی حکمتوں اور برکتوں کا گلا گھونٹ کر عوام الناس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتی ہے۔

اہم ترین مفسدات تمدن کا کلی انسداد:

یہی وہ فطری اصول ومبادی ہیں جن پر اسلام کا معاشی قانون مبنی ہے۔ ہر وہ ذریعہ معاش جو ان اصولوں کی روح سے بیگانہ یا ان کا مخالف ہو، حرام اور ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ تجارت کی بے شمار اقسام اسی زاویۂ نظر کی وجہ سے مردود اور ناقابل مواخذہ ٹھیرائی گئی ہیں۔ ان اقسام میں سب سے مذموم اور مضرت رساں وہ قسم ہے جسے ربوٰا کہا جاتا ہے۔ اہل جاہلیت بیع وربوٰا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے (انما البیع مثل الربوٰا) لیکن اسلام نے بیع کو حلال اور ربوٰا کو حرام کیا، کیونکہ بیع میں تمدن کے لیے زندگی ہے اور ربوٰا میں تمدن کی موت ہے۔ اگرچہ بظاہر ربوٰا بھی بیع کی طرح تراضی طرفین سے ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں تراضی نہیں ہوتی۔ سود پر قرض لینے والا اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر دستاویز پر دستخط کرتا ہے، ورنہ وہ پاگل نہیں ہوتا کہ سو لے کر سوا سو دینے کا برضا ورغبت اقرار کرے۔ اس نقص کے علاوہ سودی معاملات جن خطرات اور مناقشات کا فتح باب کرتے ہیں ان سے ہر خاص وعام اچھی طرح واقف ہے جاہلیت میں اسی سود کی بدولت خونریز لڑائیاں تک ہوئی ہیں۔

ربوٰا کی طرح قمار بھی تمدن کے لیے مہلک اور غارت گر ہے۔ تعاون اور تراضی دونوں کی

روح اس میں مفقود ہوتی ہے اور ان کے بجائے طمع، حرص، خود غرضی، زرپرستی، جہل اور تمنائے باطل کے رذیل محرکات جو تمدن کے مصالح اور دنیا بسر کرنے کے پسندیدہ اطوار اور ضروری وسائل کو تاراج کر دیتے ہیں، اس کی تہ میں کام کرتے ہیں، اور پھر جھگڑے، لڑائی اور قطع رحمی کے جو لازمی نتائج معرض وجود میں آتے ہیں ان کے بیان کرنے کی شاید کوئی حاجت نہ ہوگی۔

کسب معاش کے لیے ان دونوں چیزوں کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ لین دین کی جن صورتوں میں سود یا جوئے کا خفیف سا شبہ بھی موجود ہو اُن سے بھی حکماً روک دیا گیا ہے، مثلاً بیع[1] مزابنہ، بیع محاقلہ[2]، بیع ملامسہ[3]، بیع منابذہ[4]، بیع حصاۃ[5] وغیرہ نیز خشک کھجوروں کی بیع تر کھجوروں کے ساتھ اور کھجوروں کے ایسے ڈھیر کی بیع جس کا پیمانہ معلوم و متعین نہ ہو۔ ان تمام بیوع کو ناجائز کر دیا گیا کیونکہ ان کے اندر جوئے کی روح موجود تھی۔

خرید و فروخت کے قوانین

شریعت میں کاروبار کے جن طریقوں کی ممانعت کی گئی ہے، ان پر جب ہم مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو اصولی حیثیت سے ہم کو حسب ذیل اسباب ممانعت کا پتہ چلتا ہے:

ا۔ ایسی چیزوں کی خرید و فروخت ممنوع ہے جو بجائے خود اسلامی قانون میں حرام ہیں اور جن کا استعمال عموماً معصیت ہی کے کاموں میں ہوتا ہے، مثلاً شراب، طنبور اور مجسّمے وغیرہ کیونکہ ان اشیاء کی خرید و فروخت کی رسم جاری کر دینے کا لازمی انجام ہی یہ ہے ـــ اگر ارادی طور پر نہیں تو کم سے کم بلا ارادہ ہی سہی ـــ کہ لوگوں کو اُن معاصی کی ترغیب دی جائے جو ان کے

---

[1] درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو توڑی ہوئی کھجوروں کی ایک خاص مقدار کے عوض بیچنا۔

[2] گیہوں کی فصل کو گیہوں کے عوض فروخت کرنا۔

[3] بیع ملامسہ کی شکل یہ ہوتی تھی کہ ایک شخص کہتا تھا اگر میں تیرا کپڑا چھو دوں تو فلاں چیز کی بیع میرے نام ہوگی۔

[4] یعنی مشتری آنکھ بند کرکے اپنا کپڑا پھینکے اور کہے کہ جس چیز یا گلہ میں سے جس جانور پر جا کر پڑے وہ اتنے دام میں میرا ہو جائے گا۔

[5] بیع حصاۃ بھی بیع منابذہ کی طرح ہوتی تھی فرق صرف یہ تھا کہ اس میں کپڑے کے بجائے کنکری پھینکتے تھے۔

استعمال کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔ بخلاف اس کے اگر سرے سے ان چیزوں کا لین دین ہی ممنوع ٹھیرا دیا جائے تو گویا بالواسطہ ان کے مفاسد کا قلع قمع کر دیا گیا اور لوگوں کو ان سے بچنے کی سہولت بہم پہنچادی گئی۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور اصنام کی بیع و شراء کو حرام کر دیا ہے۔" ایک اور ارشاد میں آپ نے غیر مبہم الفاظ میں اس قاعدۂ کلیہ کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

ان اللہ اذا حرم شیئا حرم ثمنہ   جب اللہ تعالےٰ کسی شے کو حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام کر دیتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہر البغی خبیث (زانیہ کی اجرت یعنی زنا کی فیس حرام ہے) اور یہی حکم آپ نے کاہن کی اجرت اور مغنیہ کی کمائی کے بارے میں بھی دیا ہے۔ کیونکہ ان تمام اجرتوں میں وہی علت موجود ہے یعنی ارتکاب معصیت کی ترغیب و ترویج شراب کے بارے میں تو آنحضور صلعم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ شراب بنانے والے شراب پینے والے، شراب ڈھونے والے اور شراب رکھنے والے سب پر لعنت ہو۔" کیونکہ ارتکاب معصیت جس طرح معصیت میں امداد کرنا اور سہولت بہم پہنچانا بھی معصیت ہے۔

ہر نجاست مثلاً مردار، خون، جانوروں کا فضلہ اور دیگر گندی چیزیں نہایت مکروہ اور شیاطین سے مشابہت پیدا کرنے والی ہیں، بخلاف اس کے اسلام کی فطرت لطافت اور لطافت اور پاکیزگی چاہتی ہے، اور پاکیزگی کا قائم کرنا نبی آخر الزماںؐ کے مقاصد بعثت میں سے ہے۔ اس لیے شرع نے تمام نجاستوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور ان کو ذریعۂ معاش بنانے سے روک دیا ہے تاکہ انسان ان کا خوگر نہ ہونے پائے چنانچہ مردار کی خرید و فروخت کو حرام کر دیا گیا، حجامت (پچھنے لگانے) کی اُجرت لینے سے منع کر دیا گیا اور نر جانوروں کو مادہ سے جفتی کرانے کے لیے کرایہ پر دینے کو ناجائز ٹھیرا دیا گیا۔ کیونکہ ان ذرائع سے جو روزی میسر ہوتی ہے وہ نجاست کے دروازہ سے گذر کر آتی ہے۔

۴۔ ایسے معاملات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ جو نزاع (LITIGATION) کا دروازہ

کا دروازہ فطرۃً کھولتے ہوں، مثلاً یہ کہ عوضین (قیمت اور مال) کا تعین اور تشخص نہ ہو۔ یا بیع[1] قمار کی شکل ہو۔ یا خریدار نے مال کو نہ دیکھا ہو اور بغیر دیکھے ہوئے یہ یقین نہ کیا جا سکتا ہو کہ جو مال اسے دیا جائے گا وہ اس پر راضی بھی ہوگا یا نہیں۔ یا بیع میں کوئی ایسی شرط[2] ہو جو بعد میں چل کر قیل و قال کی موجب ہو۔

اسی اصول پر شارع علیہ السلام نے بیع مضامین، (ان آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کی بیع جو ابھی نر جانور کی پشت میں ہیں) اور بیع ملاقیح (جو بچے ابھی بطن مادر میں ہیں) اور بیع حبل الحبلہ (جس بچے کی ماں ہی ابھی رحم مادر میں ہو) اس سے روکا ہے، کیونکہ شئے فروختنی کا ابھی وجود ہی نہیں تو اس کا تعین کس طرح ممکن ہے۔ اسی طرح ایسے معاملہ کو ناجائز کر دیا گیا ہے جس میں اصل چیز اور اس کی قیمت دونوں غیر موجود اور مؤخر ہوں۔ استثناء غیر معین کا بھی یہی حکم ہے اس بیع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع معاملہ کرتے وقت مثلاً یہ کہے کہ اتنے روپیوں میں میں تھوڑا سا چھوڑ کر اپنا یہ دس من جو تمہیں دیدوں گا۔ اس "تھوڑے سے" کا عدم تعین فریقین کے درمیان وجہ نزاع بن سکتا ہے۔ لیکن اس کلیہ کو بہت زیادہ عام نہیں کیا جا سکتا یعنی ہر جزوی امر کا عدم تعین بیع کو فاسد نہیں کر دیتا کیونکہ عادۃً اور رواجاً معاملات بیع کے متعلق بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جن کی توضیح اور تعین نہیں کی جاتی اور نہ کی جا سکتی ہے۔ مفسد بیع صرف وہ عدم تعین نہیں کی جا سکتی ہے۔ مفسد بیع صرف وہ عدم تعین ہے جو موجب نزاع بن سکے

---

[1] مثلاً خریدار بائع سے ایک چیز خریدتے وقت یہ قید لگا دے کہ میں اس چیز کو اتنے روپوں میں خریدتا ہوں بشرطیکہ فلاں چیز تم مجھے اتنے روپے میں دو

[2] مثلاً بیع مشروط کی ایک صورت یہ ہے کہ بائع اپنی چیز بیچتے وقت یہ شرط لگا دے کہ اگر مشتری کبھی اسے بیچنے کا قصد کرے تو میں لینے کا زیادہ حقدار ہوں گا۔

[3] بیع کے یہ سارے طریقے زمانہ جاہلیت میں رائج تھے۔ کوئی اصیل و نجیب اونٹ کو دیکھتا تو قبل اس کے کہ اس کے نطفہ سے کوئی بچہ رحم مادر میں وجود پذیر ہو، مالک سے یہ معاملہ کر لیتا کہ اس سے جو بچہ ہوگا اتنی قیمت میں میں لے لوں گا۔ اسی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے سے قبل ہی بچے کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی تھی اور بسا اوقات ماں بھی عالم وجود میں آئی نہ ہوتی۔

ایسے معاملات بھی اسی بنا پر نا جائز ہیں جن میں معاملہ تو ایک چیز کا ہو رہا ہو مگر در اصل وہ مقصود بالذات نہ ہو بلکہ اس کے ضمن میں در پردہ کوئی اور ہی معاملہ پیش نظر ہو۔ ایسے معاملات سخت خصومت انگیز اور ایسے پیچیدہ ہو جاتے ہیں جن کا کوئی حل ملنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بیع مقصود بالذات تو ہوتی نہیں، اسے محض ایک دوسرے مقصد کے لیے بہانہ بنایا جاتا ہے، اور ایک فریق جب دیکھتا ہے کہ جو اصل مقصد تھا وہ حاصل نہیں ہوتا تو وہ معاملہ بیع کی تکمیل سے جی چراتا ہے اور دوسرا فریق طے شدہ بات کو پورا کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اسی بنا پر شارع نے ایسے معاملات کی سرے سے ممانعت فرمادی ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ:۔

لا یحل بیع وسلف ولا شرطان فی بیع — ایک ہی ساتھ بیع اور بیع سلف دونوں کا معاملہ کرنا یا کسی معاملہ بیع میں دو شرطوں کی قید لگانا جائز نہیں

بیع سلف کے معنی ہیں کسی چیز کی جو آئندہ تیار ہونے والی ہو، پیشگی نقد روپیہ دے کر بیع کرالینا۔ اور دو شرطوں کا مفہوم یہ ہے کہ بائع ایک تو اس چیز کے حقوق بیع اپنے لیے مخصوص کرالے اور دوسرے کوئی اور خارجی شرط لگا دے مثلاً اگر اس چیز کو تمہیں کبھی بیچنا منظور ہو تو میرے ہی ہاتھ بیچنا، نیز میں اس شرط کے ساتھ تمہیں یہ چیز بیچ رہا ہوں کہ اپنی فلاں چیز مجھے ہبہ کردو یا فلاں کے یہاں میری سفارش کردو۔

اسی قاعدہ پر ان معاملات کی بھی ممانعت کی گئی ہے جن میں عوضین میں سے کسی ایک کا اختیار سپردگی معاملہ کرنے والے کے ہاتھ میں نہ ہو، مثلاً ثمن دقیمت، خریدار کے قبضہ میں نہ ہو یا چیز بائع کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ فی الحال عملاً دوسرے کے اختیار میں اور اس کا محض نظری حق اس شے پر پہنچتا ہو، یا ابھی محل نزاع ہو۔ ایسی صورت میں بہت ممکن ہے کہ ایک قضیہ کے اندر دوسرا قضیہ پیدا ہو جائے یا فریق مخالف کو دھوکہ اور نقصان پہنچ جائے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک کوئی چیز تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے تمہیں اطمینان نہ کرنا چاہئیے کہ وہ تمہیں مل ہی جائے گی۔ لہٰذا اگر ان حالات میں بیع منعقد ہو گئی اور مشتری نے قبضہ کا مطالبہ کر دیا تو بائع کے لیے اس کے سوا کیا چارہ کار ہوگا کہ ادھر اُدھر دوڑتا پھرے اور اس طرح مناقشات کی گرم بازاری

کا سامان پیدا کرے۔ اسی مفسدہ کا قلع قمع کرنے کی خاطر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو چیز تمہارے اپنے ہاتھوں میں نہ ہو اس کی بیع نہ کرو"۔ دوسرے ارشاد میں ہے کہ "جو کوئی گیہوں خریدے اس وقت تک بیع نہ کرے جب تک کہ اس کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتا۔" یہ حکم صرف گیہوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عام ہے۔ نیز آپ نے ایسی شے کی بیع سے منع کر دیا ہے جس کے متعلق بائع کو یقین کامل نہ ہو کہ آیا وہ میرے ہاں موجود بھی ہے یا نہیں یا میں وا سے پا سکتا ہوں یا نہیں۔

اسی طرح شارع نے جن جن کران معاملات کو حرام کیا ہے جو عموماً نزاعیں پیدا کرنے والے ہوتے ہیں مثلاً درخت کے کچے پھلوں کی بیع کا عرب میں عام رواج تھا۔ اس کے متعلق حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ لوگ باہم ایسی خرید و فروخت کرتے تھے لیکن جب آفاتِ سماوی پھلوں کو نقصان پہنچا دیتیں تو آپس میں لڑائی تکرار کرنے لگتے۔ مشتری قیمت کی ادائیگی کے خلاف حجت پیش کرتا کہ پھل پکنے سے قبل ہی خراب اور سڑ گل گئے۔ اس متوقع نزاع کے انسداد کے لیے آنحضرت صلعم نے ممانعت فرما دی کہ "درخت پر لگے ہوئے پھل اس وقت تک نہ بیچے جائیں جب تک کہ وہ قابل انتفاع نہ ہو جائیں" الا یہ کہ مشتری اسی وقت پھلوں کو توڑ لے۔ اس ممانعت کے بعد آپ نے فرمایا:۔

ارأیت اذا منع اللّٰہ الثمرۃ بما یاخذ احدکم مال اخیہ	سوچو کہ جب اللہ تعالےٰ نے پھلوں کو نیست و نابود کر دیا تو پھر کوئی کس شے کے عوض اپنے بھائی کا مال (پھلوں کی قیمت) لیتا ہے۔

یعنی اس طرح کی بیع میں ایک قسم کا دھوکا پوشیدہ رہتا ہے، کیونکہ پھلوں کے ضائع ہونے کا خطرہ بہرحال موجود ہے۔ اگر وہ واقعی ضائع ہو جائیں تو خریدار غریب کو قیمت تو ادا کرنی پڑے گی اور اس کے عوض اسے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔

پھر خرید و فروخت کے معاملات میں مسابقت (COMPETITION) کی ایسی صورتوں کو روکا گیا ہے جن سے لوگوں کے درمیان حسد اور مخالفت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، اور جن کا نتیجہ یہ ہو کہ کچھ لوگ پیش قدمی کر کے دوسرے لوگوں کو اکتساب رزق سے محروم کر دیں۔

لا تلقوا الرکبان بیع ولا یبیع بعضکم علی بیع بعض ولا یسم الرجل علی سوم اخیہ ولا تناجشوا ولا یبیع حاضر لباد

آبادی سے نکل کر بنجاروں کو راستے میں نہ جا پکڑو، اور ایک شخص دوسرے شخص کی بیع میں مداخلت کر کے اپنی بیع نہ کرے۔ اور ایک شخص دوسرے کی بولی پر بولی نہ دے اور محض دوسروں کو خریداری سے روکنے کے لیے بولی نہ بڑھائی جائے۔ اور شہر والا گاؤں والے کی طرف سے بیع کا مختار نہ بنے۔

ان ہدایات میں سے موخرالذکر ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں والوں کو براہِ راست شہر میں آکر لوگوں کے ہاتھ مال فروخت کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ آڑھتیے جو ان کا مال لے کر نسبتۂ زیادہ قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں یہ عام باشندوں کے لیے تنگی کا موجب ہے، اور اس سے خود گاؤں والوں کا بھی نقصان ہے، کیونکہ وہ زیادہ فائدے کا لالچ کر کے آڑھتیے کے جال میں پھنس جاتے ہیں، اور پھر اس کے پھندے سے ان کا نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز یہ کاروبار تمدن کی ترقی کے لیے بھی مضر ہے کیونکہ گاؤں والوں کا بار بار مال لے کر آنا اور تھوڑا کمانا اس سے بہتر ہے کہ وہ زیادہ نفع کی خاطر مال کو روک کر رکھیں۔

۵۔ ایسے طریقوں سے نفع کمانے کی کوشش بھی حرام کر دی گئی ہے جو عامۃ الناس کے لیے موجب نقصان و تکلیف ہوں مثلاً غلے کو قیمتیں گراں کرنے کی خاطر جمع کرنا اور روک رکھنا کہ یہ خود غرضانہ نفع طلبی ہے اور اس سے تمدن میں خرابی واقع ہوتی ہے۔ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من احتکر فھو خاطئ (جس نے احتکار کیا وہ گناہ گار ہے) اور الجالب مرزوق والمحتکر ملعون (کسب کرنے والے کو رزق ملتا ہے اور احتکار کرنے والے کے حصہ میں لعنت آتی ہے)

۶۔ ایسے تمام معاملات ممنوع ہیں جن میں ایک شخص دوسرے شخص کو دھوکہ دے کر نفع کمانے کی کوشش کرے مثلاً اپنے مال کا عیب چھپائے، یا اس کا مال جتنا اچھا نہیں ہے اتنا ظاہر کرے۔ اسی سلسلہ میں یہ حدیث ہے کہ:

لا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعھا بعد ذلک فھو بخیر النظرین

اونٹنی یا بکری کو بیچتے وقت اس کے تھنوں میں دودھ جمع کر کے نہ رکھو کہ خریدار اس کو زیادہ دودھ

یبعد ان یحلبھا ان رضیھا امسکھا وان سخطھا ردھا وصاعا من تمر وفی روایۃ صاعا من طعام لا سمراء

والی کیجیے اگر ایسا کیا جائے تو خریدار کو اختیار ہے کہ تین دن رکھ کر اسے دیکھے اور پسند نہ آئے تو واپس کر دے۔ لیکن واپس کرتے وقت وہ ساتھ ہی ساڑھے تین سیر کھجوریں بھی اس دودھ کے عوض دے دے جو اس نے نچوڑا ہے ایک دوسری روایت میں ہے کہ ساڑھے تین سیر غلہ دے، لیکن وہ زیادہ قیمتی غلہ نہ ہو۔ مثلاً شامی گیہوں کہ وہ حجاز میں زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصنوعی طور پر مال کو اچھا بنانے کی بھی نہی فرمائی ہے۔ ایک شخص نے کھجوروں کو پانی سے تر کیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اس سے فرمایا۔

(افلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس من غش فلیس منی کیا تو نے اس کو اوپر سے تر نہیں کیا ہے کہ لوگ دیکھ کر دھوکا کھائیں ؟ جو شخص دھوکہ بازی کرے اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں)

۷۔ ایسی چیزوں کی بیع بھی حرام ہے جن کو اللہ نے سب انسانوں کے لیے مباح کیا ہے۔ مثلاً جو پانی قدرتی طور پر بہ رہا ہو اور خود لوگوں تک پہنچنے والا ہو اس کو کوئی شخص روک لے اور قیمت لے کر دوسروں کے لیے چھوڑے۔ یہ اللہ کے مال میں بغیر کسی حق کے تصرف کرنا ہے اور اس میں بندگان خدا کی ضرر رسانی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نھی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع فضل الماء (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ضرورت سے زائد پانی کو قیمتاً دینے کی ممانعت فرمائی ہے)، اسی طرح قدرتی چراگاہ میں جانوروں کے چرنے پر اجرت عائد کرنا بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص ایسا کرے گا، اللہ بھی اس سے کہے گا کہ میں تجھ کو اپنے فضل سے اسی طرح محروم کرتا ہوں جس طرح تو نے لوگوں کو اس فضل سے محروم کیا جس کے بنانے میں تیرا کوئی حصہ نہ تھا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ پانی اور چارہ اور آگ، یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں سب مسلمان شریک ہیں[1]۔

---

[1] ترجمان القرآن مئی ۱۹۲۹ء۔

چند اصولی پابندیاں:۔

مذکورۂ بالا حدود کے علاوہ چند اصولی پابندیاں اور ہیں جو تجارتی معاملات پر عائد کی گئی ہیں آگے بڑھنے سے پہلے ایک سرسری نگاہ ان پر بھی ڈال لینی چاہیئے۔

ناجائز شرطیں باطل ہیں:۔

بیع مشروط کے متعلق بعض مخصوص احکام اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ایک عام اور اصولی بات بیان کردی جاتی ہے۔ شارع کا فرمان ہے کہ ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، باطل ہے۔ لیکن اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہر وہ شرط جس کی قرآن میں صریح اور منصوص اجازت موجود نہیں ہے۔ باطل ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شرط قرآن میں تصریحاً ممنوع قرار دے دی گئی ہے یا جو مدوج قانون اسلامی کے مخالف ہو، وہ شرط باطل اور ناجائز ہے

حقوق ولایت کی بیع ناجائز ہے:۔

حقوق ولایت کا بیچنا اور ہبہ کرنا اسلام میں قانوناً ناجائز ہے۔ کیونکہ قابل خرید و فروخت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو حسی اور مشاہد ہو۔ ولایت کے حقوق کی نوعیت یہ نہیں ہے وہ تو ایک ذہنی اور اضافی چیز ہے۔ نیز ولایت نسب کے تابع ہے۔ جس طرح نسب کی بیع اور ہبہ جائز نہیں اسی طرح ولایت کی بیع اور اس کا ہبہ بھی جائز نہیں۔

لین دین میں قسم کھانے کی ممانعت:۔

تجارتی کاروبار میں بات بات پر قسم کھانا ایک عام شیوہ سا ہو گیا ہے۔ یہ ایک نہایت ذلیل حرکت ہے۔ اس میں برائی کے دو پہلو ہیں، ایک تو فریق ثانی کو اس کے ذریعہ دھوکا دیا جاتا ہے، دوسرے اللہ کا نام ایک کھیل بن جاتا ہے اور اس کی حقیقی عظمت کا احساس تک دلوں سے فنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے شارع نے فرمایا ہے کہ الحلف منفقۃ للسلعۃ ممحقۃ للبرکۃ (تجارت میں قسم کھانا اگر مال کی نکاسی کا ذریعہ ہے تو کمائی میں بے برکتی کا بھی ذریعہ ہے) اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں میں اس مذموم رسم اور عادت کا کوئی ہلکا سا اثر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے کہ وہ اے تجارت پیشہ لوگو خرید و فروخت کرتے وقت زبان سے بہت سی فضول باتیں اور نامعقول قسمیں نکل جایا کرتی ہیں اس لیے

بیع کے ساتھ کچھ صدقہ بھی دیا کرو۔" صدقہ کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ وہ ان فضول گوئیوں اور غلطیوں کا کفارہ ہو جائے۔

سونے اور چاندی کے سکوں کا مبادلہ:۔

اگر کوئی شخص اپنی چیز کو دینار (سونے کے سکے) کے حساب سے بیچتا ہے لیکن دینار کے بجائے دراہم (چاندی کے سکے) لیتا ہے تو قانون اسلام اسے اس کی اجازت دیتا ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ دراہم کی قیمت وہی مانی جائے جو اس روز بازار میں تھی دوسری یہ کہ فریقین معاملہ اسی وقت چکتا کر لیں، یعنی جدا ہونے سے پہلے ان کے درمیان کوئی بات تصفیہ طلب نہ رہ گئی ہو۔ مثلاً اس امر کا تصفیہ کہ کتنے دیناروں کے قائم مقام کتنے درہم ہوں گے، صرافوں پر چھوڑ دیا گیا ہو یا اسی قسم کی کوئی اور بات زمانہ مستقبل میں طے ہونے کے لیے اٹھا رکھی گئی ہو۔ اگر ان شرطوں کو پورا نہ کیا جائے تو بائع کو اس کی اجازت نہیں کہ دینار کے بجائے قیمت میں دراہم لے کیونکہ یہ صورت نزاع پیدا کر دینے کا احتمال رکھتی ہے اور اس سے معاملہ صاف اور یکسو نہیں ہونے پاتا۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت:۔

ناپ تول میں ڈنڈی مارنے کی سخت ممانعت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے ناپنے تولنے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ "تم دو ایسی چیزوں (ناپنے اور تولنے) کے مختار اور ذمہ دار بنائے گئے ہو جن کے ذریعہ بہت سی پچھلی قومیں ہلاک ہو گئیں۔" یعنی ناپنے تولنے میں عدل اور قسط کا پورا پورا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے کتنی ہی قومیں ہلاک ہو چکی ہیں مثلاً قوم شعیب، جس کا عبرتناک حشر قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ پس ہر مسلمان کو اس خیانت اور بد معاملگی سے بچنا چاہیے۔

نرخوں کا حکماً مقرر کیا جانا:۔

تجارتی کاروبار میں ایک سوال حکومت کے اختیارات کا آتا ہے کہ آیا وہ اشیاء کی قیمت کا جبری تعین کر سکتی ہے جس کے مطابق بیچنے پر اہل تجارت مجبور ہوں؟ اسلامی قانون تجارت کا رجحان اس طرف ہے کہ تجار اس معاملہ میں آزاد ہیں۔ حکومت کو ان کی

آزادی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک بار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ تاجروں نے چیزوں کا بھاؤ بہت چڑھا دیا ہے، آپ ان کی قیمتوں کا مناسب تعین فرما دیں۔ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ "قیمتوں کا مقرر کرنا اور روزی کا گھٹانا بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے، میں نہیں پسند کرتا کہ میں خدا سے اس حال میں ملوں کہ کسی پر ظلم کرنے کا بار میری گردن پر ہو اور وہ اس کے حضور داد رسی کرے" اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا عادلانہ نرخ معین کرنا جو تاجر اور خریدار دونوں کے نفع نقصان کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہو حتیٰ کہ کسی کی ایک ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو، تقریباً ناممکن ہے، اسی لیے آنحضور صلعم نے اس کے لیے کوئی حکم صادر کرنے سے اجتناب فرمایا تاکہ آئندہ چل کر امراء اور حکام اس حکم کو اپنے لیے سند نہ بنا لیں اور اس کی آڑ میں جب چاہیں اور جس قدر چاہیں چیزوں کی قیمت گھٹا بڑھا دیں۔ تاہم اگر کھلم کھلا تجارت پیشہ لوگ لوٹ ہی پر اتر آئیں اور چیزوں کو بہت گراں کر کے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیں تو حکومت کے لیے جائز ہے کہ رفاہِ عام اور مصالح تمدن کے پیش نظر انہیں اس خود غرضانہ لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ کر چیزوں کی قیمتیں متعین کر دے۔

احکام بیع:۔

اب تک جو اصول ہم نے بیان کیے ہیں ان کا تعلق اسلامی قانون تجارت کے سلبی پہلو سے تھا۔ یعنی یہ کہ تلاش معاش کی جدوجہد میں لوگوں کو کن کن تجارتی طریقوں سے بچنا چاہیئے اب ہم اس قانون کے اثباتی پہلو پر ایک اجمالی گفتگو کر کے بتائیں گے کہ شارع علیہ السلام نے مختلف موقعوں پر تجارتی معاملات میں کیا ہدایات فرمائی ہیں۔

۱۔ اگر کوئی شخص درخت خریدے اور اس پر پھل بھی لگے ہوئے ہوں تو وہ پھل بیع میں شامل نہ سمجھے جائیں گے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر کوئی شخص کھجور کا درخت خریدے تو اس پر لگی ہوئی کھجوریں معاملہ بیع میں شامل نہ ہوں گی بلکہ وہ بیچنے والے کی ملک مانی جائیں گی الآیہ کہ درخت خریدتے وقت اس نے ان کھجوروں کو بھی معاملہ بیع میں محسوب کرنے کی تصریح کر دی ہو"، کیونکہ اصلاً معاملہ تو اس درخت کا ہو رہا ہے اور یہ پھل

اس سے ایک زائد چیز ہے جو خریدار کی ملک میں آنے سے پہلے درخت پر لگی تھی، لہذا اس کی حیثیت اس مال و اسباب کی سی ہے جو کسی گھر کے صحن میں پڑا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ صحن یا گھر کی خرید و فروخت کا اثر اس مال پر کچھ نہیں پڑ سکتا۔

اس سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ اصل کی بیع میں فرع شامل نہ ہو گی جب تک کہ فرع کے متعلق معاملہ میں تصریح نہ ہو

۱۲۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو خریدتا ہے اور کچھ روز کے بعد اس کے کسی عیب پر مطلع ہو کر واپس کر دیتا ہے تو اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت میں جو نفع اس نے اس چیز سے اٹھایا ہے، مثلاً اگر مکان تھا تو اس کا کرایہ وصول کیا ہے، اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ آیا اس چیز کے ساتھ وہ نفع بھی اصل مالک کو لوٹانا چاہیئے یا نہیں؟

اسلام نے اس باب میں یہ اصول مقرر کیا ہے کہ "الخراج بالضمان (یعنی نفع اس کا ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہو) اس قاعدہ کی رُو سے نفع کا مستحق خریدار ہے کیونکہ وہ اس چیز کا اس مدت میں ضامن رہا ہے۔ اگر وہ چیز اس کے قبضہ کے زمانہ میں ضائع ہو گئی ہوتی تو وہی نقصان اٹھاتا لہذا جب وہ اس کے نقصان رساں پہلو کا ذمہ دار ہے تو منفعت بخش پہلو بھی اسی کے حق میں ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں اگر بائع کو اس نفع کا حق دار ٹھیرایا جائے تو فریقین کے درمیان نفع کی کمی و زیادتی پر جھگڑا پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے لہذا قطع نزاع کے لیے بھی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس حق کا حقدار خریدار ہی کو قرار دیا جائے۔

اس میں اصولی بات یہ ہے کہ "نفع کا تعلق ہمیشہ نقصان کی ذمہ داری کے ساتھ رہے گا"

۱۳۔ "اگر فریقین (بائع اور مشتری) میں باہم کسی بات پر اختلاف پیدا ہو جائے اور شے فروختنی قائم اور اپنی اصل حالت پر موجود ہو اور کسی فریق کے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہ ہو تو ایسی صورت میں بائع کی بات مانی جائے گی الا آنکہ دونوں کسی نقطہ پر مجتمع ہو جائیں۔" یہ شارع کا مقرر کیا ہوا اصول ہے۔ جس کے ذریعے اس نے جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا ہے اس قاعدہ کی بنا اس پر ہے کہ کوئی چیز اپنے مالک کے قبضہ سے صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے جب کہ فریقین کی باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ بیع طے ہو جائے۔" اب چونکہ

یہاں یہ صورت حال نہیں پائی گئی اور رضا کے بجائے آپس میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اس لیے معاملہ کو ختم سمجھ کر مندرجہ بالا اصل کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھیرا یعنی وہ چیز بائع کی سمجھی جائے گی اور اس کی قیمت وہی مانی جائے گی جو بائع کہتا ہے۔ ہاں خریدار کو البتہ یہ اختیار ہے کہ اس قیمت پر چاہے چیز لے یا نہ لے کیونکہ معاملہ بیع کے انعقاد کے لیے جس طرح فریق اول (بائع) کی رضا شرط ہے اسی طرح فریق ثانی (خریدار) کی بھی شرط ہے۔

۴۔ اگر کوئی شخص بیع سلم کے طور پر کوئی چیز خریدے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز کی مقدار اور قبضہ کرنے کے وقت کی تعیین کر دے۔ رسول اللہ صلعم جب مدینہ تشریف لائے تو لوگوں میں اس طرح کی بیع کا بڑا رواج تھا۔ لوگ روپیہ پیشگی دے دیتے اور دو دو تین تین سال بعد پیدا ہونے والے پھلوں کو خرید لیتے آپ نے اسے بالکلیہ ممنوع تو نہیں کیا البتہ اتنی شرط لگا دی کہ اس چیز کی مقدار یا وزن متعین ہو، نیز یہ صاف صاف طے ہو جائے کہ بائع کس وقت خریدار کو وہ چیز دے گا۔"

۵۔ قرض کے لین دین میں تحریری دستاویز اور شہادت کی سخت تاکید ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ الآیۃ	اے ایمان لانے والو جب تم کسی مدت معین تک کے لیے ایک دوسرے سے قرض لو تو اسے لکھ لیا کرو

قرض کا معاملہ معاشی امور میں گوناگوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک طرف معاشی ضروریات کے پیش نظر قرض کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، دوسری طرف یہ دیگر معاملات کی نسبت بہت زیادہ نزاع آفریں اور خصومت انگیز ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ قرض کے معاملات پر گواہ بنانے اور انہیں ضبط تحریر میں لانے کی سخت تاکید فرمائی ہے اور کتمان شہادت کی سخت ممانعت کر دی ہے۔ پھر اسی ضمن میں نیز انہیں معاشی ضرورتوں کے باعث رھن اور کفالہ وغیرہ معاملات کی بھی اجازت دے دی ہے۔

مضاربت یا شرکت کے معاملات:۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نسل انسانی مدنی الطبع واقع ہوئی ہے اور اس کا معاشی سوال اس

وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے افراد میں باہم تعاون نہ موجود ہو۔ چنانچہ تاریخ تمدن بتلاتی ہے کہ یہ معاشی تعاون مختلف شکلوں میں قوموں کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اس تعاون اور اشتراک کی مندرجہ ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ دو آدمی کوئی تجارتی کاروبار اس طرح پر شروع کریں کہ ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت اور منافع حسب معاہدہ دونوں تقسیم کر لیں اسے اصطلاح میں "مضاربت" کہتے ہیں

۲۔ دو آدمی مل کر اس طرح تجارت کریں کہ سرمایہ میں دونوں برابر کے شریک ہوں، ہر ایک جو کچھ بیچے یا خریدے دوسرا بھی اس میں شریک ہو حتیٰ کہ دونوں ایک دوسرے کے ضامن اور ایک دوسرے کے مختار عام ہوں اور بیوپار میں جو نفع ہو اسے دونوں آپس میں بحصہ مساوی تقسیم کر لیں۔ اس کا نام "شرکت مفاوضہ" ہے۔

۳۔ دو آدمی کسی معین سرمایہ سے تجارت کریں جس میں دونوں کے حصے برابر ہوں اور ہر ایک اس سرمایہ کی حد تک خرید و فروخت میں دوسرے کا قائم مقام ہو۔ لیکن ایک دوسرے کا ضامن اور کفیل عام نہ ہو کہ محض شریک کار ہونے کی وجہ سے جو کچھ ایک پر بار ہو وہ دوسرے سے طلب کیا جا سکے۔ "اسے شرکت عنان" کہتے ہیں۔

۴۔ دو آدمی اس طرح تجارت شروع کریں کہ سرمایہ کسی ایک کا بھی نہ ہو بلکہ ہر ایک محض اپنی ذاتی شخصیت سے کام لیکر بازار سے ادھار مال حاصل کرے اور دونوں مل کر اسے بیچیں اور قرض ادا کرنے کے بعد نفع باہم تقسیم کر لیں اس کا نام اصطلاح شرع میں "شرکت وجوہ" ہے۔

۵۔ ایک شخص اپنے لیے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے لیے معاملات کرے۔ اسے "وکالت" کہتے ہیں۔

۶۔ دو صنعت پیشہ آدمی مل کر کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو آپس میں بانٹ لیں۔ یہ "شرکت عمل ہے۔"

۷۔ ایک شخص کے باغ کی دیکھ بھال اور آبپاشی دوسرا آدمی کرے اور اس باغ سے جو پھل پیدا ہوں وہ ان میں سے حصہ بٹائے۔ اسے آئین اسلامی میں "مساقاۃ" کہتے ہیں۔

۸۔ زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو اور ہل بیل نیز کاشت کرنے کی جملہ محنت دوسرے آدمی

کی اس طرح جو غلہ پیدا ہو اس میں دونوں شریک ہوں۔ اس کا نام "مزارعت" ہے۔

۹۔ ایک شخص کی محض زمین ہو اور بیج، ہل اور بیل اور محنت سب دوسرے کی ہو اسے "مخابرہ" کہتے ہیں اور یہ دراصل مزارعت ہی کی ایک قسم ہے۔

۱۰۔ مزارعت ہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زمین، بیج اور ہل اور بیل سب کچھ ایک ہی آدمی کا ہو اور دوسرے کی صرف محنت ہو۔

معاشی تعاون اور اشتراک عمل کی یہ تمام صورتیں اور اسی نوعیت کی دوسری صورتیں بھی اسلام میں جائز ہیں۔ اور ان کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ فریقین میں جو شرائط طے ہو جائیں ان کی پوری پابندی کی جائے، بجز ایسے معاہدہ اور ایسی شرائط کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے والی ہوں۔

معاملات میں فضل اور فیاضی:۔

یہاں تک جو اصولی قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق معاشی معاملات میں خود غرضی، ظلم و عدوان اور تنازع کی روک تھام سے تھا۔ لیکن اسلام نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے معاشی معاملات میں فضل، فراخدلی، فیاضی، ایثار اور امداد باہمی کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور احسان و تبرع کو بھی معاشیات کا اہم ترین جزو بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شارع کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:۔

رحم اللہ رجلا سمحا اذا باع واذا اشتری واذا اقتضی

اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جو خریدتے اور بیچتے اور قرض کا تقاضا کرتے وقت مروت اور خوش خلقی سے کام لے۔

کج خلقی اور خود غرضی اور بے مروتی کاروباری ذہنیت کا گویا ایک فطری خاصہ ہے لیکن چونکہ ایک طرف تاجر کے نفس پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں، دوسری طرف نظام تمدن کے حق میں یہ موت سے کم نہیں، کیونکہ یہ چیز تعاون کی دشمن ہے اور تعاون ہی پر مدنیت کا دار و مدار ہے، اس لیے رسول اللہ صلعم نے اتنے مؤثر طریقہ پر اس سے روک کر سماحت اور فراخدلی کی ترغیب دی ہے۔

اس مقصد کے لیے ایک موقع پر آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "جو شخص کسی ایسی بیع کو جسے اس کا بھائی (خریدار) ناپسند کرتا اور فسخ کرنا چاہتا ہو، فسخ کردے گا قیامت کے دن اللہ تعالےٰ اس کے گناہوں کو فسخ (یعنی معاف) کردے گا۔" معاملہ کی بات تو یہ ہے کہ جب خریدار نے اپنی رضا و رغبت سے ایک چیز خریدی ہے تو خواہ بعد میں وہ کتنا ہی پچھتائے اور اسے واپس کرنا چاہے، بائع واپس کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ایک بھائی کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے اس لیے آنحضرت صلعم نے بیع کو فسخ کرنے کی ان الفاظ میں اپیل فرمائی اور اسے رحمت و مغفرت ایزدی کا ذریعہ بتلایا۔ (بشرطیکہ چیز اپنی اصلی حالت میں ہو)

اگر دو قریبی رشتہ دار ایک ہی شخص کی ملکیت میں ہوں تو اس کے لیے جائز نہیں کہ ایک کو بیع دے اور دوسرے کو اپنے پاس رکھ چھوڑے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایسا کیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ بیع کو فسخ کرکے غلام کو واپس لے لو۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ "جو شخص ماں اور اس کے بیٹے کو الگ الگ کرے گا اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اس کو اور اس کے احباب واقارب کو الگ الگ کردے گا۔" یہاں بھی وہی اصول اخلاق و سماحت کام کر رہا ہے۔

اسی احسان اور تبرع کی تعلیم دیتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی خریدار قیمت ادا کرنے سے پیشتر مفلس ہو جائے اور قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بائع کو چاہیے کہ اپنی چیز کو واپس لے لے اور اسے قیمت ادا کرنے پر مجبور نہ کرے" اس طرح آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "اگر قرض دار تنگ دست ہو جائے تو قرض خواہ کو اپنا قرض معاف کردینا چاہیے یا کم از کم مطالبہ میں نرمی برتے اور اسے ادا کرنے کی کافی مہلت دے اللہ تعالےٰ اس کو روز جزا کے اہوال سے محفوظ رکھے گا۔"

اس کے برعکس اگر قرض دار قرض ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور پھر قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہو تو دوسروں کو چاہیے کہ اس پر دباؤ ڈال کر حساب بیباق کرائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "تونگر کا ادائیگی قرض میں لیت ولعل کرنا ظلم و ناانصافی ہے۔ ہاں اگر قرض دار کسی دوسرے شخص کا حوالہ دے تو اس کا حوالہ قبول کرلینا چاہیے۔" اس دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرض خواہ کو یہ اصرار نہ کرنا چاہیے کہ میں تو تجھ سے وصول کروں گا۔

اسی ترح کی خاطر قرآن نے مسلمانوں کو بار بار صدقات پر ابھارا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو مال اللہ نے انہیں دیا ہے اس میں سے اپنے غریب اور نادار بھائیوں پر بھی خرچ کریں اور اس کے عوض رضائے الٰہی کے ماسوا کوئی معاوضہ ان کے پیش نظر نہ ہو۔ پھر ایک ایک چیز گن گنا کر بتا دیا کہ ان صدقات کو ان کے صحیح مصارف میں خرچ کرنا ضروری ہے، وہ مصارف یہ ہیں:۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ الخ۔ (توبہ - ۸)	صدقات تو محض فقیروں، مسکینوں، محصلین زکوٰۃ کو، اور ایمان والے نومسلموں (جن کی تالیف قلب کی ضرورت ہو)، اور غلاموں، قرض داروں، راہ خدا میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہیں۔

لیکن صدقات کے ذریعہ سے صرف غربا اور حاجت مندوں ہی کے ساتھ احسان اور مواساۃ کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ کھاتے پیتے مسلمانوں کے ساتھ اظہار اخوت و مواساۃ کا ذریعہ وہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شارع نے ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کی تلقین کر کے امیر اور غریب کے ساتھ رشتۂ اخوت و مودت کو مضبوط کرنے کی ترغیب دی۔ رسول اللہ صلعم کا فرمان ہے کہ تھادوا فان الھدیۃ تذھب الضغائن (ایک دوسرے کے یہاں ہدیے بھیجو، کیونکہ ہدیہ دلوں کو کینوں سے صاف کرتا ہے)، اور یہ ایک امر واقعہ ہے ہدیہ خواہ کتنا ہی قلیل اور ادنیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو لیکن وہ اس بات کی علامت ہے کہ ہدیہ بھیجنے والا اپنے دل میں اس کی جگہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر شارع نے ہدیہ واپس کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ محض لوجہ اللہ ہوتا ہے اور ہدیہ دیکر اس شخص کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ چیز بھی انسانیت اور مصالح تمدن دونوں کے لیے اکسیر حیات کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے سوسائٹی کے افراد میں الفت اور اتحاد کی زبردست اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جس شخص کے پاس ہدیہ آئے، اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو چاہیے کہ وہ بھی اس کا جواب دے

اور اگر استطاعت نہیں رکھتا تو ہدیہ دینے والے کے حق میں خیر و تحسین کے کلمات کہدے۔ ایسا کرنا گویا اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنا ہو جائے گا۔ لیکن جس نے یہ بھی نہ کیا اس نے سخت ناشکری کی۔ اور جس نے ہدیہ دینے میں اپنی حیثیت سے بہت بڑھ چڑھ کر نمائش کی اس کی مثال اس ریا کار رند کی سی ہے جس نے سر سے پیر تک خرقۂ زہد پہن رکھا ہو۔"

ہدیہ کے جواب میں ہدیہ بھیجنے میں ایک تو یہ مصلحت ہے کہ اس طرح دونوں جانب سے قربت و الفت کی پیش کش ہوگی جو ہدیہ کا مقصد وحید ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اوپر کا ہاتھ بہر حال نیچے کے ہاتھ سے افضل ہے اس لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کا ہاتھ نیچا نہ رہ جائے لیکن اگر واقعی وہ اس کی قدرت نہیں رکھتا تو کم سے کم اسے اچھے کلمات سے یاد ہی کرے کہ یہ چیز بھی انجام کے لحاظ سے ہدیہ دینے کے برابر ہی ہے۔ لیکن اچھے کلمات سے یاد کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بھٹی کرنا اور تعریفوں کے پل باندھنا شروع کردے۔ اس کا معتدل طریقہ بھی شریعت نے متعین فرما دیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "جس شخص پر کوئی احسان کیا گیا ہو اور وہ اپنے محسن کو جزاک اللہ خیرا کہہ دے تو اس نے تحسین و ثنا کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کر دیا۔" شریعت کا مقرر کیا ہوا یہ طریقہ اظہار تشکر اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے اندر انتہائی مناسبت جامعیت اور اعتدال رکھتا ہے اس پر اضافہ کرنا جس طرح تملق اور دنائت کی دلیل ہے اسی طرح میں بھی بخل کرنا انتہائی بداخلاقی اور کفران نعمت ہے۔

ہدیہ دے کر واپس لے لینا نہایت ہی ذلیل اور مکروہ حرکت ہے رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ کسی چیز کو ھبہ کر کے پھر اسے واپس لے لینے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو قے کر کے اسے چاٹے ہم مسلمانوں کو ایسی بری حرکت زیب نہیں دیتی۔" غور کرو یہ مثال کس قدر مبنی بر حقیقت ہے جب ایک شخص اپنی مرضی سے اپنے مال کا ایک حصہ کسی کو ھبہ کر دیتا ہے اور پھر اسے لوٹانا چاہتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسے اس فعل پر آمادہ کر رہی ہے؟ ظاہر ہے یا تو وہ انتہائی تنگ دل اور خسیس ہوگا اور کسی اتفاقی جذبہ سے متاثر ہو کر ایک چیز ھبہ کرنے کے بعد اسے اپنی حرکت پر افسوس آیا ہوگا اور اب اسے واپس مانگ رہا ہے، یا اس شخص کو، جسے اس نے ھبہ کیا تھا، تنگ کرنا اور اسے نقصان پہنچانا مقصود ہوگا۔ ان دونوں وجوہ میں سے خواہ کوئی وجہ بھی ہو

ہر ایک کا منشا اور منبع بداخلاقی اور خفت ہی ہے۔ علاوہ ازیں معاشرتی مصالح کے حق میں ہدیہ دینا اتنا مفید نہیں جتنا اس کا واپس لینا اس کے حق میں مضر ہے۔ اس سے اس شخص کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ اسے اپنی سخت ہتک تصور کرے گا اور اس تصور سے اس کا مشتعل ہو جانا بلکہ انتقام پر اتر آنا یقینی ہے۔ اس اندیشہ اور خطرہ کی وجہ سے کسی شخص کے لیے۔ اگر اس کے کئی بیٹے ہوں۔ جائز نہیں کہ ایک لڑکے کو کوئی چیز ھبہ کرے اور دوسروں کو یونہی چھوڑ دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا سگے بھائیوں کو باہم دشمن بناتا ہے۔

وصیت

وصیت کا رواج ہر ملک اور قوم میں رہا ہے۔ اہل اسلام کو بھی اس کی اجازت دی گئی ہے لیکن چند قانونی پابندیوں کے ساتھ۔

ا۔ آدمی اپنے کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ لا وصیة لوارث وارث کے لیے وصیت نہیں ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان فرما دی گئی ہے۔ ان اللہ اعطی لکل ذی حق حقہ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ہر حقدار یعنی وارث کا حق خود ہی متعین کر دیا ہے۔ اہل جاہلیت وصیت کے بارے میں بڑی ہی افراط و تفریط سے کام لیتے تھے۔ وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر حق اور مصلحت کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑ دیتے اور واقعی حقدار کو اس کے حق سے محروم کر کے دور کے لوگوں کے لیے سارا مال وصیت کر جاتے۔ اس کم بینی اور ناحق شناسی کا دروازہ بند کرنا ضروری تھا۔ پھر اس کی جگہ ایک متوسط اور متوازن اور صالح تمدن سے اوفق راہ متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ وصیت کا زیادہ مستحق ان متعلقین کو ٹھیرایا جائے جو رحمی رشتہ رکھتے ہوں بمقابلہ ان لوگوں کے جو محض عارضی اسباب کی وجہ سے قریب ہو گئے ہوں۔ لیکن جب قرآن نے میراث کے مفصل اور متعین احکام نازل فرما دیئے اور ہر ایک وارث کا حصہ یہ کہہ کر متعین کر دیا کہ "یہ اللہ تعالےٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں ان میں کمی بیشی نہ ہونے پائے، اللہ نے میراث کی اس تقسیم میں معاشرت اور تمدن اور قرابت کے جن مصالح اور حکم کو مرعی رکھا ہے ان کی کنہ تک تمہاری نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں،" تو پھر کسی وارث کے حق میں وصیت کا کوئی موقع ہی نہیں رہا ورنہ خدا کی حدود ٹوٹ کر رہیں گی۔

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ   نیز اس سے یہ بھی خطرہ
ہے کہ وارثوں کے درمیان بغض اور عداوت کا ایک خوفناک جذبہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ ہر
وارث چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ شریعت نے میراث کا قانون منضبط کر کے
ان کی ان متصادم خواہشوں کے مفاسد کا سدباب کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ایک خاص
رشتہ دار کے حق میں وصیت کرتا ہے تو گویا دوسرے ورثہ کو اس کے خلاف نفرت اور بغض
وحسد پر اُبھارتا ہے۔

۲۔ وارثوں کے لیے کم از کم دو تہائی مال چھوڑنا ضروری ہے۔ وصیت کرنے والے کو زیادہ سے
زیادہ اپنے مال کا ایک تہائی حصہ وصیت کے ذریعہ سے غیر وارث لوگوں کو دینے کا حق دیا گیا ہے۔
سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک مرتبہ بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک
ہوں، مگر صرف ایک لڑکی ہے جس کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں، تو میں کس قدر مال کی
وصیت کر سکتا ہوں؟ کیا تمام مال کی یا نصف کی یا ثلث کی؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا "ایک تہائی کی
وصیت کر دو اور وہ بہت ہے تمہارا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم
انہیں اس حال میں چھوڑو کہ وہ لوگوں پر بار ہوں"۔

مال متروکہ کے اصل وارث اور مستحق تو فطرتاً اور عداً اس کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اگر وہ دوسروں
کے لیے اپنے مال کی وصیت کر جاتا ہے تو اقرباء کی کتنی بڑی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ
خود حکمت و تمدن کا مقتضا ہے کہ مرنے کے بعد میت کا ترکہ وہی لوگ پائیں جو دنیا میں اس کے
سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ خیر سگال، سب سے زیادہ ہمدرد اور مددگار تھے اور
ان باتوں میں باپ بیٹے وغیرہ جیسے ذوی الارحام سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے چنانچہ اسی لیے
قرآن میں آتا ہے کہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ
اللہ کی کتاب یعنی قانون میں رحمی رشتہ رکھنے والے ایک دوسرے کے زیادہ قریبی اور یگانہ ہیں
اس لحاظ سے تو تمام ترکہ ورثہ ہی کو ملنا چاہیے۔ مگر علم حکمت کی نگاہ حقیقت بیں دقیق اور خارجی
مصالح کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ فرض کرو کسی کی تربیت میں کوئی یتیم بچہ ہے۔ یا کسی کے ایسے
غریب رشتہ دار ہیں جنہیں از روئے قانون وراثت نہیں پہنچتی کیا وجہ ہے کہ ان کی مدد کا دروازہ

بند کردیا جائے؟ اسی طرح اگر کوئی دولت مند آدمی اپنے چھوڑے ہوئے مال میں سے ایک حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کرنا چاہتا ہو تو کیوں اس کو ایسے نیک کام سے روکا جائے؟ پس شریعت میں دونوں پہلوؤں کے درمیان پورا توازن قائم کیا گیا ہے۔ نہ جائز حقدار اپنے حق سے محروم کیے جا سکتے ہیں، اور نہ فضل و احسان ہی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

۳۔ وصیت کرنے والے کو چاہیے کہ آخری وقت کا انتظار نہ کرے بلکہ وصیت لکھ کر محفوظ کر دے۔ حدیث میں مذکور ہے کہ "کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایک رات اس حال میں گذار دے کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو اور وہ وصیت اس نے لکھ دی ہو"۔ اس حکم کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صبح تک وہ اس دنیا میں نہ رہے اور جن مصالح اور مقاصد کے لیے اس نے وصیت کا ارادہ کیا ہے وہ فوت ہو جائیں لہٰذا

سلو ترجمان القرآن۔ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور اس نے اپنے والدین اور اقربا کے لیے اچھا خاصا مال چھوڑا ہو تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ اخلاقی طور پر اس مال میں سے کچھ وصیت کرے یہ حق ہے پرہیزگاروں پر

اس آیت میں خیر (یعنی اچھے خاصے مال) سے مراد اتنا زیادہ مال ہے جس میں سے تمام وارثوں کو کافی حصہ پہنچنے کے باوجود ایک معتدبہ حصہ بچ سکتا ہو۔ مال کم ہونے کی صورت میں وصیت نہیں ہے، چنانچہ حضرت علی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے ایک عزیز کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انہوں نے پوچھا کیا میں وصیت کروں؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان ترک خیرا کی شرط لگائی ہے۔ تم کچھ بہت مال تو رکھتے ہی نہیں تھوڑا سا مال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو۔" البتہ مال زیادہ ہونے کی صورت میں بعض کے نزدیک مستحب اور بعض کے نزدیک واجب ہے کہ ایک حصہ جو ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو کسی کارِ خیر میں صرف کرنے کے لیے وصیت کر دی جائے۔ اور آیت کے الفاظ ان لوگوں کے قول کی تائید کرتے ہیں جو وصیت کو واجب قرار دیتے ہیں (کتب علیکم۔ اور حقاً علی المتقین) ابن عباس، اور حسن بصری اور بعض دوسرے اکابر صحابہ و تابعین وجوب ہی کے قائل ہیں۔

وقف :-

تبرعات ہی کی ایک قسم وقف بھی ہے۔ اب تک تعاون و تبرع کی جتنی صورتیں بیان ہو چکی ہیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں قبل اسلام بھی رائج تھیں۔ لیکن وقف کا طریقہ بالکل نامعلوم تھا۔ یہ شارع اسلام علیہ السلام کا مخصوص اجتہاد ہے، جس کے اندر نظام معیشت و معاشرت کے ایسے مصالح پوشیدہ ہیں جو دیگر اقسام صدقات و تبرعات سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص خواہ کتنا ہی بڑا خزانہ فقراء و مساکین کے لیے صدقہ کر دے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مدت مخصوص کے بعد وہ ضرور ختم ہو جائے گا اور ان فقراء کے بعد جو حاجت مند ہوں گے وہ اس صدقہ عامہ سے کوئی حصہ نہ پا سکیں گے۔ پس مقاصد کے کمال حصول اور رفاہ خلق کی عمومیت کے لحاظ سے صدقہ کی اس شکل سے بہتر کوئی شکل نہیں ہو سکتی کہ کوئی مال یا جائداد غرباء و مساکین اور دیگر حاجت مندوں کے حق میں اس طور پر بخش دی جائے کہ اصل ہمیشہ اپنی حالت پہ باقی رہے، اس میں سے کچھ بھی خرچ نہ ہو اور محض اس کے منافع سے حاجت مندوں کی حاجت روائی ہوتی رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت نے ان الفاظ میں وقف کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

ان شئت حبست اصلها	اگر تم چاہو تو اس (مال یا جائداد) کی اصل روک
وتصدقت بها	لو اور اس کا (یعنی اس کے منافع) کا صدقہ کر دو۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے یونہی کیا اور اس جائداد کو اس شرط پر وقف کر دیا کہ نہ تو وہ بیچی جا سکے گی نہ ہبہ کی جا سکے گی نہ اس میں میراث جاری ہو گی، بلکہ محض اس کے منافع فقیروں (حاجت مند) قرابت داروں، غلاموں، مسافروں اور مہمانوں اور دیگر شرعی ضروریات پر خرچ کیے جائیں گے۔ اس کا متولی اگر حسب دستور اس کی آمدنی میں سے خود بھی کھانے لیے لے لیا کرے تو اس کے لیے جائز ہے۔

اختلافی مسائل اور ان کا نقطۂ عدل

اسلام وحدت کا پیام لیکر آیا تھا مگر اس وقت جہل و تعصب کے ہاتھوں میں پڑ کر وہ اختلاف و نزاع کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ مذہب کے چند جزئی مسائل نے باہمی ہنگامہ آرائیوں کا جو طوفانِ عظیم بپا کر رکھا ہے، ان کی حقیقت پر جب میں نے پوری طرح غور کیا تو یہ پایا کہ ہر گروہ حق و اعتدال کے مرکز سے کچھ نہ کچھ ہٹا ہوا ہے اور بیجا تعصب اور غلو سے کام لے رہا ہے۔ ہر ایک اتباعِ حق کا مدعی ہے، مگر سچائی کی اخلاص طلب شاہراہ پر چلنے کے بجائے جذبات کی لہروں میں بہ رہا ہے۔ مجھے رحمت الٰہی کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے عدل کی میزان بھی بخشش دی ہے جس پر حق اور باطل کو تول کر میں اندازہ کر رہا ہوں کہ حق کی سیدھی صاف راہ کون سی ہے، اور وہ اس وقت کس طرح اختلافات کی خارزار بن گئی ہے، اور نزاعات و اختلافات کی بنیاد کیا ہے۔

اہلِ زمانہ کی اس افسوسناک حالت کو دیکھکر ضروری معلوم ہوا کہ اُن مسائل کی اصل نوعیت انہیں سمجھا دی جائے جن کے اندر ان کے افکار اُلجھ کر رہ گئے ہیں، اور جن کی تائید و تردید میں ان کے قلم بغیر کسی کی بصیرت کے بیجا جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں۔

ان میں سے سب سے اہم مسئلہ تقلید کا ہے۔ ائمہ اربعہ کی تقلید کا جواز قریب قریب ساری اُمت کا اجماعی مسئلہ ہے۔ اور اس کے اندر جو مصالح ہیں انہیں ہر دیکھنے والی آنکھ

دیکھ سکتی ہے، خصوصاً اس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ عام قوائے فکریہ پر جمود اور دوں ہمتی کی موت سی طاری ہے، دلوں میں طلب حق کا کوئی جوش اور ولولہ باقی نہیں. شریعت کے قوانین انسانی آراء پر قربان کیے جا رہے ہیں، اور ہر کس و ناکس خود پرستی اور خود رائی کے نشہ میں چور ہے۔

تقلید کے بارے میں ابن حزم کے اس قول سے کہ آیات قرآنی اور اجماع سلف کی رو سے تقلید حرام ہے اور خود ائمہ مجتہدین نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے. لوگوں کو عجیب غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے اور ہر عامی و جاہل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے حالانکہ یہ قول بجائے خود بالکل برحق ہے. اپنا ایک خاص محل اور معنی رکھتا ہے اور اس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے:

ا۔ جو اپنے اندر اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو. خواہ ایک ہی مسئلہ میں ہی۔

۲۔ جو اچھی طرح جانتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کا حکم دیا ہے، یا فلاں بات سے روکا ہے، اور یہ حکم منسوخ نہیں ہے. اس بات کا علم خواہ اُسے احادیث تتبع اور مخالف و موافق دلائل کے استقراء سے حاصل ہو، یا یہ دیکھ کر کہ ارباب علم و بصیرت کا سواد اعظم اس طرف جا رہا ہے اور مخالف کے پاس قیاس آرائیوں اور منطقی دقیقہ سنجیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ایسی صورت میں حدیث نبوی کی مخالفت کا سبب یا تو کھلا ہوا حمق ہو سکتا ہے یا کوئی چھپا ہوا نفاق۔

شیخ عزالدین عبدالسلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حیرت ہوتی ہے ان تقلید پرست فقہاء پر کہ جو اپنے امام کی اجتہادی غلطی سے واقف ہونے کے بعد اس کے قول پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور اسے ترک کر کے کسی ایسے قول کو اختیار نہیں کرتے جو اپنی صحت پر کتاب و سنت اور قیاس صحیح کے بے شمار شواہد رکھتا ہو. بلکہ بعض اوقات تو یہ نادان اس اندھی تقلید کے اندھے جوش میں عملاً ظواہر کتاب و سنت کی بھی مخالفت پر تُل جاتے ہیں اور اپنے امام کی اصابت رائے بلکہ "معصومیت" ثابت کرنے کے

لیے نصوص شرعیہ کی ایسی رکیک، مہمل اور فاسد تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر تحریف کلام کی مکروہ اور حیرت انگیز مثال شاید ہی مل سکے" پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

"صدر اول میں جس سے بڑھ کر مبارک اور حق شناس دور شاید قیامت تک نہ آئے، لوگوں کا حال یہ تھا کہ جس عالم دین کو پا جاتے اس سے فتویٰ پوچھ لیا کرتے تھے۔ بغیر اس تحقیق اور تجسس کے کہ یہ عالم کس خیال اور مسلک کا پیرو ہے۔ لیکن اس دور کے بعد حالت میں ایک عظیم الشان فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ چار مذاہب اور ان کے جامد مقلدین کا ظہور ہوتا ہے اور ہدایت کے اصل مرکز سے بالکل بے پروا ہو کر صرف ائمہ کے اقوال پر اعتماد کر لیا جاتا ہے خواہ ان کا کوئی قول کتنا ہی کمزور اور بے دلیل و حجت ہو۔ گویا مجتہد، مجتہد نہ رہا، اللہ کا رسول بنا لیا گیا۔ جو خود معصوم ہے اور اس کی ہر بات وحی الٰہی ہے۔ یہ راستہ حق کا راستہ نہیں ہے بلکہ سراسر جہل اور باطل کا راستہ ہے۔"

امام ابوشامہ کا فیصلہ بھی سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں۔

"جو شخص فقہ سے دلچسپی رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ کسی ایک ہی امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر مجتہد کے اقوال پر نظر ڈالے۔ تمام کے اندر ڈوب کر حق کا سراغ لگائے اور اس غواصی میں اسے جو قول قرآن و سنت سے زیادہ اقرب ملے اسی کو اختیار کر لے۔ اگر علوم اوائل کے ضروری حصول پر اس کی نگاہ ہوگی تو ان شاء اللہ یہ قوت تمیز اسے بآسانی حاصل ہو جائے گی اور کسی وقت اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر وہ شریعت کی اصل شاہراہ پالے گا۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ تعصب کے مہلک جراثیم سے اپنے دماغ کو پاک رکھے اور اختلاف و نزاع کی اُن پر خطر وادیوں میں ہرگز قدم نہ رکھے جسے متاخرین نے تیار کر رکھا ہے، کیونکہ وہاں تضیع اوقات اور انتشار طبع کے ماسوا کچھ نہیں مل سکتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنی اور ہر دوسرے امام کی تقلید سے منع فرمایا ہے جس کا ذکر مزنی نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔"

(۳) ابن حزم کا فتویٰ اس شخص پر بھی منطبق ہوتا ہے جو عامی اور علم دین سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر تقلید کرتے میں تو حق بجانب ہو، مگر وہ کسی خاص امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہو کہ اس سے خطا کا ارتکاب غیر ممکن ہے، اور اس کا امام جو کچھ کہتا ہے وہ

حق ہی ہوتا ہے۔ نیز اس اعتقاد کے ساتھ وہ اپنی جگہ یہ فیصلہ بھی کرے کہ اس خاص امام کی تقلید پر وہ ہر حال میں قائم رہے گا، خواہ کسی مسئلہ میں اس کے قول کا خلافِ قرآن و حدیث ہونا ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہی وہ یہودیت ہے جس نے بنی اسرائیل کی توحید کو بالکل شرک سے بدل دیا تھا جیسا کہ امام ترمذی نے عدی ابن حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ پڑھ کر فرمایا کہ یہود اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کی عبادت تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو ان کے علماء اور مشائخ حلال کہہ دیتے اسے وہ بغیر کسی شرعی دلیل کے، حلال مان لیتے تھے اور جس شے کو وہ حرام قرار دے دیتے اسے وہ حرام سمجھ لیتے تھے۔"

پس کسی امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرنا کہ اس کی زبان عین شریعت کی زبان ہے یقیناً غیر اللہ کی پرستش ہے۔

(۲) جو شخص اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ، یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کے پیچھے نماز پڑھے، وہ بھی ابن حزم کے فتوے کی زد میں آ جاتا ہے، اس لیے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہ و تابعین کرام کے عمل کی کھلی ہوئی مخالفت ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشا۔ ان قیود اور شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا اور جہاں صورت حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص ہے جو محض اقوالِ رسولؐ ہی کو دین سمجھتا ہے، صرف اسی چیز کی حلت کا اعتقاد رکھتا ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا ہو، اور صرف اسی شے کو حرام سمجھتا ہے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہو، یعنی تحریم و تحلیل کا حق وہ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی اور کو نہیں دیتا، لیکن اس ایمان اور اعتقاد کے باوجود چونکہ وہ اقوالِ رسولؐ پر وسیع نظر نہیں رکھتا، نہ متعارض نصوص کو تطبیق دینے کی قدرت رکھتا ہے، اور نہ نصوص شرعیہ سے احکام کا استنباط کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ ایک ایسے ثقہ اور صحیح النظر عالم دین کا اتباع کرتا ہے جو اس کے نزدیک سنت

رسول کے مطابق فتویٰ دینے والا ہے، اور یہ اتباع بھی وہ اس نظریہ کے ساتھ کرتا ہے کہ جب کبھی کوئی نصِ شرعی اس کے خلاف ملے گی تو بغیر کسی تعصب اور اصرار کے وہ اس قول کو ترک کر دے گا تو پھر نہیں معلوم کہ کوئی شخص کیونکر ایسی تقلید یا اتباع کو ناجائز کہہ سکتا ہے، جب کہ عہد نبوی سے لے کر اب تک تمام مسلمانوں میں افتاء اور استفتاء کی یہی سنت متواترہ چلی آ رہی ہے۔ اب خواہ کوئی انسان کسی ایک ہی فقیہ سے ہمیشہ فتویٰ پوچھا کرتا ہو، یا کبھی ایک فقیہ سے اور کبھی دوسرے سے دونوں فعل جائز ہیں، بشرطیکہ مستفتی، فقیہ اور رسول کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

پس ہماری تقلید پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جبکہ ہم کسی امام کے متعلق یہ ایمان نہیں رکھتے کہ وہ معصوم ہے، اللہ تعالے نے اس پر علم فقہ کی وحی نازل فرمائی ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض کر دی ہے۔ ہم تو اگر کسی امام کا اتباع کرتے ہیں تو یہ جان کر کرتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت کا عالم اور روح شریعت کا مزاج شناس ہے، اس لیے اس کا قول یا تو آیات و احادیث کے صریح دلائل پر مبنی ہے، یا ان سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔ یا پھر قرائن سے اس نے یہ بات تحقیق کر لی ہے کہ یہ حکم فلاں علت کی بنا پر ہے اور جب اسے اپنی فہم کی صحت پر پورا اطمینان ہو گیا ہے تب ہی اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے، گویا وہ دراصل زبان حال سے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ میرے خیال میں شارع علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے گی وہاں یہی حکم جاری ہوگا اور ایسے تمام قیاسی احکام اسی عموم میں داخل ہوں گے، یا بالفاظ دیگر یہ اقوال بھی شارع علیہ السلام کی طرف منسوب شمار کیے جائیں گے اگرچہ ان کی قطعیت یقینی اور شکوک سے بالکل پاک نہیں کہی جا سکتی۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی مسلم کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ پس اگر رسولؐ معصوم (کہ صرف آپ ہی کی اطاعت اللہ نے ہم پر فرض کی ہے) سے ہمیں کوئی ایسی صحیح روایت مل جو قولِ امام کی مخالفت کرتی ہو، اور پھر بھی ہم اس کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے نصِ قطعی کو چھوڑ کر ظنی انسانی کی تقلید پر جمے رہیں، تو ہم سے بڑھ کر شقی اور نامراد کون ہوگا اور کل

خدائے قہار کے سامنے ہم کیا جواب دیں گے؟

جائز تقلید کی صحیح تصویر یہی ہے جو ان چند لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔ اگر امت مسلمہ غلو سے اپنے قوائے فکریہ کو آزاد کرلے اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کے پردے ہٹا کر اصل تصویر دیکھنے لگے تو بہت سی لفظی نزاعیں ختم ہو جائیں اور مذہبی اختلافات کی شورانگیز فضا کسی قدر امن و سکون کی خوشگواریوں سے بدل جائے۔

مسئلہ تقلید کے بعد دوسرا اہم مسئلہ استخراج مسائل کا ہے، جس کے دو اصول ہیں: ایک تو یہ کہ الفاظِ حدیث کا تتبع کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ فقہاء کے اصول کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا جائے۔ شرعاً ان دونوں اصولوں کی اہمیت مسلم ہے۔ ہر دور کے فقہائے محققین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں اصولوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ کوئی ایک کی رعایت زیادہ کرتا کوئی دوسرے کی۔ لیکن ایسا کبھی نہ کرتے کہ کسی اصل کو بالکلیہ ترک کر دیں۔ پس کسی جویائے حق کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیسا کہ آج دونوں فریق کا عام شیوہ ہے۔ اور یقین کرو کہ ان کا یہی "شیوہ" ان کی ساری ضلالتوں کا ذمہ دار ہے۔ ان دونوں اصولوں کو الگ الگ کر کے ہدایت کی سیدھی راہ پانا بہت مشکل ہے۔ حق کا راستہ یہ ہے کہ ان میں تفریق کرنے کے بجائے دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے، اور ایک سے دوسرے کی عمارت ڈھانے کے بجائے اس کے کمزور مقامات کی اصلاح اور تشیید کا کام لیا جائے۔ اس طرح احکام دین کا جو قصر تعمیر ہوگا، نہایت مستحکم اور حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوگا، اور اس میں باطل کے راہ پانے کی کوشش قریب قریب بیکار ثابت ہوگی۔ اسی محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سنتکم واللہ الذی لا الٰہ	اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں
الا ھو بینھما بین الغالی والجافی	کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک (بوجہ سہل انگاری کے) نہ پہنچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے۔

یعنی حق کا مرکز افراط و تفریط کے بیچ میں ہے۔ جو اہل حدیث ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی رایوں پر پیش کر لیا کریں۔ اسی طرح جو اہلِ

تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کیا کرتے ہیں، انہیں بھی چاہیے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور مانے ہوئے پر قربان نہ کریں، اور نہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ فرمودۂ نبویؐ کی صریح مخالفت کا انہیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدث کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان اصول حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغل سے کام لے جنہیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے، کیونکہ بہر حال وہ بھی انسان ہی تھے۔ فکر و نظر کی لغزشوں سے ان کے بنائے ہوئے قواعد محفوظ نہیں کیے جا سکتے۔ اور نہ شارع کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے۔ اس اصول پرستی کے تشدد آمیز رویہ سے بسا اوقات حدیث، اور قیاس صحیح دونوں کو رد کر دینا پڑتا ہے مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور ناقابل استناد ٹھیرا دی جاتی ہیں، حالانکہ فی نفسہ وہ قولِ رسول ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف و باجوں کو حرام قرار دینے، والی حدیث کو ناقابل حجت قرار دے دیا، صرف اس وجہ سے کہ امام بخاری کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہٖ صحیح اور اس کا سلسلہ اسناد متصل ہے۔ ہاں اگر کسی قوی نص سے تعارض ہو تو البتہ انقطاع کے شبہ کی بنا پر اسے مرجوح قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن حدیث کو سرے سے متروک ٹھیرا دینا یقیناً زیادتی ہے۔

اسی طرح ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اتنا اعتناء نہیں کرتا تو کلیۃً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدم اور مرجح مانی جائیگی، خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح اور برتری کے کتنے ہی واضح دواعی کیوں نہ موجود ہوں۔ لوگوں کی یہ ظاہر پرستی سخت تنقید کے قابل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عام رواۃ، حدیثوں کو بالمعنی بیان کیا کرتے تھے، الفاظ و حروف کے محفوظ رکھنے کا چنداں رواج نہ تھا۔ پس ادبی تصانیف میں جس طرح اہل ادب و بلاغت ایک ایک حرف کے تقدم و تاخر اور اس کی وضع و ترتیب سے نکتہ آفرینیاں کیا کرتے ہیں، ویسا

ہی تعمق متن حدیث میں برتنا، حتی کہ ایک کلمہ کی تقدیم یا تاخیر، الفاظ کی نشست اور فاء اور واؤ جیسے حروف کے دقیق معنوی خصائص سے استدلال کا رُخ متعین کرنا، جبکہ عام روایتیں بالمعنی بیان کی گئی ہیں ایک طرح کی لغویت اور الفاظ کی نابدا غلامی ہے۔ ورنہ تم دیکھتے ہو کہ ایک ہی روایت میں ایک راوی ایک لفظ استعمال کرتا ہے اور بعینہٖ اُسی روایت میں اُسی سند کے ساتھ دوسرا راوی ایک دوسرے ہی لفظ کے ذریعہ حدیث کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

متن احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہئیے کہ راوی، جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہے اسے کلام نبوی کی حیثیت سے مان لیا جائے۔ ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے تو مقدم الذکر کو ترک کر کے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط اُن فقہاء پر بھی عائد ہوتی ہے جو ائمۂ مجتہدین کے اصول اور فتاوی کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ ان کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ دنیا جہان کے سارے مسائل کا حل انہیں اصولوں میں تلاش کیا کریں، اور اُن میں سے کُرید کُرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان کے ائمہ کے اصول اور ان کی تصریحات سے کوئی دور کا تعلق ہو، نہ علمائے لغت ان سے یہ معانی سمجھ سکیں، اور نہ عرف عام میں ایسا طریقہ سخن فہمی رائج ہو بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے، یا ایک ادنیٰ مشابہت تلاش کر لی جائے اور اُسے قولِ مجتہد مان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیار حکم ٹھیرا دیا جائے۔ ستم پر ستم یہ ہے کہ ان تمام تدقیقات کو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ امام کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اگر وہ امام جس کے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آجائے اور یہ مسائل براہِ راست اُس سے پوچھے جائیں، تو باوجود اپنی تمام فہم و بصیرت اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کے، ان بلند و قائق تک اس کا تخیل پرواز نہ کر سکے گا، جنہیں اس کے پیچھے چلنے والوں نے اس کے اقوال سے مستنبط کر رکھا ہے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے، نہ کہ اس کی غلط ترجمانی اور اس کے اشارات

بے جا حاشیہ آرائی۔ اور وہیں تک اس کا تحقق ہو سکتا ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصولِ فہم و تدبر کے مطابق اجازت دے سکیں، ورنہ اگر قائل کے کلام کا رخ کسی طرف ہو اور اس کا ترجمان و مفسّر کوئی اور رخ متعین کرے تو یہ تفسیر اور ترجمانی یا مقلدانہ تخریج نہ ہو گی بلکہ کوئی اور ہی چیز ہو گی۔

اس کے علاوہ ایسے فقہاء کو اس بات کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اصول کی پیروی کے جوش میں ایسی مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیا کریں جنہیں عام امت میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہو۔ مثال کے طور پر حدیث مصراۃ کو لو، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"جو شخص ایسی بکری خریدتا ہے جس کا دودھ تھن میں پہلے سے روک لیا گیا تھا (تاکہ خریدار دھوکہ میں آکر زیادہ دام لگا دے)، تو اسے تین روز تک اختیار رہتا ہے۔ خواہ بکری رکھ لے یا ایک صاع گندم کے ساتھ واپس کر دے۔"

یہ حدیث متعدد طرق سے ثابت ہے اور ثقات نے اس کی روایت کی ہے لیکن احناف نے چونکہ یہ اصول وضع کر رکھا ہے کہ اگر راوی غیر فقیہ ہو اور اس کی روایت عام اصول کے مخالف ہو، اور کوئی عام قاعدہ نہ بنا سکتی ہو تو وہ سرے سے وہ حدیث متروک العمل ہو گی، اس لیے باوجود صحیح اور مستند ہونے کے یہ حدیث ان کے نزدیک متروک العمل ہے کیونکہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی اور راوی غیر فقیہ ہے۔

یہ طریقہ اربابِ حق کا طریقہ نہ ہونا چاہیے۔ اس میں شریعت پر ایک طرح کی جسارت پائی جاتی ہے۔ فرمانِ رسالت کا احترام بہرحال انسانوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد کی رعایت سے بالاتر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی غلط روی سے بچانے کے لیے فرمایا ہے:

"جب میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے دوں یا کوئی اصول مقرر کروں پھر رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان اس کے خلاف مل جائے تو میری رائے کالعدم سمجھو۔ رسول اللہ کا فرمانا ہی اصل اصول ہے بقیہ سب ہیچ ہے۔"

اب ہم موجودہ مسائل مہمہ میں سے تیسرے مسئلہ پر جو قرآن وسنت کے تتبع سے متعلق ہے بحث کرنی چاہتے ہیں۔

احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کتاب وسنت کا جو تتبع کیا جاتا ہے اس کے مختلف مدارج ہیں۔ سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بالفعل احکام شرعیہ کی معرفت پر اتنا عبور ہو جائے کہ وہ مستفتیوں کے اکثر سوالوں کا جواب بآسانی دے سکے، اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے عام واقعات کا شرعی حل معلوم کرنے میں اسے توقف اور خاموشی سے بہت کم کام لینا پڑے یہی مقام اجتہاد ہے۔ اس استعداد و قابلیت کے حصول کے چند طریقے ہیں:۔

ا۔ کبھی یہ استعداد احادیث میں غائر تفکر اور شاذ و غریب روایتوں کے تتبع سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ امام احمد بن حنبل کا خیال ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ اس ملکہ کے حاصل کے لیے بس یہی تفکر اور تتبع کافی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے ضروری ہے کہ ایک ماہر لغت وادب کی طرح مواقع کلام اور اسالیب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور ایک وسیع النظر عالم کی طرح یہ بھی جانتا ہو کہ ائمہ سلف متعارض نصوص میں جمع و تطبیق کی صورت کس طرح پیدا کرتے تھے اور ان کے استدلال کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا۔

۲۔ کبھی یہ قابلیت اصول تخریج کو پوری طرح ضبط کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان کسی امام کے اصول کو سامنے رکھ کر استنباط مسائل کا طریقہ جان جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث اور آثار کے ایک معتدبہ حصہ پر اس کی نظر ہو، تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کہیں اس کا قول اجماع سے ٹکرا تو نہیں رہا ہے۔ یہ طریقہ اہل تخریج کا ہے۔

۳۔ تیسرا راستہ جو مذکورۂ بالا دونوں راستوں کی بہ نسبت اعتدال کا راستہ کہا جاتا ہے یہ ہے کہ ایک طرف آدمی قرآن وسنت سے اتنی آگاہی رکھتا ہو کہ فقہ کے اصولی اور اجماعی مسائل اور ان کے تفصیلی دلائل کا علم اسے بآسانی حاصل ہو سکے۔ دوسری طرف بعض اجتہادی مسائل پر کامل دسترس رکھتا ہو، ان کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہ ہو، ایک قول کو دوسرے

قول پر ترجیح دے سکتا ہو۔ لوگوں کے طریقہ تخریج پر نقد اور کھرے کھوٹے کی تمیز کرسکتا ہو، خواہ اس کے اندر وسعت نظر اور تبحر کے وہ شرائط اور لوازم نہ پائے جائیں جو ایک مجتہد مطلق کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کے لیے جائز ہے کہ مختلف مسائل کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے، اور وہ مختلف مذہبوں کے دلائل سے واقف ہو کر کچھ باتیں ایک مذہب کی اور کچھ دوسرے مذہب کی لے لے (یعنی تلفیق کرے)، اور بعض ایسی تخریجات کو ترک کردے جو اگرچہ متقدمین کے نزدیک قابلِ قبول رہی ہوں لیکن وہ اپنی تنقید اور تحقیق کی روشنی میں انہیں غلط پائے۔ اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ جن علماء کو مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ نہ تھا، وہ اپنی فقہی تصانیف میں خود مسائل کی تخریج کرتے ہیں اور اکابر سلف کی آراء میں موازنہ کرکے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب اجتہاد اور تخریج دونوں قابل تجزیہ و تقسیم ہیں اور کسی جزئی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کے لیے آدمی کا مجتہد مطلق ہونا شرط لازم نہیں ہے تو پھر مسائل کی تحقیق میں اس طریقہ کا اختیار کرنا لوگوں کی نگاہ میں کیوں مستبعد اور ناقابل قبول دکھائی دیتا ہے؟ تحقیق کا مقصود تو محض ظن غالب کے حصول تک ہے اور اسی پر تکلیف کا دارو مدار ہے۔

رہ گئے وہ لوگ جو اتنی گہری نظر نہیں رکھتے اور جنہیں اللہ نے اتنی فہم و بصیرت عطا نہیں کی ہے کہ قرآن و سنت پر غور کرکے بطور خود مسائل کی چھان بین کرسکیں، انہیں چاہئیے کہ اپنی زندگی کے عام معاملات میں مذاہب مروجہ کے اُن طریقوں اور فیصلوں کو اپنا مذہب سمجھیں جنہیں انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے اخذ کیا ہے۔ لیکن جو واقعات معمولی نہ ہوں بلکہ اہم اور نادر الوجود ہوں ان میں اپنے کسی قریب کے مفتی کا اتباع کریں اور قضایا میں قاضی کے حکم کی تعمیل کریں۔ بس یہی ان کے لیے سب سے محفوظ راہ ہے۔

اسی خیال پر ہم نے ہر مذہب کے قدیم اور جدید علماء محققین کو پایا ہے اور تمام ائمہ مذاہب نے اپنے پیروؤں کو اسی کی وصیت بھی کی ہے۔ الیواقیت والجواہر میں ہے:

"ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو اسے میرے قول پر فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں۔ خود امام موصوف جب کوئی فتویٰ دیا کرتے تو

کہتے یہ نعمان ابن ثابت کی دلیعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنے علم و فہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اس کی رائے صائب اور حق سے زیادہ قریب ہوگی۔"

" امام مالک رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ لے لینے کے قابل اور کچھ رد کردینے کے قابل۔ صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہؐ کی ذات معصوم ہے۔"

" حاکم اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایۂ صحت کو پہنچ جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو۔ ایک دوسری روایت میں امام صاحب کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔ ایک روز امام مزنی سے آپ نے فرمایا کہ اے ابراہیم میری ہر بات کی کورانہ تقلید نہ کرو بلکہ بذاتِ خود اس میں غور کرلیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے۔"

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ اللہ اور رسول کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی۔ جس طرح انہوں نے کتاب و سنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی تم بھی حاصل کرو۔ کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں تاوقتیکہ وہ تمام ائمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ اگر اس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ اس میں وہ تمام ائمہ جن کی عموماً پیروی کی جاتی ہے، متفق ہیں تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا اپنا قول اور فتویٰ نہ ہوگا بلکہ ائمہ مجتہدین کے قول کی ترجمانی ہوگی۔ لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے جس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ فلاں امام کے نزدیک یہ جائز ہے اور فلاں کے نزدیک ناجائز، مگر اسے یہ حق نہیں ہے کہ بقیہ اقوال کو چھوڑ کر کسی ایک رائے کو اختیار کرکے فتویٰ دیدے، الا آنکہ اس رائے اور مذہب کے دلائل سے بخوبی باخبر ہو۔

" امام ابو یوسفؒ اور زفرؒ وغیرہ علماء سے منقول ہے کہ جب تک کوئی شخص یہ نہ معلوم کرے کہ ہم نے یہ رائے کہاں سے اخذ کی ہے اس وقت تک وہ ہمارے اقوال پر فتویٰ دینے کا

مجاز نہیں۔"

"عصام ابن یوسفؒ سے جب کہا گیا کہ آپ امام ابوحنیفہؒ کی رایوں سے اکثر اختلاف کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو فہم اور دقتِ نظر حاصل تھی ہمیں حاصل نہیں۔ وہ ڈوب کر جن گہرائیوں سے حقائق نکال لاتے ہیں وہاں تک ہماری کمزور نگاہوں کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے ان کے اقوال پر فتویٰ دیں۔"

"ابوبکر الاسکاف البلخی سے پوچھا گیا "کیا ایسے شخص کے لیے جو اپنے شہر کا سب سے بڑا عالم ہو، جائز ہے کہ فتویٰ دینے سے رکا رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ عالم درجۂ اجتہاد رکھتا ہو تو جائز نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ درجۂ اجتہاد کب حاصل ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ جب ایک شخص مسائل کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہو اور معترضین کو معقول اور تسلی بخش دلیلوں سے خاموش کر سکے تو وہ مجتہد ہے۔"

ابن الصلاح کا قول ہے کہ "اگر کوئی شافعی ایسی حدیث پائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو اسے اپنے علم اور تفقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر وہ اپنے اندر اجتہادِ مطلق کی یا خاص اسی ایک مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی پوری استعداد پائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ غور کرنے کے بعد اس حدیث پر عمل کرے اور تقلید کا خیال ترک کر دے۔ لیکن اگر وہ اپنے کو اس مقام سے فروتر محسوس کر رہا ہے اور اجتہاد کی طاقت سے بے بہرہ ہے مگر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی معقول دلیل نہ پانے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت بھی اس پر شاق گزر رہی ہے تو بھی حدیث ہی کا اتباع کرنا چاہیے بشرطیکہ امام شافعی کے بجائے کسی اور امام نے اس پر عمل کیا ہو، کیونکہ اس صورت میں اس دوسرے امام کا اتباع امام شافعی کے اتباع کا قائم مقام ہو جائے گا۔" یہ ابن الصلاح کی رائے ہے اور امام نوویؒ نے بھی اسی کو مستحسن اور مختار قرار دیا ہے۔

چوتھا مسئلہ جسے ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ ذہنیتوں نے اختلاف اور شقاق کی رزمگاہ بنا لیا ہے وہ فقہاء کا باہمی اختلاف ہے۔ حالانکہ ان اختلافات میں سے اکثر، خصوصاً جن میں صحابہؓ بھی مختلف تھے اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں، مثلاً تشریق اور

عیدین کی تکبیروں کا اختلاف. نکاح محرم (حج کے لیے احرام باندھ لینے والے) کے جواز کا اختلاف ابن عباسؓ کے تشہد اور ابن مسعودؓ کے تشہد کا اختلاف بسم اللہ اور آمین کو آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کا اختلاف وغیرہ، فی نفسہ آپس میں نہ کوئی اساسی تباین رکھتے ہیں اور نہ ان کی اصل مشروعیت میں ائمہ سلف کا کوئی اختلاف ہے. بلکہ اختلاف جو کچھ ہے وہ محض ایک . . . . کو دوسرے پر ترجیح دینے میں ہے. یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب وسنت سے مستنبط ہیں. لیکن چونکہ ہر شخص کی نظر تحقیق اور قوت اجتہاد جدا گانہ ہوا کرتی ہے اس وجہ سے جو مذہب دوسرے کے نزدیک مرجوح تھا اس کے نزدیک راجح اور اولیٰ ثابت ہوا اور اس نے اسے اختیار کر لیا. مثال کے طور پر قرأت کو لو اور دیکھو کہ قرآن ایک ہی لفظ اور آیت کی قرأت میں کس قدر مختلف ہیں یہی حال علمائے فقہ کے اختلاف کا ہے چنانچہ وہ اکثر اپنے اختلاف کی تعلیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کی یہ رائے بھی تھی اور وہ بھی لیکن وہ بھی آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے. حالانکہ وہ سب کے سب ہدایت کی روشن شاہراہ پر تھے. کون ہے جو ان کے کسی فرد پر کجروی اور سنت نبوی کی مخالفت کا الزام عائد کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق مسائل اجتہادیہ میں تمام ارباب افتاء کے فتووں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے آتے ہیں اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں. چنانچہ تم اس قسم کے اختلافی مسائل کے بارہ میں تمام ائمہ مذاہب کو دیکھو گے کہ وہ مسئلہ کو پھیلا کر بیان کرنے اور تمام اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ "یہ میرے خیال میں احوط طریقہ ہے" "یہ رائے مختار ہے" "یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے" اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ "ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے" اس کے شواہد المبسوط، آثار محمدؒ اور اقوال شافعیؒ میں بے شمار موجود ہیں. یہ وہ مبارک دور تھا جب دین کا چشمہ صافی شقاق و نزاع کے مہلک جراثیم سے قریب قریب پاک تھا اور اجتہادی اختلافات جماعت کے لیے مقراض کا کام نہیں دے رہے تھے. لیکن اس کے بعد تعصب کا طوفانی سیلاب آیا. نگاہوں کی وسعت کم ہونے لگی. لوگوں نے بقیہ اختلافی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے صرف ایک پہلو کو لے لیا. اب اختلافات کی نوعیت

پہلی سی نہ رہی۔ انہیں بے حد اہمیت دے دی گئی۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرستی وجود میں آگئی۔ لوگوں کا ذوقِ تحقیق، جمود سے بدل گیا اور وہ اپنے ائمہ کے اختیار کردہ مسلک پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علمائے سلف سے اپنے ائمہ کے مذاہب پر ہمیشہ قائم رہنے کی تاکید منقول ہے، سو یہ یا تو ایک رجحان فطری کی بنا پر ہے کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی اور پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ ہم عام رسوم ورواج کے اندر بھی اس رجحان فطری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے اور ان کے خیال میں یہ دلائل بہت ہی مضبوط اور ناقابل تردید تھے۔ یہ اور اسی قسم کی اور وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تعصب کی سرشاری میں انہوں نے یہ کلمات کہے، محض وہم بلکہ سراسر بہتان ہے۔

اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذِ جنگ قائم ہو رہا ہے اور دیکھو کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لیے کونسا اسوہ چھوڑا ہے ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ بعض لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے۔ اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو قے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اختلاف موجود تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کسی نے کسی کی اقتداء سے کبھی انکار نہیں کیا امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اور امام شافعیؒ وغیرہ مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے حالانکہ اہل مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے۔ نہ آہستہ اور نہ زور سے۔ امام ابویوسف نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی، حالانکہ اس نے حجامت (پچھنے لگوانے) کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی۔ امام ابویوسفؒ کے مذہب میں پچھنوں کے بعد تجدید وضو لازم ہے مگر امام مالکؒ کے مذہب میں لازم نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل حجامت اور نکسیر کو ناقص وضو مانتے ہیں لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس کے بدن سے خون نکلنے

کے بعد وضو نہ کیا ہو تو آپ نے جواب دیا، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ امام مالکؒ اور سعیدؒ بن المسیب کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں؟ (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)

روایت ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ عیدین میں خلیفہ ہارون کی رعایت سے حضرت ابن عباسؓ کے مذہب کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے، حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔

امام شافعیؒ نے مقبرہ امام ابو حنیفہ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب سے دعائے قنوت کو ترک کر دیا اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔

امام ثانیؒ (امام ابو یوسفؒ) کے متعلق البزازیہ میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ کر جب لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کنویں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے۔ امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا کہ "تو پھر اس وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو قلہ کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے۔"

امام خجندیؒ سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شافعی المذہب آدمی نے ایک برس کی نماز چھوڑ دی ہو اور اس کے بعد وہ حنفی مذہب اختیار کرے تو پھر وہ کس طرح نماز کی قضا کرے؟ آیا امام شافعی کے مذہب کے مطابق یا حنفی مذہب کے مطابق؟ جواب دیا کہ جس مذہب کے مطابق اس نے قضا کر لیا جائز ہے، بشرطیکہ اس کے جواز کا اعتقاد رکھتا ہو۔

جامع الفتاویٰ میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے یہ کہا کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق، اس پر طلاق، اس پر طلاق (یعنی تین طلاقیں دیں)" پھر اس نے کسی شافعی المذاہب فقیہ سے فتویٰ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ "اس پر طلاق نہ پڑے گی اور تمہاری یہ قسم لغو ہو جائے گی"، تو اس مسئلہ میں امام شافعی کی اقتداء کرنے میں اس کے لیے کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اکثر صحابہؓ کرام کی تائید اسی مسلک کو حاصل ہے۔

امام محمدؒ نے اپنی امالی میں فرمایا ہے کہ "اگر کوئی فقیہ اپنی بیوی کو ان لفظوں میں

طلاق دے کر " انت طالق البتۃ " اور وہ اپنے مذہب کے مطابق ایسے طلاق کو تین طلاق یعنی طلاق بائن سمجھتا ہو، لیکن قاضی وقت فیصلہ کر دے کہ یہ طلاق رجعی ہے، تو اس کے لیے رجعت کرنے کی گنجائش ہے۔"

اسی طرح تحریم و تحلیل اور معاشرۃ اور لین دین کے اُن تمام معاملات میں جن کے اندر فقہا اور ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، ہر فقیہ پر لازم ہے کہ اگر دارالقضاء سے اس کے مذہب فقہی کے خلاف فیصلہ ہو تو وہ اپنی رائے اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر قاضی کے فیصلہ پر عمل کرے۔

چند مسائل اور ہیں جن کی اصلیت کے بارے میں ایک عام اور عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور درحقیقت یہی غلط فہمی موجودہ اختلافات کا سرچشمہ ہے، ہم انہیں یہاں مجملاً بیان کرنا چاہتے ہیں:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی وہ تمام تفریعات جو ان لمبی لمبی شرحوں اور فتاویٰ کی موٹی موٹی کتابوں میں موجود ہیں، سب کی سب امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے اقوال ہیں۔ وہ ان اقوال میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول اِن ائمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتووں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے۔ اور یہ جو ان کتابوں میں " علیٰ تخریج الکرخی کذا " اور " تخریج الطحاوی کذا " کے الفاظ آیا کرتے ہیں ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح " قال ابوحنیفۃ کذا " (امام ابوحنیفہ نے یوں فرمایا ہے) اور " جواب المسئلۃ علیٰ مذھب ابی حنیفۃ کذا " (امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں ہے) کے درمیان وہ کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے، اور ابن الہمام و ابن النجیم وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ دہ در دہ اور مسئلہ شرط تیمم[1] اور ایسے دوسری مسائل کے بارے میں یہ فرمایا کہ " دراصل یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں " ان کے نزدیک بالکل ناقابل اعتنا ہے۔

اسی طرح بعض اربابِ علم و مشیخت اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مذہب حنفی کی بنا انہی جدل

---

[1] حنفیہ کے یہاں تیمم کی اجازت اس وقت مل سکتی ہے جب کہ آدمی پانی سے ایک میل دور ہو۔

بحثوں پر قائم ہے جو المبسوط، الہدایہ اور التبیین کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے مذہب کی بنا پر ان بحثوں پر نہیں ہے بلکہ اس طریق بحث و جدل کے بانی دراصل معتزلہ ہیں، جسے متاخرین نے اس خیال سے اختیار کر لیا تھا کہ اس سے طلبہ کے ذہن میں تیزی اور وسعت پیدا ہوگی، اگرچہ ان کی تمنا بار آور نہ ہوئی اور ان کے اس طرز عمل نے دماغوں کو جلا اور وسعت دینے کے بجائے انہیں بے بصیرتی اور تعصب کی تنگنائیوں میں گھیر کر ناکارہ بنا دیا۔

ہم اس جگہ ان اوہام اور شکوک کی تردید میں لمبی گفتگو نہیں کرنی چاہتے، کیونکہ اس باب کی تمہید میں جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی روشنی ان میں سے اکثر کا خود بخود ازالہ کر دیتی ہے۔

۲۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کی اساس وہ اصول ہیں جو اصول بزدوی وغیرہ کتابوں میں درج ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر اصول ایسے ہیں جن کا ذکر ان بزرگوں نے کبھی نہیں کیا، بلکہ وہ ان کے اقوال و فتاویٰ کے سامنے رکھ کر بعد میں وضع کیے گئے ہیں۔ مثلاً میرے نزدیک فقہ کے حسب ذیل اصول ائمہ کے کلام سے بعد والوں نے نکالے ہیں اور امام ابوحنیفہ یا صاحبین سے کوئی صحیح روایت ایسی منقول نہیں جس میں یہ اصول مذکور ہوں۔

"خاص اپنے حکم میں خود واضح اور مبیّن ہے، اس کے ساتھ کوئی تشریحی بیان ملحق نہ کیا جائے گا۔"

"کسی حکم پر اضافہ اس حکم کا نسخ ہے۔"

"خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے"

"کثرت رواۃ لازمۂ ترجیح نہیں"

"غیر فقیہ راوی کی روایت اگر اصول وقیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں"

"مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس قسم کے بہت سے اصول فقہیہ ایسے ہیں جن کی تعیین و تعریف سے ائمہ کو کوئی تعلق نہیں، اور ایسے اصولوں کی محافظت کرنا اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کر

بڑے تکلفات کے ساتھ دفع کرنا، متقدمین کا طریقہ نہ تھا۔ ان کی محافظت و مدافعت ہماری توجہ کی صرف اسی قدر مستحق ہے جس قدر ان کے خلاف اصول و قواعد فقہ کی۔ اگر ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے میں تکلف سے کام لیا جائے جیسا کہ عام لوگوں کا شیوہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اصول کو اس جوشِ حمایت سے محروم رکھا جائے۔

اب ہم چند مثالیں دیکر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ان حضرات نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ "لفظ خاص اپنے حکم میں خود واضح ہے کسی تشریحی بیان کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے گا۔" یہ قاعدہ دراصل متقدمین کے اس فعل سے نکالا گیا ہے کہ انہوں نے آیت وَاسْجُدُوْا وَارْكَعُوْا کی بنا پر نماز میں صرف رکوع و سجود کو فرض قرار دیا اور اطمینان کو فرض نہیں ٹھہرایا حالانکہ حدیث میں یہ ارشاد موجود تھا کہ "آدمی کی نماز نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو پوری طرح ٹھہرائے نہیں۔" اس ایک معاملہ میں متقدین نے جو مسلک اختیار کیا، متاخرین نے اس سے ایک قاعدہ کلیہ وضع کر لیا۔ مگر دیکھو کہ متعدد معاملات میں وہ خود اپنے مقرر کئے ہوئے اس قاعدے کو کس طرح توڑتے ہیں۔

آیت وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ میں محض سر پر مسح کرنے کا حکم ہے۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ "وَامْسَحُوْا" کا لفظ خاص ہے، قاعدۂ مذکور کی رو سے چاہیئے تھا کہ سر کے مسح کی مطلق فرضیت کا فتویٰ دیا جاتا، لیکن حنفیہ یہاں اپنے اس قاعدہ کی پابندی نہیں کرتے اور اس حدیث کی بنا پر جس میں مذکور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناصیہ کا مسح فرمایا مسح کے لیے سر کے چوتھائی حصہ کی مقرر کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں حکم خاص کے ساتھ اس کی تشریح کو کیوں ملحق کیا گیا؟

قرآن کا حکم ہے اور لفظ خاص کے ساتھ ہے کہ "زانی اور زانیہ کو کوڑے مارو"۔ مذکورہ بالا قاعدہ کا اقتضا تھا کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب کو کوڑے ہی مارنے کی سزا دی جاتی مگر یہی احناف حدیثوں کو اس آیت کا بیان مانتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو تو کوڑے مارے جائیں، لیکن شادی شدہ مجرم کو سنگسار کیا جائے۔ کیا یہ

لفظ خاص کے ساتھ تشریح کا الحاق نہیں ؟

آیت اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا میں مطلقاً چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ قاعدہ مذکورہ کے مطابق چاہیئے تھا کہ ایک پیسہ کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا لیکن اپنی مقرر کئے ہوئے اصول کو بالائے طاق رکھ کر انہی حضرات نے دس درہم کی شرط لگائی اور حدیث کو آیت کا بیان قرار دیا۔

طلاقِ مغلظہ دینے کے بعد شوہر اگر از سرِ نو مطلقہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہے تو قرآن "حتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" کے الفاظ کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کے طلاق دینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کر چکا ہو۔ اس حکم کا لفظ یعنی "تنکح" خاص ہے جو اپنے متعارف مفہوم میں ایجاب و قبول تک محدود ہے پس آیت سے صرف اتنی شرط نکلتی ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح بمعنی ایجاب و قبول کرے لیکن فقہائے احناف نے حدیث "حتی تذوق عسیلته ویذوق عسیلتها" کو اس حکم کا بیان تسلیم کر کے نکاح کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ دوسرا شوہر اس عورت سے جماع بھی کرے۔

بتاؤ ان مثالوں میں اصول الخاص مبیّن لا یلحقه البیان کا کتنا لحاظ کیا گیا ہے؟

(ب) قرأت نماز کے متعلق نص قرآنی "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" میں "مَا تَيَسَّرَ" کا عموم چاہتا ہے کہ جتنی بھی اور جہاں سے بھی قرآن پڑھ لیا گیا نماز ہو جائے گی اور حدیث "لا صلوٰۃ الا بفاتحة الکتاب" کا ظاہری مفہوم چاہتا ہے کہ سورۃ فاتحہ کی قرأت ہر رکعت میں فرض ہے لیکن قدماء نے آیت کے عموم کو اپنی جگہ رکھا اور حدیث کو اس کا مخصص نہ مانتے ہوئے فتویٰ دیا کہ قرأتِ فاتحہ فرض نہیں ہے۔ اس طرح کے بعض اور اقوال سے متاخرین نے ایک کلی اصول یہ مستنبط کر لیا کہ "العام قطعی کالخاص" یعنی لفظ عام بھی اپنے حکم اور مفہوم میں خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے اس کا عموم تخصیص کا متحمل نہیں بلکہ وہ ایک مستقل حکم ہوتا ہے۔

اس اصول کا تقاضا تھا کہ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" کے عموم کو بھی قطعی

مان کر کہا جاتا کہ ہر چھوٹی بڑی ھدی جو بھی بآسانی میسر آسکے قربانی کے کام آسکتی ہے کیونکہ "فَمَا اسْتَيْسَرَ" کا لفظ عام ہے اس لیے اس کے مدلول اور مقصود میں بھی عموم اور وسعت کو باقی رکھنا چاہیئے۔ لیکن احناف حدیث سے خود ہی تخصیص فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ھدی کے لیے بکرا یا بکرے سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہیئے۔ کیا یہاں لفظ عام کی قطعیت خاص کی طرح قائم رہی۔

(س) اصول فقہ کی ایک محکم دفعہ یہ بھی ہے کہ "لا عبرة بمفهوم الشرط والوصف"۔ یعنی اگر کوئی حکم کسی خاص موقع پر دیا گیا ہو تو اس حکم کے اطلاق میں اس خاص موقع کی خصوصیت اور شرائط کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ یہ قاعدہ دراصل سلف کے اس مسلک سے نکالا گیا ہے جو انہوں نے آیت فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا " کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور بوجہ ناداری اس کے اخراجات کے متکفل نہیں ہو سکتے وہ لونڈی سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن متقدمین نے اس شرط عدم استطاعت کو قید جوازنہ مانتے ہوئے ذی استطاعت اور صاحب مقدرت انسان کو بھی لونڈی سے نکاح کی اجازت دے دی ان کے اس فتویٰ سے مندرجہ بالا اصول منضبط کر لیا گیا۔

لیکن اونٹ کی زکوٰۃ کے بارے میں یہ لوگ خود اس اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ نص کے الفاظ (فی الابل السائمة زكوٰة) ہیں جن میں یہی قید شرط مذکور ہے۔ اصول مذکور کے لحاظ سے چاہیئے تھا کہ سائمہ اور غیر سائمہ ہر نوع کے اونٹوں میں زکوٰۃ فرض قرار دی جاتی اور اس لفظ "السَّائمة" کے مفہوم سے حکم کو مقید نہ کیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا اور صرف چرنے والے اونٹوں میں زکوٰۃ کی فرضیت کا فتویٰ دیا گیا۔

حدیث مصراۃ (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے) میں ائمہ سلف نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر متاخرین نے یہ کلی اصول بنایا کہ جب کوئی غیر فقیہ راوی کسی ایسی حدیث کی روایت کرے جو قیاس سے متصادم ہوتی ہو تو واجب العمل ہوگی۔ مگر انہیں واضعین اصول نے حدیث کو جو خلاف قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی بھی واجب العمل مانا اور فتویٰ دیا کہ نماز میں با آواز بلند ہنسنے سے نماز ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے حالانکہ

وضو اور قہقہہ کا کوئی تعلق معنوی اب تک دائرہ قیاس میں نہیں آسکا اسی طرح افطار صوم کے بارے میں بھی یہ اصول پس پشت ڈال دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب کھانا پینا روزہ کو توڑ دیتے ہیں تو چاہے بھول کر کھایا جائے یا عمداً بہرحال روزہ ٹوٹ جانا چاہیئے لیکن اس کھلے ہوئے قیاس کو انہوں نے ایک ایسی حدیث کی وجہ سے ترک کر دیا جو خلافِ قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی۔

صاحبِ نظر کے لیے یہ چند اشارات کافی ہیں، ورنہ اس کے شواہد بے شمار ہیں جو بتاتے ہیں کہ ان اصولوں کی حقیقت کیا ہے، اور خود ان کے واضعین نے کس طرح ان کی خلاف ورزی کی ہے پھر جب اس خلاف ورزی پر اعتراض کیا گیا تو اس کا جواب انہوں نے جن تکلفات اور سخن پروریوں کے ساتھ دیا ہے ان کی داستان بھی ہر ناظر ان کی کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔

مسئلہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو سکتی ہے اگر تم صرف ایک ہی قاعدے کے متعلق علماء محققین کی تصریحات دیکھ لو۔ وہ فرماتے ہیں کہ شرط فقاہت والے اصول میں دو مذہب ہیں ایک تو عیسیٰ ابن ابان کا ہے جن کے نزدیک غیر فقیہ راوی کی روایت ضابط اور عادل ہونے کے باوجود خلافِ قیاس ہونے کی صورت میں ناواجب العمل ہے، اور اکثر متاخرین نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ دوسرا مذہب امام کرخی کا ہے جن کے نزدیک خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لیے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں۔ حدیث بہرحال قیاس کے مقابلہ میں واجب الاتباع ہے۔ بہت سے علماء نے اسی دوسری رائے کو مانا ہے۔ چنانچہ وہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ

"یہ قول (یعنی قول اوّل) ہمارے ائمہ سے منقول نہیں۔ ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہو گی کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے متعلق حضرت ابوہریرہ کی روایت کو واجب العمل تسلیم کیا ہے حالانکہ روایت قیاس کے خلاف تھی۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے تصریحاً فرمایا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا۔"

خود ان متاخرین کا اکثر تخریجات میں مختلف ہونا اور ایک دوسرے پر اعتراض کرنا ہمارے خیال کی ایک ناقابل تردید شہادت ہے۔

۳۔ ایک غلط فہمی اور ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقاہت کے لحاظ سے محض دو گروہ ہیں۔ ایک اہل الظاہر، دوسرے اہل الرائے۔ اور جو شخص بھی قیاس اور استنباط سے کام لے وہ اہل الرائے میں سے ہے۔ حاشا کہ حقیقت سے یہ انتہائی بے خبری ہے۔ لفظ "رائی" کا مفہوم نہ تو نفس عقل وفہم ہے، کیونکہ کوئی عالم اس صفت سے عاری نہیں نہ رائے کا مطلب وہ رائے محض ہے جس کا رشتہ سنت سے منقطع ہو کیونکہ ایسی رائے کوئی متبع اسلام اختیار نہیں کرسکتا۔ اور نہ رائے سے مقصود قیاس و استنباط کی قدرت ہے کیونکہ تب امام احمدؒ اور اسحاقؒ بلکہ امام شافعیؒ کا بھی بالاتفاق اہل الرائے میں شمار نہیں، حالانکہ وہ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں، رائی اور اہل الرائے کا مفہوم ان تمام سے جداگانہ ہے۔ اہل الرائے کہتے ہیں ان لوگوں کو جنہوں نے جمہور مسلمین کے متفق علیہا مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل میں کسی امام کے اقوال و اصول کو سامنے رکھ کر تخریج و استنباط پر اکتفا کرلیا، اور روایات و آثار کے تتبع سے تقریبًا بے نیاز ہو کر اصول اور قیاس کی مدد سے جزئیات نکالنے لگے وہ حل مسائل کے وقت نصوص آثار و سنن کی طرف مراجعت کرنے کے بجائے زیادہ تر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہا کے ٹھرائے ہوئے اصول میں سے کس اصل کے تحت آتا ہے، اسکے اشباہ و نظائر کیا ہیں کس مسئلہ کی علت اس میں پائی جاتی ہے اسکے مقابلہ میں ظاہریہ وہ لوگ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے جیسے امام داؤد اور ابن حزم۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنت کا گروہ ہے جیسے امام احمد و امام اسحاق۔

یہ بحث اگرچہ اس تفصیل و اطناب کے ساتھ عنوان کتاب سے خارج تھی، لیکن اس کے باوجود مذہبی ذوق آرائیوں کی موجودہ خلفشار اور حقیقت حال سے عام بے خبری کو دیکھکر میں نے ضروری سمجھا کہ عدل و توسط کا نقطہ جو ان ہنگاموں میں گم ہوگیا ہے، اسکو افراط و تفریط اور تعصب کی الجھنوں سے نکال کر ارباب نظر کے سامنے پیش کردوں، عدل پسند اور حق طلب کے لیے یہی کافی ہے متعصب کے لئے کچھ بھی کافی نہیں۔

وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔